سرپرست مسیح الزماں حکیم حاجی محمد نبی خاں صاحب رئیس اعظم و آنریری مجسٹریٹ

۱۹۳۴ء

یادگار

منظور احمد ... سید فرید ...

اشاعت

مطبوعہ کواپریٹو سٹیم پریس لاہور

دفتر رسالہ
یادگار اندرون بھاٹی دروازہ
لاہور

... الله داد

فہرست مضامین

جلد ۵ بابت ماہ جنوری فروری ۱۹۳۴ء نمبر ۲۵، ۲۶

[illegible] ۲ [illegible] ۱۲

"نغمۂ الست"

[illegible]

[illegible]

[illegible] خود ہو جاتا ہوں کہ بے ضیا

[illegible]

[illegible] دکھانے والے

[illegible] اچھی طرح

[illegible] بڑے مسکن

[illegible] اچھی [illegible]

[illegible] دیکھا

[illegible]

[illegible] دیکھا گل میں دیکھا ۔ پتی میں

[illegible] دیکھا ۔ [illegible] دیکھی بستر

[illegible] میں تیرا جلوہ

[illegible] قطرہ میں دریا دیکھی ذرہ ذرہ

[illegible] میں تجھکو پایا ۔ ساغر و

[illegible] میں تیری مستی ۔ دل کی

[illegible] میں تو دل کی مستی میں تو

[illegible] میں بھی تو رحمن بھی تو ہر من میں

تو ہر [illegible] ہر شے تو ہی تو ۔

فقط

ارشاداتِ عالیہ

[illegible]

دردِ اُلفت سے کہو دل سے نہ جانا ہرگز
[illegible] نہ ٹھکانا ہرگز

فتنۂ حشر کا اُٹھنا ابھی منظور نہیں
[illegible] کانا ہرگز

سُن چکے اہلِ چمن نالۂ دلکش میرے
[illegible] ہرگز

اُن کے ارشاد کی تعمیل ہو کیونکر [illegible]
[illegible] ہرگز

میں تو اپنے دلِ بیتاب کو سمجھاتا ہوں
[illegible] ہرگز

پھول گلشن کے ہیں پرکالۂ آتش بلبل
[illegible] کانا ہرگز

ایک دو داغ مٹے دل سے تو کیا ہوتا ہے
[illegible] ہرگز

دل کو اس شرط پہ کرتا ہوں حوالے تیرے
[illegible] ستانا ہرگز

دستِ شوخی نے اُٹھا دی رخِ جاناں سے نقاب
[illegible] دکھانا ہرگز

عشق کی آگ مری جان بُری ہوتی ہے
دل [illegible] لگانا ہرگز

مجھکو طولِ شبِ ہجراں سے یہ معلوم ہوا
[illegible] کا زمانا ہرگز

جسپہ وہ تیر چلاتے ہیں قضا کہتی ہے
[illegible] نشانا ہرگز

آؤ مل جاؤ کہ ملنے کے یہی دن سِن ہیں
پھر نہ آنے کا پلٹ کر یہ زمانا ہرگز

اب جگر تھامے ہوئے پھرتے ہو بیتاب [illegible]
ہم نہ کہتے تھے کہیں دل نہ لگانا ہرگز

غزل

[illegible] — [illegible] ہوں کوثر بدریا لئے ہوئے

[illegible] — دلبر کو ڈھونڈتا ہوں کلیجا لئے ہوئے

[illegible] — [illegible] صدف ہے گوہرِ یکتا لئے ہوئے

[illegible] — [illegible] ہوں عرضِ تمنا لئے ہوئے

[illegible] — جذبات اشتیاق کی دنیا لئے ہوئے

[illegible] — بیٹھے ہیں ہم تو خاکِ کفِ پا لئے ہوئے

[illegible] — [illegible] ادائے تقاضا لئے ہوئے

[illegible] — جاتا ہوں روز وعدۂ فردا لئے ہوئے

[illegible] کے واسطے — جب لوگ جا رہے تھے جنازا لئے ہوئے

کیوں بن پیے نہ مست ہوں نیرؔ بہار میں
ہر گل ہے آج ساغرِ صہبا لئے ہوئے

(نیرؔ)

غزل

[illegible]

گواہِ عصمتِ رندان [illegible] پیر [illegible]
بنے ہیں رخ دور سے [illegible] کے [illegible]
سبق آموز مستی ہے [illegible] خاموشی
دم سرکشی جو [illegible] ہے

[illegible]

لسان الملک [illegible]

[illegible]

عزیزی دعا۔ بعد [illegible]

[illegible]

دن کا کیا ذکر بس کی رات [illegible]

سحری کا [illegible] چپاتی [illegible]
خوراک خاقہ۔ گفتگو [illegible] لطائف [illegible]
نمونہ کلام [illegible] دیکھیے کیوں ریاض [illegible]
کل دو کو ڈاک کا وقت نکل گیا آج [illegible]

[illegible]









... اعظم ...وی







... سلولوی



شذرات

دسمبر اور جنوری میں انگریزی جرائد کی طرح بعض اردو رسائل کے خاص نمبر شائع ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ "بقدر ہمت" رسالوں کو بہتر سے بہتر بنانے میں بڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ . . . .

. . . . کئی ایک رسائل بھی کورستان میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور ان کی اب صرف یادیں ہی رہ گئی ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ رسالے کے اجرا کے بعد فوراً ہر ایک کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ شاید خاص نمبر ہی سے مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اعلان کرنے کے بعد ایسی مشکلیں پیش آتی ہیں کہ انتھک کوششوں کے باوجود بھی کسی طرح آسان نہیں ہوتیں اور خاص نمبر تو ایک طرف عام نمبروں کی اشاعت میں بھی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور بس قصہ ختم۔

یادگار کی پانچویں جلد کا آغاز سالنامہ سے ہو رہا ہے ہمیں اس امر سے بے انتہا مسرت ہوتی ہے کہ یادگار کا قدم ترقی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے جو ناظرین سالگرہ نمبر ۱۹۳۳ء ملاحظہ فرما چکے ہیں وہ اس گلستانِ ادب کی یادگار رہنے والے سالنامہ کو دیکھ کر اس امر کا اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دورِ جدید میں اس کی کیا شان ہے۔

ہم ہندوستان کے ان مشہور و مقتدر اہلِ قلم حضرات کے جنہوں نے اپنے بلند پایہ مضامین سے مزین فرما کر . . . .

. . . "دامان باغبان و کفِ گل فروش" . . . . . .

بنایا ہے ہم ان حضرات کی نوازشات کے ممنون ہیں مگر ساتھ ہی ان حضرات سے معذرت خواہ ہیں جن کے رشحات دامنِ تنگی اشاعت کی مجبوری سے شائع نہیں ہو سکے ان شاء اللہ آئندہ نمبروں میں تلافی آئندہ ہوتی رہے گی۔

محترم حضرت خواجہ حسن نظامی کا ایک مختصر مضمون "لغزشِ الست" شریکِ اشاعت ہے۔ خواجہ صاحب ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے امسال کسی رسالہ کے لئے مضمون لکھنے سے معذور تھے لیکن اسے یادگار کی خوش نصیبی سمجھنا چاہئے کہ جناب کاظم دہلوی کی کوششیں سرد سے کامیاب ہوئیں اور انکی وساطت سے خواجہ صاحب نے کمال مہربانی فرما کر ہمیں سرفراز فرمایا

مولانا سید حسن برنی بی اے ایل ایل بی وکیل مولانا [illegible] صاحب عزیز رئیس التحریر اخبار مدینہ جناب فضل حق صاحب قریشی۔ حضرت اختر شیرانی الافغانی۔ سید انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم اے حضرت امین سلونوی اور مرزا ادیب اس دفعہ بزمِ یادگار میں شمولیت فرما رہے ہیں جو ہمارے لئے باعثِ فخر ہے

تصاویر

جناب فقیر سید جلال الدین صاحب سابق ای اے سی کے نگارخانہ کی ایک تصویر (حضرت بیگم) سالنامہ کی زینت ہو رہی ہے۔

فقیر صاحب کے نگارخانہ میں نادر و نایاب تصویریں ہیں جن سے آپ کو اسقدر محبت ہے کہ کسی تصویر کا نظروں سے پوشیدہ رہنا گوارہ نہیں کرتے ہم صاحب موصوف کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے یادگار کے لئے تصاویر عنایت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

آپ کے نگارخانہ میں مجسمے، عکس نامے اور دوسرے بیشمار نادرات ہیں جن کی تصاویر انشاء اللہ العزیز قارئین یادگار میں ملاحظہ فرماتے رہینگے

ہیر رانجھا

یہ تصویر ایم اے عزیز خاں صاحب وائس پرنسپل آرٹ کالج کابل کے قلم کی مرہون منت ہے۔

"نگیں کی طرح سے ہرچند دلفگار ہوں میں" انگڑائی "آئنہ دیکھا تو خود آئینہ بنکر رہ گئے" "شہزادی" آرٹ کی تصاویر ہیں۔

مولانا محمود اسرائیلی صاحب کی تصویر کی اشاعت کا شرف یادگار کو حاصل ہو رہا ہے۔ آج سے پہلے مولانا کی تصویر کہیں شائع نہیں ہوئی۔

"ٹائٹل" بابو احمد الدین صاحب آرٹسٹ نے تیار کیا ہے جو سادگی اور خوشنمائی میں اپنی نظیر آپ ہے، ہمیں توقع ہے کہ بابو صاحب آئندہ بھی یادگار کو اپنی قلمکاریوں سے زینت بخشتے رہینگے۔

ہم جناب مرزا ادیب صاحب کے خاص طور پر شکر گذار ہیں کہ آپ نے سالنامہ کی تیاری میں بہت مدد دی ہے۔

(ادارہ)

(نوٹ) فروری کا پرچہ شائع نہ ہوگا۔



جواہرِ کلام

از حضرتِ مولانا احسن مارہروی پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

فنا بغیر بقا کا مزا نہیں ملتا
خودی مٹاؤ نہ جب تک خدا نہیں ملتا

بتوں سے کچھ بھی ضرر کے سوا نہیں ملتا
خدا سے کوئی جو مانگے تو کیا نہیں ملتا

حسین تو ہے زمانے میں یا تری تصویر
ہمیں تو اور کوئی تیسرا نہیں ملتا

عدو کی آمد و رفت اور بے غرض ہو غلط
کہ مدعی کوئی بے مدعا نہیں ملتا

اچانک آپ تو رستے میں مل گئے ہم کو
مزاج آج مگر آپ کا نہیں ملتا

ہوئے ہیں محو کچھ ایسے ترے تصوّر میں
کہ اپنے گھر میں ہمارا پتا نہیں ملتا

ہوئی ہے مرگ پہ یہ گمنامیِ دوام نصیب
مزار کا بھی ہمارے پتا نہیں ملتا

تلاش ہے انہیں اک بے غرض کی دنیا میں
مگر کہیں دلِ بے مدعا نہیں ملتا

ہمیں نہیں ہیں اُنہیں پہ مٹے ہوئے احسنؔ
انہیں بھی کوئی ہمارے سوا نہیں ملتا

نیرنگِ ہستی

از رشحاتِ خامہ منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری

نقشِ باطل ہے فسونِ ہستیِ فانی مجھے
خود مٹا دے گی مری تحریرِ پیشانی مجھے

موجبِ تسکیں ہے شغلِ اشک افشانی مجھے
آب و دانہ کی قفس میں ہے فراوانی مجھے

بندِ محبس سے نہیں کم کلفتِ قیدِ حیات
کیوں سمجھنے لگ گئے آزاد زندانی مجھے

یادِ آبادی بھلا دی بودِ ماندِ دشت نے
خانہ ویرانی ہوئی ہے خانہ سامانی مجھے

ہر قدم پر تار کانٹوں سے الجھنے لگ گئے
کیوں پریشاں کر رہی ہے چاک دامانی مجھے

چشمۂ آبِ رواں آنکھیں نہیں دریا بن گئیں
کر نہ دے غرقاب یہ اشکوں کی طغیانی مجھے

خوابِ ہستی میں خیالِ حسن ہی غالب رہا
رونما ہر آئینہ رہتی تھی حیرانی مجھے

پیش آئے رنج فرخ کی جو راحت کی تلاش
باعثِ مشکل ہوا ذوقِ تن آسانی مجھے

مرزا معز الدین بہادر گورگانی

از جناب پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے

مرزا معز الدین بہادر شاہ عالم ثانی کے فرزند ارجمند تھے، دوسرے شہزادوں کی طرح ان کی زندگی کے حالات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، تاریخیں ان واقعات سے بالکل خالی ہیں، اردو شعرا کے تذکروں میں کم و بیش حالات ملتے ہیں، مرزا قادر بخش صابر جو خود بھی شاعر تھے اور اس فن میں اہل استاد ہونے کا شرف رکھتے تھے اپنے تذکرہ گلستانِ سخن میں لکھتے ہیں

"فن سخن میں کامل اور تلامذہ حضرت احسان مرحوم میں سے، ان کو منصب استادی حاصل تھا اولادِ تیموریہ میں بیشتر اسی صاحبِ طبع کی شاگردی میں ممتاز ہیں"[۱]

گارسن دتاسی[۲] نے حافظ عبدالرحمٰن احسان کا ذکر ان کے استاد ہونے کی حیثیت سے کیا ہے، لیکن وہ مرزا موصوف کے خود استاد ہونے کا تذکرہ نہیں کرتے، اور یہ ان کا سہو ہے کیونکہ مرزا صابر کی رائے جو اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں زیادہ وقیع ہے، نیز دوسرے تیموری شہزادوں کے سوانح حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکثر مرزا موصوف کے حلقۂ تلمذ میں داخل تھے، صاحب خمخانۂ جاوید کا بھی یہی خیال ہے[۳]،

مرزا معز الدین ثابت تخلص کرتے تھے، ان کے فارسی شاعر ہونے کا کہیں تذکرہ نہیں آتا، لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ صاحبِ دیوان تھے، ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ خمخانۂ جاوید کے مؤلف کے کتب خانے میں موجود ہے، حال ہی میں اسی دیوان کا ایک دوسرا قلمی نسخہ ان چند مخطوطات اور مطبوعات کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موصول ہوا ہے جو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب نے کتب خانۂ مذکور کو بطور عطیہ کے دی ہیں، یہ دیوان تقریباً $\frac{26 \times 20}{8}$ کے ۱۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ آغاز اور خاتمہ دونوں نامکمل صورت میں ہیں کاتب کا نام اور سن کتابت بھی کہیں درج نہیں، پہلی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

جنوں میں ہم نے مچائی قیامتیں کیا کیا
پڑیں ہیں گوشۂ زنداں میں آفتیں کیا کیا

جنوں ہے گریہ ہے نالہ ہے غم ہے آہ ثابت
ہیں عشق کی مرے اوپر عنایتیں کیا کیا

دیوان کا آخری شعر یہ ہے

اس کا آنا تھا کہ بس ہوش کا جانا ثابت
مری تقدیر کی بن آئی نہ تدبیر مجھے

---

۱ صفحہ ۱۰۵ مطبوعہ سنہ ۱۲۷۱ھ ۲ تذکرہ گارسن دتاسی (فرانسیسی) جلد سوم صفحہ ۳ جلد دوم صفحہ ۱۶۲

مرزا ثابت کے سن ولادت اور سال وفات کا بھی پتہ نہیں اتنا معلوم ہے کہ وہ ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے اوائل عہد تک زندہ تھے، جیسا کہ اس شعر سے واضح ہے۔

ثابت ابوظفر کی ہی خاطر سے کچھ کہا
ورنہ سخن کو چھوڑے تو مدت ہوئی ہمیں

غالباً اسی عہد میں ان کی وفات بھی واقع ہوئی جیسا کہ صاحب خمخانۂ جاوید نے لکھا بھی ہے،

انہوں نے اپنے استاد حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا دیوان جو اُردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اور استاد بھی، مرتب کیا تھا، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا اپنا دیوان اُنکا اپنا ترتیب دیا ہوا ہے یا کسی اور کا،

اُن کے کلام کا رنگ وہی اُردو شاعری کا پُرانا دکلاسیکل) رنگ ہے، جس میں خیالات یا نفس شاعری کی بہ نسبت اشعار کی ظاہری صورت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، اُنکی روح شاعری میں قدیم شاعری کی طرح کوئی خاص بات بھی نہیں، البتہ زبان دوسرے تیموری شہزادوں کے مقابلے میں جو اُن کے ہمعصر تھے زیادہ صاف، پاکیزہ اور انداز بیان سلیس ہے،

اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

ناتوانی سے یہ حالت ہو کہ جاتا ہوں کہیں - اور اُڑائے لئے جاتی ہے ہوا اور طرف

انصاف ہو کہ محتسب اس ابرو ہوا - کس طرح سے ہو ساقی گلفام فراموش

آہ اگر پردہ نشیں وہ بُت خودکام نہو - دیر میں کفر نہو کعبہ میں اسلام نہو

تھا قلق اور بیقراری رات - مجکو روتے کٹی ہے ساری رات[1]

جگر میں درد ہے آنکھوں سے اشک آتے ہیں
تڑپ کے پھُوٹ گیا شاید آبلہ دل کا

اسقدر او بے مروت مجھ سے استغنا تجھے - جان دینی بھی مجھے پر دل نہ دینا تھا تجھے[2]

میں کسی چشم سفّاک کا ہوں کُشتہ ثابت - کیونکہ مجکو مرا ابلق ایام نہو[3]

دست جنوں کو یوں ہے گریباں سے اختلاط - دامن کو جیسے خار بیاباں سے اختلاط

یوں کہا اس نے کہ ثابت مجھے پیغام نہ بھیج
مجکو بدنام نہ کر، نامہ مرے نام نہ بھیج

یہ شعر سادگی تخیل کی وجہ سے عربی شاعری کی یاد دلاتا ہے

میں نے کل اُن سے کہا دل میں مرے درد ہے آج
ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کہا کیا باعث[4]

وہ ہم ہیں جو عزّ و رسی نفرت ہوئی ہیں - ہر گز ہما ہمی کی نہ ہمت ہوئی ہمیں
کل محتسب کی ریش مبارک تھی ہاتھ میں - اک جرعہ مے پئے سے یہ جرأت ہوئی ہمیں
دو چار گز کفن جو ہمیں یار مل گیا - بس تا بروز حشر فراغت ہوئی ہمیں

خاکِ پا یار بھی نافع ہے یہ تدبیر مجھے
خاک بھی فائدہ کرتی نہیں اکسیر مجھے[5]

تبسّم

[1] گلستانِ سخن صفحہ ۱۸۵-۱۸۶ [2] تذکرہ طبقات الشعرا صفحہ ۲۸۹-۲۹۰ [3] گلستانِ بے خزاں صفحہ ۸۵
[4] خمخانۂ جاوید جلد ۲ صفحہ ۱۶۲-۱۶۳ [5] قلمی دیوان (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

یگانہ آرٹ

جناب میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار لاتور دکن

وہ تن ہی کیا ہے جس میں نہ ہو غذائے روح نہ ہو قوتِ وفا
دل وصفِ نہ صفا ہے دل میں پہلوئے وفا

اڑا ہوا ہوں بس کی دل آگہی کیا ہے جو ہوئی نکل
مشتعل کی غذائے روح کیا ہے بجز بے وفا

✠

---

(۲)

اندھوں کو مبارک رہے یہ دیوانہ روی
سیکھا چاہیں یگانے کی وہ یگانہ روی

دریا ہوں میں صحرا کا بگولا تو نہیں
دیوانہ روی کی بھلی کرے مستانہ روی

✠

ادبی لطیفے!

جناب میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار دکن

(۱)

جرجان کا اک باشندہ استرآباد آیا اور وہاں کے صدر الصدور سے استدعا کی کہ مجھے یہاں کا قاضی بنا دیجئے تو بڑا احسان ہو۔ اور بطور رشوت اک گدھا بھی صدر صاحب کی نذر کیا۔ پھر کیا دیر تھی استرآباد کی قضائت کا عہدہ ہتھیا لیا میر عبدالحق استرآبادی کا دل گدگدایا۔ اس واقعہ کی یادگار میں ایک دلچسپ قطعہ لکھ مارا ؎ قطعہ

همی گشت در شہر شخصے ز جرجاں
کہ قاضی شود۔ صدر راضی نمی شد
بہ رشوت خرے داد نا گشت قاضی
اگر خر نمی بود قاضی نمی شد!

(۲)

مُلا مُراد قزوینی ایک درویش تھے بڑے کلجبھے۔ جسے بد دعا دیدیتے کبھی خالی نہ جاتی اُن کے معاصر تھے ایک مولوی صاحب بڑے نخوت مآب۔ کسی کے سلام کا جواب دیتے بھی تھے تو زبانی سے۔ مُلا مراد بھلا یہ بد دماغی کیونکر برداشت کر سکتے تھے اک رباعی کہہ کر مولوی صاحب کے پاس بھجوا دی ؎

اے مولوی از کبر دماغت گندہ — گاہے کہ کند بر تو سلام اہل بندہ
چنداں حرکت بکن کہ از روئے قیاس — معلوم شود کہ مردۂ یا زندہ؟

غنیمت ہوکہ اسی رباعی پر بلا ٹل گئی ورنہ کلجبھے پن کا شکار ہو گئے ہوتے!

(۳)

مخفی رشتی اک شاعر گزرا ہے افیون بہت کھاتا تھا جس کی وجہ سے پوست استخواں رہ گیا تھا۔ ایک شخص نے کہا تجھی افیوں نے تو تم کو کھالیا تم میں کچھ باقی نہیں رہا۔ مخفی نے جواب دیا کہ مجھمیں افیوں کا کوئی فتور نہیں ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ لوگ جب کوئی مکتوب لکھتے ہیں تو عام دستور کے مطابق "مخفی نماند" سے خط کی ابتدا کرتے ہیں۔ جب روزانہ میرے حق میں یہی بد دعا نکلتی ہے کہ مخفی نہ رہے دنیا سے اُڑ جائے تو اس میں افیوں کی کیا خطا ہے۔ جو کچھ مجھ میں رہ گیا ہے وہی غنیمت ہے۔

(۴)

طہماسپ قلی بیگ عرشی کا ایک لڑکا تھا نہایت کریہہ منظر اک مرد ظریف نے اُس لڑکے کو دیکھ کر کہا شاید مولانا عرشی نے یہ شعر مخدوم زادہ ہی کے حق میں ارشاد فرمایا ہے ؎

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

یعنی یہ بیج تو میں نے ایسا بویا کہ شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اب از سر نو کوئی دوسرا بیج بونا چاہیئے۔

مولانا نے تو اک شعر کہا تھا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ اُن کے شعر میں یہ معنی پہنائے جائیں گے۔ (فقط)

حملۂ بابر سے پہلے سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان کی حالت

از جناب سید حسن برنی بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ

سترہ برس ہوئے، جب میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی ... ایک مبسوط مقالہ حملۂ بابر سے پہلے سلاطین دہلی کے نظام حکومت پر لکھا تھا۔ جس میں ایک تمہید اور بارہ جدا جدا ابواب میں ان کی تاریخ و سیاسی نظام ملکی، تقسیم، عدالت و انصاف، ... مالیات، فوج، پولیس، ... رسالے و خفیہ، ڈاک، سکہ، تعلیم، امور رفاہ عامہ اور سرکاری کارخانجات سے بحث کرنے کے بعد حصہ دوم میں اس دور میں ملک کی کیفیت اور ہندوؤں کی حالت سے مفصل طور پر بحث کی ہے۔ بعض وجوہ سے ابھی تک اصل انگریزی مضمون کتابی شکل میں شائع ہونے سے رکا ہوا ہے لیکن اس کے چند ابواب کا ترجمہ اس سے پہلے بعض سربرآوردہ رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ رفتہ رفتہ اس مضمون کے دوسرے ابواب بھی اسی طرح شائع کرادوں۔ موجودہ مضمون حصہ دوم کا ترجمہ ... جس میں اس دور میں ہندوستان کی عام حالت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ بنظر اختصار حوالجات حذف کر دیئے گئے ہیں اور جن مطالب کو اس سے قبل بیان ہو چکے ہیں ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھا ہے۔ (سید حسن برنی)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس زمانے کی حکومت نے کس حد تک اپنا وجود حق بجانب ثابت کیا۔ تو اس کا کوئی ایسا جواب دینا جو اس سو برس کی طویل تاریخ کے تمام وقتوں کے لئے یکساں طور پر صحیح ثابت ہو ناممکن ہے۔ اس مدت میں دہلی کی حکومت پانچ خاندانوں میں رہی۔ ان کے اقتدار کی میعادیں مختلف ہیں اور تیس سے زیادہ بادشاہ تخت نشین رہے جن میں سے نہ ہر ایک کے عہد حکومت کی میعاد ہی برابر ہے۔ نہ سب کی یکساں لیاقت تھی

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کے دوسرے ملکوں کی حالت سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ہندوستان کی اس دور کی حکومت اور ملکوں کی حکومتوں سے کسی طرح بدتر ثابت نہیں ہوئی۔ کیا ہم اس عہد کی ہندوستانی حکومت کا یورپ کے اسی دور کی حکومتوں سے مقابلہ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا خیال ہے تو بلاشبہ ہندوستانی حکومت ان یورپ کی حکومتوں سے فائق تھی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں وہ نظام

حکومت جو ہندوستان میں مروج تھا۔ اس نظام حکومت
کے بالکل ضد تھا جو فیوڈل سسٹم Feudal System
کہلاتا ہے اور اس زمانے میں تمام ممالک یورپ میں مروج
تھا۔ اس دور کے آخیر سنوں میں جبکہ ہندوستان کی تاریخ
کا زیر تبصرہ عہد ختم ہو کر مغلوں کی سلطنت کے لئے جگہ خالی
کر رہا تھا۔ یورپ ہنوز قرون وسطیٰ کی تاریکی میں مبتلا تھا۔
وہ مذہبی و سیاسی انقلابات جنہوں نے یورپ کے عہد جدید
کی بنیاد ڈالی۔ ابھی تک پورے طور پر رونما نہیں ہوئے ...
تھے۔ بلکہ ان تجارتی اور علمی ترقیوں کا جنہوں نے بالآخر
یورپ کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔ ہنوز عہد طفولیت ہی تھا۔
امرا اور بدنام پوپوں نے سختیوں اور مطلق العنانیوں سے
خلق اللہ کی حالت غلاموں سے بدترین کر رہ گئی تھی۔

ہندوستان سے باہر مسلمانوں کے دوسرے
ملکوں میں بھی لوگوں کی حالت یہاں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی
عربوں کی سطوت اور تمدن کے شاندار ایام گذر چکے تھے۔
اور اسی دوران میں مشرق اور مغرب میں ایسے طوفان اٹھ
چکے تھے جنہوں نے درماندہ اسلامی حکومتوں کو زیروزبر
کر ڈالا تھا مشرق میں مغلوں کے سیلاب نے اور مغرب میں
مسیحی آقاؤں کے غلبے نے گذشتہ خوشحالی کو بہت بڑا صدمہ
پہنچایا تھا۔ حکومتوں کی باہمی آویزشوں، ان کے انحطاط
و زوال اور نئی حکومتوں کا قائم اور برباد ہونا کچھ ایسے مناظر
تھے جو چاروں طرف دکھائی دیتے تھے۔

الغرض اگر ہمارا مقصد اس قسم کے مقابلے سے
پورا ہو سکے تو اس عہد کے لئے اس سے بہتر حکومت کی
جستجو بیکار ہے

اُس دور کی فراوانی

تمام تاریخی شہادتیں متفق ہیں کہ اس دور میں
روزمرہ ضروریات کی چیزیں ہمارے ملک میں اتنی سستی تھیں
کہ جس کی مثالیں بعد کے زمانوں میں نہیں ملتیں۔

اکثر و بیشتر کاشتکاروں سے حکومت کے
مطالبے ہلکے اور ان کے ساتھ برتاؤ اچھا تھا۔ عوام الناس کو
کھانے پہننے کی زیادہ تکلیف نہ تھی۔ سختی کے وقتوں
میں حکومت کاشتکاروں کی دستگیری بھی کرتی اور کام
چلانے کے قابل قرضے دیتی رہتی تھی۔ خرید و فروخت
اور کاروبار میں حکومت بہت کم دست اندازی کرتی تھی
اور طلب بہم رسانی کے قدرتی قوانین کے رو سے ہی بازاروں
کے نرخ طے ہوتے رہتے تھے۔

اس بارہ میں البتہ ایک اہم استثنا ضرور ہے
یعنی سلطان علاؤالدین خلجی کا عہد۔ جبکہ حکومت نے بازاروں
پر جبریہ نرخنامے عائد کر دیئے تھے۔ لیکن سب مورخ مانتے
ہیں کہ ان انتظامات نے، گو وہ نہایت سخت تھے عوام الناس
کی حالت کو پہلے سے بہت بہتر بنا دیا تھا۔ یہ خاص طرح کے
انتظامات تھے جنہیں لین پول Lane poole
نے معاشیات میں "نہایت جرات آمیز تجارت" سے تعبیر
کیا ہے اس قدر کامیابی سے چلائے گئے۔ کہ ان پر کچھ تھوڑا
سا تبصرہ کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

ان انتظامات کا اصلی باعث وہ فوجی اسکیم تھی
جس کے ذریعہ سے علاؤالدین مغلوں کی مدافعت کیلئے
ایک بڑی اور اچھی فوج کم سے کم خرچ پر رکھنا چاہتا تھا
لیکن قیمتوں کا جو پیمانہ مقرر کیا گیا تھا وہ دراصل دیہات
کے کھلے بازاروں کے نرخوں سے لیا گیا اور اس کا مقصد

یہ تھا کہ خشک سالی میں دارالسلطنت میں اجناس کی قیمتوں میں ناہمواری نہ پیدا ہو۔

ارزانی کے لئے جو خاص خاص ضابطے بنائے گئے حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک شحنۂ بازار رہتا تھا۔ جس کی ماتحتی میں چند ہوشیار معتبر اور لائق مددگار ہوتے تھے۔

(۲) دوآب کے خالصہ کے دیہات سے سرکاری محصول جنس میں لیا جاتا تھا۔

(۳) سرکاری ملازم دیہات سے مقررہ نرخوں پر غلہ خرید کر لاتے اور شاہی کھتوں میں جمع کرتے رہتے تھے اور گرانی کے زمانہ میں ان کھتوں سے مقررہ قیمتوں پر غلہ دیا جاتا تھا۔

(۴) غلہ چھپا کر رکھنے اور اونچے داموں پر فروخت کرنے پر سخت سزا ملتی تھی۔

(۵) نرخوں کی جانچ کے لئے بادشاہ نے مختلف ذرائع مقرر کر رکھے تھے۔ شحنۂ بازار الگ کیفیت پیش کرتا تھا اور ڈاک والے (برید) اور خفیہ مخبر (منہی) اپنی خبریں علیحدہ بھیجتے تھے۔

(۶) تمام صوبوں کے عہدہ داروں کو اور ان کے ماتحتوں کو حکم تھا کہ وہ شاہی گماشتوں کو مقررہ نرخوں پر اجناس دلوائیں۔

(۷) خشک سالی کی حالت میں شاہی کھتوں سے ہر روز مقررہ مقدار میں غلہ ہر محلہ کی ضروریات کے مطابق دلوایا جاتا تھا۔ ہر خریدار صرف نصف من غلہ خرید سکتا تھا

ان جبریہ قیمتوں کا نرخنامہ جو علاؤالدین کے زمانے میں بارہ برس (۷۰۳ھ۔ ۷۱۵ھ) تک نافذ رہا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

گیہوں فی من	۷½ جیتل
جو "	۴ "
چاول "	۵ "
ماش "	۵ "
چنا "	۵ "
موٹھ "	۴ "
شکر فی سیر	۱½ "
گھی ۲½ سیر	۱ "
گڑ فی سیر	⅓ "
روغن کنجد ۳ سیر	۱ "
نمک ۲½ من	۵ "

مسالک الابصار کے باخبر مصنف نے محمد تغلق کے عہد کے متعلق جو نرخنامہ دیا ہے وہ بیس برس بعد کا اور اصلی بازاری قیمتیں ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں نرخناموں کا مقابلہ مفید ہوگا۔

محمد تغلق کے عہد کا نرخنامہ

گیہوں فی من	۱½ سنگانی	۱۲ جیتل
جو "	۱ "	۸ "
معمولی چاول "	۱¾ "	۱۴ "
مٹر "	½ "	۴ "
شکر ۵ سیر	۱ "	۸ "
نبات خالص "	۱ "	۸ "
بیل	۲ ٹنکہ	
موٹی بھیڑ	۱ "	

محمد تغلق کے بعد فیروز تغلق کے عہد میں حسب ذیل نرخ

رائج تھے۔

گیہوں	فی من	۸ جیتل
جو	"	۴ "
چنا	"	۴ "
دلیدہ (دانہ)	۱۰ سیر	۱ "
گھی فی سیر		۲½ "
شکر "		۳ یا ۳½ "

شمس سراج عفیف نے حملہ ۱۳۹۸ء کے وقت فیروز تغلق کے زمانہ میں حسب ذیل نرخنامہ دیا ہے۔

مونگ	فی من	۵ ٹنکہ
روئی	"	۴ "
غلہ ۵ سیر		۸ یا ۱۰ جیتل

(یعنی فی من ۶۴ سے ۸۰ جیتل تک، یہ انتہائی نرخ تھے اہل ملک نے ربیع کی ساری فصلیں برباد کر دی تھیں

اس کے سو برس بعد آخیر افغان پادشاہ ابراہیم لودی کے زمانہ میں یہ نرخنامہ تھا۔

غلہ ۱۰ من ایک بہلولی ۱/۶۴ ٹنکہ یا ۱⅜ جیتل یعنی ۱/۱۶ آنہ
گھی ۵ سیر ایک بہلولی ۱/۱۶ آنہ
معمولی کپڑا ۱۰ گز " "

اس غیر معمولی خوشحالی کا باعث مورخوں نے زراعت کی فراوانی بتائی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی ایک شخص اپنے بال بچوں کے ساتھ آسانی سے ۵ ٹنکہ مہینے میں گذر کر سکتا تھا۔ سوار کی تنخواہ بیس سے تیس ٹنکہ تک تھی۔ دہلی سے آگرہ تک سفر کرنے میں ایک بہلولی (۱/۱۶ آنہ) خرچ آتا تھا۔

تمام اجناس میں گیہوں ممتاز حیثیت رکھتا ہے ہم اس دور میں اس کے نرخ پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے۔

ضیائے برنی مورخ فیروز شاہی نے جلال الدین خلجی کے عہد میں ایک قحط کا ذکر کیا ہے جب گیہوں کی قیمت فی جیتل ایک سیر یعنی فی ٹنکہ ایک من ۴۲ سیر ہو گئی تھی۔ لیکن انتہائی مثال محمد تغلق کے عہد میں پیش آئی جبکہ قیمتیں اس سے بھی سترہ گنی ہو گئی تھیں۔ علاؤالدین کے عہد میں گیہوں ۷½ جیتل فی من اور فیروز شاہ کے عہد میں ۸ جیتل اور محمد تغلق کے عہد میں ۱۲ جیتل فی من فروخت ہوتا تھا۔ لیکن ان قیمتوں میں یکساں من نہیں ہے۔ فرشتہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جلال الدین فیروز خلجی کے وقت میں من چالیس سیر کا تھا اور سیر ۲۴ تولہ کا یعنی اس عہد کا من ۹۶۰ تولہ (آج کل کے حساب سے بارہ سیر ہوا۔ دو صدی بعد یعنی حملہ بابر کے وقت ہندوستانی من صرف ۵۶۰ تولہ (یعنی ہمارے زمانے کے سات سیر) کے برابر تھا۔

اس حساب سے علاؤالدین اور فیروز شاہ کے عہد میں ۱۲ سیر گیہوں، ۷½ یا ۸ جیتل میں اور ابراہیم لودی کے عہد میں ۷ سیر گیہوں ایک بہلولی یا ۱⅝ جیتل میں فروخت ہوتے تھے۔ چودھوی صدی عیسوی کے آخیر حصہ (یعنی حملہ تیمور) تک ایک من گیہوں کے دام صرف ۲۵ جیتل تھے اس میں کچھ تعجب نہیں ہے کہ اس زمانے میں قیمتیں اتنی کم تھیں۔ ہندوستان کی مردم شماری ۱۹۱۱ء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۱۱ء تک ملک کی آبادی بشرح ۱۰۰۸ فیصدی بڑھی یعنی تیس برس میں دوگنی ہو گئی۔

یہ ماننا پڑیگا کہ یہ شرح اضافہ مسلسل امن و امان کی وجہ سے غیر معمولی ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں ملک کی آبادی نسبتاً بہت کم ہو گی اور زراعت کے لئے وسیع رقبے موجود تھے اور نسبتاً کم سرمایہ اور محنت سے بہتر

نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔

ان نرخوں کو دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک میں قیمتی دھاتوں (سونا چاندی) کی کمی تھی تمام تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ ہندوستان میں ان کے بڑے بڑے ذخائر موجود تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ دولت کی تقسیم اسوقت بھی بہت غیر مساویانہ تھی اور وہ چند ہاتھوں میں جمع ہو کر رہ جاتی تھی۔ لیکن عوام الناس کا معیار زندگی بھی بہت پست تھا۔ انہیں کھانے پہننے کو مل جاتا تھا اور وہ قسمت پر شاکر تھے۔ ہمارے زمانے کے سخت مقابلوں بیکاریوں اور معاشی کشمکشوں سے وہ بڑی حد تک ناآشنا تھے اور عام طور پر انقلابات تاج و تخت بھی انکی معاشی حالت اور روزمرہ کی زندگی پر بہت کم اثر ڈالتے تھے۔

{[نوٹ، ہم نے اس عہد کے سکوں کا حال ایک علیحدہ باب میں درج کیا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ اس سے قبل شائع ہو چکا ہے۔

نرخناموں کو سمجھنے کے لیئے یہاں پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ایک جیتل ۴ تانبہ کے فلوس کی برابر اور ۶۴ جیتل یا ۲۵۶ فلوس ایک چاندی کے ٹنکہ کے برابر ہوتے تھے۔ چاندی کا ٹنکہ اس زمانے کا روپیہ اور جیتل کو پیسہ اور فلس کو دمڑی سمجھنا چاہیئے ۔]}

نغمۂ مستانہ

مسرور بہ افکارش — دیوانہ و فرزانہ — معمور ز انوارش — آبادی و ویرانہ
از دیدۂ کم بینم — چوں ساغر جم بینم — در دیر و حرم بینم — یک جلوۂ جانانہ
گفتم کہ فدا کارم — اے شمع پُر انوارم — گفتا کہ طلبگارم — جانبازیٔ پروانہ
خوش بزم سیہ مستاں — دور است غم و حرماں — صد امن و سکوں پنہاں — در شورشِ میخانہ
کیفیتِ ایں عالم — برعکس ہمہ دیدم — بیگانہ شدہ خویشم — خویشم شدہ بیگانہ
ماہ است بشب گاہے — چوں شاہِ فلک جاہے — گہ گاہے سر راہے — از گردش روزانہ
دنیاست عجب منزل — فرخ! امنِ بیدل
موجود ہمہ محفل — شد ہستیم افسانہ

(فرخ امرتسری)

نوائے محوی

بطرزِ قدیم و زبانِ سادہ

از رشحاتِ خامہ جناب مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی

مولانا محوی صدیقی صاحب زبانِ اُردو کے مسلمہ اُستاد ہیں۔ آپ کو سادہ اُردو سے بہت محبت ہے اور آپ نے اس قسم کی بحروں میں وقتاً فوقتاً لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے جو اگرچہ قدیم شعرأ کے لئے مخصوص ہو گئی ہیں لیکن انکو رواج دینے کی ضرورت ہے تاکہ اُردو شاعری کے اوزان کا دائرہ محدود نہ ہو۔ ہم مولانا ممدوح کے سپاس گذار ہیں کہ انہوں نے اہلِ علم اور ادب نواز حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ (ادارہ)

یونہیں تو جو اے دشمنِ مہر و الفت دلِ غمزدہ کو ستاتا رہے گا
تو کا ہے کو اِس بزمِ دُنیا میں کوئی کسی سے دل اپنا لگاتا رہے گا

وہ جلوہ کیا جس نے بیہوش مجھ کو، وہ نظریں جو برسا گئیں تیر مجھ پر
سلامت رہا دل ہمارا تو یہ حوصلے اور اِن کے بڑھاتا رہے گا

الٰہی کوئی حد بھی ہے بے رُخی کی، خدایا ٹھکانا بھی ہے اس ستم کا
کوئی اِس طرح اپنے جی کو کہاں تک مٹاتا، جلاتا، گھلاتا رہے گا

یونہیں یہ مری داستانِ محبت زبانوں پہ تا حشر جاری رہے گی
کہ ہنس ہنس کے کوئی جو سُنتا رہے گا تو رو رو کے کوئی سناتا رہے گا

فسردہ ہوئے دل کے سب داغِ حسرت، تمنائیں دل کی ہوئیں ختم ساری
بھلا کس طرح کوئی پھولے پھلے گا، جو وہ بجلیاں یوں گراتا رہے گا

یہ گھڑیاں ہیں بیمارِ اُلفت پہ بھاری دمِ نزع ہے چارہ گر جا رہے ہیں
کوئی بیٹھ کر اُس کی بالینِ غم پر کہاں تک بھلا مسکراتا رہے گا

قدم جب محبت کی منزل میں رکھا تو پھر پیچھے ہٹتے ہیں محوی کہیں ہم
بڑھے جائینگے اور اتنے ہی آب تو نہیں کوئی جتنا ستاتا رہے گا

نئی ہمسائی

از جناب پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے

نئی ہمسائی جب سے بغل والے مکان میں تشریف لائیں میں نے اپنے اور ان کے مکان کی درمیانی کھڑکی بند کرا دی۔ میں یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ میری بیوی ان کی طرح کی عورتوں سے میل جول بڑھائیں۔ میں خود ان کے "میاں" سے ملنے میں زیادہ قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ مردوں کی "علیک سلیک" سینکڑوں قسم کے آدمیوں سے ہوتی ہے اسکو کپڑوں میں لپیٹ کر نہیں رکھا جا سکتا۔ چاقو کی طرح رگڑ سے اس کی تیزی بڑھتی ہے۔ وہ اونی کپڑا ہے جسے دھوپ نہ دکھائے تو کیڑے چاٹ جائیں۔ مگر عورت پھول ہے۔ نازک، لطیف، خوشبودار! جہاں ہمسایہ خراب ملا۔ بو باس میں فرق آیا۔ جہاں ہمنشین برے ہوئے اور رنگ روپ بدل گیا!

پھر میں اشرف صاحب سے ایک زمانے سے .... واقف تھا۔ وہ ایک رنگیلے مزاج کے آدمی تھے وہ ہر سال تقویم پارینہ "علیحدہ کر دیتے اور نئی جنتری سے دل بہلاتے۔ اب کے نظر انتخاب بی ہمسائی پر پڑی اور وہ بغل والے مکان میں لاکر اتار دی گئیں۔ اشرف صاحب کے خود گھر موجود تھا۔ بزرگوں میں کوئی مرد اور عزیزوں میں کوئی عورت نہ تھی۔ مگر اپنا مکان چھوڑ کے یہ عنایت میرے ہی ہمسائے پر کیوں کی گئی اس کی حقیقت سے نہ میں واقف تھا اور نہ میری بیوی۔ وہ اشرف صاحب سے مجھ سے بھی زیادہ خفا تھیں۔ وہ کہتیں اگر انہوں نے یہ مکان نہ لیا ہوتا۔ تو کوئی بھلا مانس اس میں آ کے اترتا اور مجھ نگوڑی کا ہمسائی سے دل بہلتا۔ مگر ان نئی بی صاحبہ کو تو رات دن سوائے گانے بجانے کے کوئی کام ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ڈھاریوں اور کسبیوں کا گھر ہے!

ان کا غصہ بجا تھا۔ اس لئے کہ گھر میں جتنے سمجھدار تھے وہ سب نماز کے عادی تھے۔ ہم میاں بیوی کی دیکھا دیکھی سہی مگر مامائیں بھی نماز پڑھتی تھیں اور ملازم بھی۔ بچوں میں صرف ایک منیر تھا۔ جو پیار سے "بھیا" پکارا جاتا۔ اسکی عمر اسوقت مشکل سے چار برس کی ہوگی۔ بیگم سوائے بھیا کے کھلانے اور ماماؤں کو حدیث قرآن پڑھ کے سنانے کے اور کوئی کام نہ کرتیں۔ ان کے ہاں مذہبیت کا دفور تھا اب ہمسایہ ملا اس طرح کا بالکل ہی ان کا ضد! ایک طرف تو تہلیل و تسبیح کا ورد اور دوسری جانب سارے گانا باوانی کی رٹ!

پھر مفتیوں کے خاندان سے ہونیکی وجہ سے ہم

قدامت پسند بھی تھے۔ ہماری معاشرت وہی تھی جس پر ہمارے بزرگ کاربند رہ چکے تھے۔ ہم لوگوں سے عام طور پر ملنا جلنا پسند نہ کرتے تھے اور ہماری عورتیں ان گھروں میں نہیں آتی جاتی تھیں۔ جن پر جدید تعلیم کا رنگ چڑھ چکا تھا اور جہاں ترقی دنیاوی کی غرض سے مغرب پرستی کی شدت تھی۔

ابتک جو بی بی پڑوس میں رہتی تھیں ان کے میاں کسی دوکان پر کام کرتے تھے وہ سیدھے سادے نیک مسلمان تھے۔ دنیا کے جھگڑوں سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا مقررہ وقت پر اپنے کام جاتے۔ مقررہ وقت پر واپس آتے۔ اپنے بال بچوں کے ساتھ جو دال دلیا میسر آتا خوش خوش کھاتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔ خود بی ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ گھر کے کام کاج سے جہاں فرصت پاتیں ٹوپیاں لیکر بیٹھ جاتیں ایسے ایسے گل بوٹے کاڑھتیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے دس بارہ آنے کی روزانہ میاں کے علاوہ وہ مزدوری کرلیتی تھیں۔ اس پر ملنسار ایسی کہ دن میں دو پھیرا محض بھیا کی خیریت دریافت کرنے کیلئے ہمارے ہاں آیا کرتیں جب ہمارے ہاں کوئی کام ہوتا تو اس میں بیگم کا اس طرح ہاتھ بٹاتیں کہ محسوس ہوتا کہ کوئی غیر نہیں بلکہ اپنی قریب ترین عزیز ہیں۔ بیگم انہیں بہن پکارتی تھیں اور ننھا منیر اپنی تتلی زبان میں انہیں کھالا جان کہنا اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔

وہ جب سے چلی گئی تھیں ہم لوگوں کو خاصی تکلیف تھی۔ بچہ بھی کڑھتا تھا اور بیگم بھی اداس رہتی تھیں۔ تسکین صرف اتنی تھی کہ ممکن ہے نئی ہمسائی ویسی ہی یا ان سے بہتر مل جائیں۔ اور اب آئیں یہ ذات شریف۔ معاملہ بالکل ہی برعکس ہوگیا۔ وہ تو کہئے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ میں نے اشرف صاحب کو اسوقت دیکھ لیا جبکہ وہ مکان کا معائنہ کرنے آئے تھے ان کی چھپی چھپی باتوں سے تاڑ گیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ میں نے اس لئے نئی ہمسائی کے ورود کے پہلے ہی کھڑکی میں قفل ڈلوا دیا تھا۔ اگر کہیں بے تکلفی بڑھنے کے بعد بیگم کو معلوم ہوتا کہ نئی ہمسائی کس قماش کی عورت ہیں تو حد درجہ بے لطفی ہوتی!

جب نئی ہمسائی آئیں تو انہوں نے ایکدن کھڑکی پر آکر نوب کھٹکھٹایا۔ ماما سے کہلا دیا گیا کہ میاں کا حکم نہیں کہ کھڑکی کھولی جائے" انہوں نے کہا "اچھا بیگم سے سلام کہو اور کہو کہ ذری کھڑکی تک کھڑی کھڑی ہو جائیں۔ ہم تو ان سے ملنے آئے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں"

بیگم نے صاف صاف کہلا بھیجا "کہ مجھے نہ ان سے ملنے کی فرصت ہے اور نہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں"

اس تلخ جواب پر وہ بہت آزردہ ہوئیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں کہ "اچھا تو ان سے کہہ دینا بی بی اگر آپ نہیں ملنا چاہتیں تو یہاں کس کی جوتی کو غرض ہے۔ نہ ہم ان کے بسائے ہوئے ہیں اور نہ ہم ان کا دیا کھاتے ہیں۔ ہونہہ کیا مزاج پایا ہے . . . . . . اے ہم نے کہا پڑوس میں آ کے ٹکے ہیں چلو اپنی ہمسائی سے مل لیں۔ مگر معلوم ہوا وہ تو بڑی تنک چڑھی ہیں۔ اے ہو نگی خاص رسول اللہ کے گھرانے کی۔ ہماری پاپوش کو غرض!"

اسی درمیان میں مجھ سے اور اشرف صاحب سے ایک دن سامنا ہوگیا۔ صاحب سلامت کے بعد انہوں نے جسقدر تپاک برتا میں اتنی ہی رکھائی سے پیش آیا۔ بالآخر وہ گھبرا کے بولے۔ کیوں شیخو صاحب مجھ سے کیا قصور ہوا ہے جو آپ خاص طور سے خفا معلوم ہوتے ہیں "



میں فطرتاً سیدھا سادا آدمی ہوں اور گفتگو میں صفائی زیادہ پسند کرتا ہوں مجھے طعن و تشنیع و طنز سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن اشرف صاحب کی حرکتوں سے استقدر جلا ہوا تھا کہ اس دن میں نے ان سے کچھ اسطرح کی باتیں کیں۔ ان کے جواب میں میں نے کہا۔ آپ اور قصور واللہ آپ کیا فرماتے ہیں ابھی حضرت آپ نے تو مجھ پر وہ احسان کیا ہے۔ کہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ کے صدقے میں مجھے سرود ہمسایہ اور حسن رہگذر ہے دونوں میسر ہیں بھلا میں اور آپ سے خفا ہو سکتا ہوں۔ میری اور مجال"

وہ مسکرا کر بولے "اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر آپکو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اسے آپ کے ہمسائے میں محض اس لئے لایا ہوں کہ میں اسے ایک بیسوا کی جگہ ایک نیک اور پارسا عورت بنانا چاہتا ہوں"

میں نے کہا "مجھے آپ کی ذات سے یہی امید تھی مگر میری یہ نہ سمجھ میں آیا کہ میرے ہمسائے میں ایسی کونسی خصوصیت ہے؟"

وہ بولے۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس حسن، اس گلے اور اس مزاج کی رنڈی آجتک نہ دیکھی میں نے اسلئے اس سے یہ خواہش کی وہ مجھ سے نکاح کر لے مگر وہ آزادی کی زندگی کی اس طرح عادی ہو گئی ہے اور گھریلو زندگی سے استقدر گھبراتی ہے کہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔ میں اس لئے اسے آپ کے ہمسائے میں لایا ہوں کہ وہ آپ کے گھر کی زندگی اور آپ میاں بیوی کی محبت و آشتی کو دیکھ کر میری بات مان لے"

میں نے کہا "تو اتنا بڑا شہر ہے آپکو سینکڑوں اس طرح کے میاں بیوی ملجاتے۔ یہ مجھ ہی پر کرم کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولے "آپ لوگ مولویوں کے گھرانے سے ہیں تا آپ کا اثر دوسروں سے زیادہ جلد اور گہرا پڑیگا"

میں نے اپنی فطری صاف گوئی سے کام لیکے ان سے کہہ دیا تو حضرت اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی حالت میں اپنی بیوی کو آپ کی ...... رنڈی سے ملنے دونگا تو آپ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اگر آپ میرے ہمسایہ سے نہ اٹھ جائینگے تو میں خود اس مکان کو چھوڑ دونگا" میں نے اس کے بعد انکی کوئی بات نہ سنی اور جھلایا ہوا گھر چلا آیا۔

اس دن سے میں نے محسوس کیا کہ شور و ہنگامے میں بہت کمی ہو گئی۔ گانا ہوتا ضرور تھا۔ مگر مقررہ اوقات پر اور ٹھٹھے اب بھی لگتے تھے مگر اس طرح کی آوازوں میں جو ہمارے کاموں میں مخل نہ ہوں۔ البتہ بیگم سے یہ معلوم ہوا کہ ہر روز "نصیبا" شام کیوقت گودسے اتر کر اپنے صندلی پاؤں سے کھڑکی تک ضرور جاتا اور لاکھ منع کیا جاتا مگر وہ کھڑکی کو خوب پیٹ پیٹ کے "بھجائی، بھجائی" کہہ کے ضرور پکارتا۔ وہ بھی کھڑکی آتیں اور اُسے غالب کی مشہور غزل "آشیاں کیوں ہو۔ آسماں کیوں ہو" گا کے سنائیں اور ذیل کا شعر بار بار دہرائیں۔

وفا کیسی۔ کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

بیگم یہ بھی کہتی تھیں کہ آواز میں اس بلا کی کشش ہے کہ بیساختہ دل کھینچتا ہے اور ان کا بھی یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی کھڑکی کے پاس جاکے کھڑی ہو جائیں۔ بلکہ کھڑکی کھولکر گانیوالے کو کلیجے سے لگا لیں۔ میں نے طے کیا کہ اس نئی چھیڑ کا فوری تدارک ضروری ہے۔ اس لئے میں نے اشرف صاحب کے اسی وقت خط لکھا۔

مکرمی تسلیم۔ بی صاحبہ سے میری جانب سے عرض کر دیجئے کہ میرے گھر کے لوگوں کو ہر روز کھڑکی پر آکے پریشان نہ کریں۔ میں ممنون ہونگا۔" انہوں نے جواب میں لکھا: "وہ کہتی ہیں انہیں آپ کے بچے سے محبت ہے دن میں تھوڑی دیر کے لئے وہ اُسے بند کھڑکی کے دڑاڑوں سے جھانک کے دیکھ لیتی ہیں۔ اگر آپ اس بچے کو ہر روز میرے ہاں آدھ گھنٹے کے لئے بھیجا کریں تو وہ وعدہ کرتی ہیں کہ وہ آج سے کھڑکی پر ہرگز ہرگز نہ جائینگی۔" مجھے ان کی اس شرط پر حد سے زیادہ غصہ آیا میں نے جھلا کے لکھ بھیجا میرا بچہ نہ اس طرح کے ناشائستہ گھروں میں جا سکتا ہے اور نہ اس طرح کے ناپاک گودوں میں۔"

اسی دن کھڑکی میں دوسری جانب سے بھی قفل پڑگیا اور دڑاڑوں میں کاغذ کے ٹکڑے چپکا دیئے گئے۔ نہ کھڑکی کے پاس پھر گانا ہوا اور نہ بھیا کے چیخنے اور پکارنے پر کسی نے اعتنا کی۔ مجھ سے اور اشرف صاحب سے بھی صاحب سلامت بند ہوگئی غرض بائیکاٹ پورے طور پر ہوگیا مگر بھیا ہر روز کھڑکی پر جانے کے لئے مچلتا ضرور تھا اور روکے جانے پر فیل لاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ ماندہ سا بھی رہنے لگا۔ لیکن میں نے کسی امر کی پرواہ نہیں کی۔ میں اپنے ناسمجھ معصوم بچے کو گانے بجانے کا عادی نہیں بنا سکتا تھا اور نہ میں اسکی ضد پر اسے ہمسائی کی سی عورت کے پاس بھیج سکتا تھا۔ میں نے اس لئے یہ طے کرلیا کہ مہینہ ختم ہوتے ہی اس مکان اور اس ہمسائے کو خود ہی چھوڑ دونگا۔

اس فیصلے کے دو ہی چار دن بعد مجھے دفعتہً ایک سرکاری کام سے دیہات جانا پڑا۔ گو تقریباً تیس میل کا سفر تھا مگر میری فٹن کا گھوڑا کافی تیز اور مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں شام تک واپس چلا آؤنگا۔ بھیا کی طبیعت حسب معمول سست تھی۔ میں نے کوئی وسوسہ دل میں نہ آنے دیا اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنے چلا گیا۔ وہاں قصبہ میں خلاف معمول دیر ہوگئی۔ اور رات کے آٹھ بج گئے شہر سے پندرہ میل کا فاصلہ تھا اور نصف کے قریب سڑک بھی خام تھی مگر بھیا کی ماندگی کا خیال جو ابتک فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بالکل ذہن میں نہ تھا۔ آتے ہی دل گھبرا اٹھا۔ اور گو اہل قریہ مجھے روکتے ہی رہے مگر میں اسوقت روانہ ہوگیا۔ ابھی گاؤں سے مشکل سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا ہونگا کہ دفعتہً شمال و مشرق کی جانب کہ گھٹا اٹھی۔ سائیس نے گھبرا کر کہا۔ "حضور پانی آن والا ہے گاؤں پلٹ چلیں۔" میں نے گھوڑے کو تیز کرکے کہا "نہیں جی برسیگا نہیں۔ پھر ہم لوگ ڈیڑھ گھنٹے میں تو گھر ہی پہنچ جائیں گے۔"

مجھے خیال تھا کہ اس گھٹا کی بھی وہی حالت ہوگی جو اس سال لکھنو کے لئے روایت ہوگئی تھی۔ تین تین چار چار دن متواتر ابر آتا تھا مگر بلا تامل سیدھا پچھم بھاگتا چلا جاتا تھا۔ گویا منزل مقصود کہیں مغرب میں تھی اور لکھنو محض گذرگاہ تھا۔ لیکن میرے اس یقین کو چند ہی منٹ بعد پانی کی چادر نے پاش پاش کردیا۔ پانی برسا اور اس طرح سے برسا کہ جسم پر چوٹ لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی آسمانی دریا میں سیلاب آگیا ہے اور اس نے سارے بند توڑ ڈالے ہیں۔ بجلی علیحدہ چمکتی تھی اور گرج اس آفت کی تھی کہ الاماں والحفیظ۔

اب آپ ہی خیال فرمایئے کہ رات کا وقت، کچی

سڑک۔ بھڑکنے والا گھوڑا سنسان میدان اور پانی کا یہ شور۔ مزید مصیبت یہ آئی کہ گھوڑے کے جھٹکوں اور ہوا کے جھونکوں نے فٹن کی لالٹینیں بھی بجھا دیں۔ بس کچھ پوچھئے نہیں کہ راستہ کیونکر طے ہوا۔ اور جان کیونکر بچی موت خود ہی حفاظت کر رہی تھی۔ ورنہ مر جانا یقینی تھا

خیر خدا خدا کر کے پختہ سڑک پر پہنچے۔ اس پر تھوڑے ہی فاصلے پر بیڑی سگریٹ بیچنے والوں نے کچھ پھونس کے چھپر لب سڑک ڈال رکھے تھے۔ جب ہم لوگ ان کے قریب پہنچے تو سائیس نے سردی اور خوف سے کانپتے ہوئے کہا "حضور! یہاں دم لے لیجئے ذرا پانی رکے تو پھر چلیں"۔ میرا بھی سردی سے برا حال تھا۔ دوسرے گھوڑے کی منہ زوریوں سے دونوں ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ میں نے اب کے سائیس کی رائے پر عمل کیا اور فٹن روک کے اتر پڑا۔ اور ایک چھپر کے نیچے جہاں پانچ سات دیہاتی آگ جلائے بیٹھے تھے۔ میں بھی جا کے کھڑا ہو گیا۔ سائیس بھی گھوڑے کو ایک پاس ہی کے درخت میں اٹکا کے جلدی سے بھاگ آیا۔ دیہاتی میرے متعلق سائیس سے یہ معلوم کر کے کہ میں سرکاری افسر ہوں تھوڑا بہت سہم گئے اور سمٹ کے مجھ سے تھوڑی دور پر بیٹھ گئے دوکاندار نے ایک چھوٹی سی تپائی لا کے مجھے بیٹھنے کیلئے دی اور آگ کو لکڑیاں بڑھا کر تیز کر دیا۔ میں اپنا کوٹ اتار کر اسی پر سکھانے لگا۔

پانی کی شدت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی یہانتک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ دیہاتیوں میں کئی ایک وہیں گٹھری بنکے پڑ رہے اور انکے خراٹوں کی آوازیں پانی کی آوازمیں مل کے اسے اور بھیانک بنانے لگیں۔ دوکاندار بھی اونگھ رہا تھا۔ بھوک اور نیند سے میری خود بری حالت تھی۔ مگر پانی کیوجہ سے سب مجبور تھے۔ نہ کسی طرح کھلتا تھا اور نہ رکتا تھا بالآخر ایک بجے کے بعد کچھ کم ہوا۔ میں نے سائیس سے کہا "بھئی گاڑی کی لالٹینیں کسی طرح جلاؤ اور گھر چلو۔ اب ساری رات یوں نہیں بسر کی جا سکتی"۔ اس نے جلدی سے لالٹینیں جلائیں اور ہم لوگ پھر بھیگتے ہوئے گھر چلے۔ گھوڑے نے بھی اب کی تیزی نہیں کی بظاہر وہ بھی تھک گیا تھا یا نیند کی غنودگی میں تھا۔ بہر نوع ہم نے ہلکی دلکی کی رفتار سے بقیہ راستہ طے کیا اور کوئی تین بجے صبح کو گھر پہنچے۔

خیال تھا کہ وہاں سب خراٹے لے رہے ہونگے اور دروازہ کھلوانے کے لئے کافی چیخنا پڑیگا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مردانے کے کمرے میں روشنی جل رہی تھی اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں جا کے دیکھا تو اشرف صاحب بیٹھے ہوئے ناول پڑھ رہے ہیں۔ میں اپنے گھر میں انہیں اس طرح دیکھ کے حد درجہ گھبرا گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کیوں آپ اسوقت یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟" انہوں نے کہا "ہاں سب خیریت ہے آپ اندر جا کے فوراً کپڑے بدل ڈالئے"۔

میں بھی گھبرایا ہوا زنانخانے میں چلا گیا۔ وہاں جا کے دیکھا تو سارے گھر کی روشنیاں جل رہی ہیں بیگم اپنے پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ماما ظہورن پاؤں سہلا رہی ہیں اور بھیا کو ایک بیس برس کی حسین دوشیزہ گود میں لئے کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔ میں ایک اجنبی عورت کو اپنے گھر میں بے نقاب دیکھ کے پہلے تو جھجکا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اسکی ساری توجہ بچہ کی طرف مبذول ہے تو میں

استعجاب اور گھبراہٹ کا اسوقت بھی بڑی مشکل تو تھا ہی بیگم کے پلنگ کی طرف بڑھا گیا۔ وہ بھی گھبرا کے اٹھ بیٹھی تھیں میں نے ان سے پوچھا کیوں خیریت تو ہے؟ میرے اس معمولی سے سوال پر وہ تھیا ہ کہہ کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں

ماما نے کہنا شروع کیا "بی بی نا! آج شام سے آپ رو رو کے بیفضول کو اپنے کو ہلکان کر رہی ہیں۔ اب تو ماشاءاللہ بچا اچھا ہے۔ دل کو سنبھالئے آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں"

میں نے دیکھا کہ بیگم کے منہ سے پورا واقعہ سن لینا اسوقت محال ہے اس لئے ماما ظہورن سے کہا "تم ہی بتاؤ کہ ہوا کیا۔ کیا بھیا بیمار ہو گیا تھا؟ کیا بات ہوئی آخر؟" اس نے کہا "اے حضور کوئی بات نہیں۔ بی بی ابھی ماشاءاللہ خود ہی بچا ہیں اسی لئے ذرا سی بات سے گھبرا اٹھتی ہیں۔ بھیا کی طبیعت ماندی تھی مجھے حکم دیا کہ ڈاکٹر کو بلواؤ وہ موا ماما من گیا تو ڈاکٹر نہ ملے۔ وہ کہیں نکل کھڑے ہوئے تھے اپنی پھیری پر میں ابھی باہر ہی تھی کہ لڑکے کے چیخنے کی آواز سنائی دی اب جو آکے دیکھتی ہوں تو لڑکا تو خیر لڑکا ہی ہے بیگم صاحبہ بھی بچپنا کر رہی ہیں۔ بھیا مچلا تھا کہ ہم کھڑکی ہی پر جا کے دم لینگے اور یہ اڑی تھیں کہ اپنا اور تیرا خون ایک کر دونگی مگر کھڑکی پر نہ جانے دونگی۔ بچا زمین پر لوٹ رہا تھا اور یہ اسکو گھرک رہی تھیں جب وہ کسی طرح نہ مانا تو انہوں نے حضور اسکو دھوئیں دھوئیں پیٹ ڈالا ......"

میں نے دیکھا کہ میرے ہی چہرے پر آثار غم و غصہ نہ تھے بلکہ اجنبی دوشیزہ نے بھی ایکبار بیگم کو بہت ہی غصے سے دیکھا اور پھر گردن نہوڑا لی۔ بیگم نے دیکھا کہ ظہورن بچے کی صفائی میں ان کے سر سارا الزام منڈھے دیتی ہے۔ تو جھڑک کر بولیں تمہیں تو بات کا بتنگڑ بنانا خوب ہی آتا ہے۔ میں نے تو اُسے ایک ہلکا سا طمانچہ مارا اور تم کہتی ہو کہ میں نے اسے مار پیٹ کے رکھ دیا۔ بالشت بھر کا تو لونڈا ہے لیکن ایسے ایسے فیل لاتا ہے اور ایسی ایسی ضدیں کرتا ہے کہ جان عذاب ہو گئی ہے ...." ظہورن نے بات کاٹی "ہاں تو بی بی اب روتی کیوں ہو؟ اب جب اس کے دشمنوں کا یہ حال ہے تو دونوں آنکھوں سے گنگا جمنا کیوں بہ رہی ہیں؟"

میں نے دیکھا ان دونوں میں لڑائی چھڑی اور ظہورن نے دایہ ہونے کی حیثیت سے ماں کی زیادتیاں گنوانا شروع کیں۔ میں نے ڈانٹ کے کہا "اچھا ظہورن تم خاموش رہو ہاں جی بیگم۔ خدا کے لئے بیان کرو کہ کیا ہوا؟"

انہوں نے کہا "اے ہوا کیا۔ میں جانتی تھی کہ آج یہ کھڑکی پر جانے کے لئے ایسا شور مچائیگا۔ میں نے اسے کھڑکی پر نہ جانے دیا۔ بس اس نے چیختے چیختے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ڈاکٹر کو بلوایا وہ ملا نہیں۔ جب شام ہونے کو آئی تو سارا بدن اس طرح جلنے لگا کہ معلوم ہوتا کہ اگر دانہ ڈال دو تو بھن جائیگا میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں ظہورن کے طعنوں نے الگ دل پکار رکھا تھا۔ میں سوائے دعائیں دم کرنے اور رونے کے کر ہی کیا سکتی تھی ....."

ظہورن نے پھر بات کاٹی "اے تو میں طعنے کیوں نہ دیتی خود ہی بچے کو مار پیٹ کے اس حال کو پہنچایا اور خود ہی بیٹھ کے ٹسوے بہاتی تھیں۔ میں نے کہا اب بی بی بسورنے سے کیا فائدہ جب نہ سونچا جب دھوئیں دھوئیں اسے پیٹ رہی تھیں.."

میں نے غصہ میں کہا۔ "پھر تم لڑنے لگیں۔ میں واقعہ پوچھتا ہوں اور تمہیں طعنوں سے ہی فرصت نہیں ملتی صرف واقعہ بیان کرو۔ اور کچھ نہیں"

ظہورن نے آزردہ ہو کر کہا۔ "اے تو ہوا کیا بچے

کی ایک چیخ آسمان پر تھی تو ایک زمین پر۔ کچھ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں خدا بھلا کرے ان کا یہ جو بی ہمسائی بیٹھی ہیں ان کے میاں کو انہوں نے باہر آ کے آواز دی اور پوچھا کیا ہے۔ میں نے ان سے داستان کہہ سنائی۔ انہوں نے کہا۔ گھبراؤ نہیں میں ابھی ڈاکٹر کو لئے آتا ہوں۔ وہ یہ کہہ کے جانیکو ہی تھے کہ یہ نگوڑا مینہ پھٹ پڑا۔ وہ ٹھٹک کے کھڑے ہو گئے کہ ذرا پانی رُکے تو میں جاؤں۔ ایسے عالم میں تو ڈاکٹر حکیم کوئی نہ ملے گا۔ ادہر بھیا کی یہ حالت تھی کہ جب کوندا لپکتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی اسے کوڑے لگاتا ہے۔ بس ایک چیخ اوپر ایک نیچے۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ان ہمسائی سے اسکی چیخ نہ سنی گئی اور بیتاب ہو کر اسی پانی برستے میں چھتری لگا کے کھڑکی پر آئیں اور چیخ چیخ کر کھڑکی کھلوائی۔ انکو دیکھتے ہی بھیا ان کی گود میں چلا گیا اور اس طرح سسک سسک کر رونے لگا جیسے مدتوں کے بچھڑے مل کے روتے ہیں۔ انہوں نے لیتے ہی جیسے جادو کر دیا۔ . . . ” بی ہمسائی ابتک خاموش تھیں جادو کے لفظ پر چونک کے بولیں تو بی بی میں نے کوئی جادو نہیں کیا بیگم صاحبہ کی مار دھاڑ، کھینچا تانی میں بچے کی کلائی کی رگیں کھنچ گئی تھی تم نے کسی نے ادہر دھیان ہی نہیں دیا تھا . . . “

ظہورن نے پھر بات کاٹی۔ اے اللہ جیتا رکھے۔ بیٹیا تم نے میرے منہ کی بات لوک لی۔ میں تو خود یہی کہنے والی تھی۔ کہ بچے کھلاتے کھلاتے میرا چونڈا سفید ہونے کو آیا۔ اور اتنی بات نہ سوجھی۔ تم نے جو ذرا سا تیل کلائی میں مل کے اسے سینک کے لپیٹ دیا تو گویا جان میں جان آ گئی۔ پھر بھی جب سے تم ہی لئے بیٹھی ہو چیخ تو بالکل کم ہو گئی مگر بخار اسی طرح ہے۔ کیسا کیسا گانا سنایا۔ . . . . “

گانے کا نام سنتے ہی مجھے بی ہمسائی کا پیشہ یاد آ گیا اور بیساختہ میرے چہرے پر ان جذبات حقارت و نفرت کے آثار نمایاں ہو گئے جو میرے دل میں اس پیشے کی عورتوں کی طرف سے بھرے پڑے تھے۔ اللہ اللہ میں اور ایک قحبہ کا احسان مند! میرا گھر اور ایک بازاری رنڈی میرا بچہ اور ایک فاحشہ کی گود۔

ہمسائی نے میرے چہرے کو بغور دیکھا۔ نظریں نیچی کر لیں اور بچے کو آہستہ سے اٹھا کر ماں کی گود میں دیدیا ایسا معلوم ہوا جیسے پھولوں کی سیج سے اٹھا کر اسے کانٹوں کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس لئے کہ بھیا نے ایکبار آنکھیں کھول کے ماں کا چہرہ دیکھا اور پھر چیخنے لگا بیگم نے لاکھ جتن کئے چمکارا پیار کیا گلے سے لگائے اٹھ کے کھڑی ہو گئیں۔ ٹہلا ٹہلا کے لوری . . . . سناتی رہیں مگر بقول ظہورن کے اسکی چیخ ایک اوپر تھی تو ایک نیچے“!

ہمسائی اپنی جگہ سے اٹھ کے کمرے کے باہر دالان کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں گویا اس انتظار میں تھیں کہ پانی کم ہو تو وہ گھر واپس چلی جائیں۔ میں ابتک اسی طرح بھیگا کھڑا تھا۔ مجھے غصہ بھی تھا اور ڈر بھی۔ استعجاب بھی تھا اور تکلیف بھی غرض اتنے قسم کے جذبات بیک وقت میرے دل میں جمع تھے کہ مجھے اپنی جسمانی اذیتوں کا خیال تک نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ہمسائی کی خوشامد کر کی انہیں بچے کو گود میں لے لینے پر راضی کر لوں۔ مگر اپنے معصوم کو ایک معصیت پرور آغوش میں دینے سے کراہت معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ ماتا نے خودداری پر فتح پائی اور بیگم نے ہمسائی سے گڑگڑا کے کہا بہن تم اسکو پھر لے لو۔ یہ تمہاری ہی گود میں چپ رہے گا“

ہمسائی نے میری طرف ایکبار دیکھا۔ میرا چہرہ

بھی بجائے حقارت ونفرت کے اب عاجزی اور خوشامد کے آثار ظاہر کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنا آغوش پھیلا کے بھیا کو لے لیا اور محبت وانبساط سے گنگنا گنگنا کے اسے چمکارنا شروع کیا۔ بچے کی چیخ میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی وہ آنکھیں کھول کے ہمسائی کا منہ اس طرح تکنے لگا جیسے وہ انکی زبان سے کسی خاص چیز سننے کا مشتاق ہے۔ ہمسائی اس پر مسکرائیں اور کرسی پر بیٹھ کے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غالب کی وہی غزل گانے لگیں۔

کسی کو دیکے دل کوئی نوآسنج فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

بچہ اطمینان سے مسکرایا اور آنکھیں جھپکانے لگا

میں خود فراموشی کی حالت میں یہ سب دیکھ رہا تھا کہ بیگم نے میرا شانہ ہلا کے کہا "یہ بھیگے کپڑے کب تک پہنے رہیے گا؟" میں اس طرح چونک پڑا جیسے میں گہری نیند سے جگایا گیا ہوں۔ مجھے اسوقت اپنی حالت کا خیال آیا۔ یہ دوسری بار ایک ہی شب میں بری طرح بھیگا تھا اور دونوں بار ساری کپڑے جسم ہی پر قریب قریب خشک ہو گئے تھے۔ سویا بھی نہ تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ بھی تھا اور بھوکا بھی۔ مجھے اسوقت یاد آیا کہ مجھے بڑی دیر سے ایک غیر معمولی ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی ہے۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں کپڑے اتارنے چلا گیا۔

میں کپڑے بدل ہی رہا تھا کہ مجھے سخت سردی معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی کچھ چکر سا بھی محسوس ہوا۔ میں جلدی سے اپنے پلنگ پر آ کے کمبل اوڑھ کے پڑ رہا۔ سردی بڑھتی ہی گئی۔ میرے جسم پر گھر بھر کی رضائیاں، دلائیاں اور کمبل لا کے ڈال دیئے گئے مگر میری سردی کم نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بیگم کو بجائے بھیا کے ساری توجہ میری طرف مبذول کرنا پڑی۔ اور وہ ہمسائی کے سامنے ہی ساری دلائیاں اور کمبل دبا کے میری پیٹھ سے لگ کے بیٹھ گئیں۔ آدھ گھنٹے کے سخت لرزے کے بعد مجھے تیز بخار آ گیا اور بیہوش ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ تین دن تک میں کس عالم میں تھا کسی وقت ایکسو چھ اور ایکسو سات ڈگری سے بخار کم نہیں ہوا سرسامی بک جھک علیحدہ تھی۔ بار بار یہی کہتا تھا۔ میرا بچہ اور بیسوا کی گود! بھیا اور ناپاک آغوش میں! میرا بھول اور نیلے پر! یہ اشرف سے ذلیل شخص سے ملنے کا نتیجہ ہے! ہائے ابا جان زندہ ہوتے تو کیا کہتے! گانے بجانے والی رنڈی اور میرا گھر۔ مولویوں کا خاندان، مفتیوں کا گھرانا!" ہمسائی اور اشرف دونوں نے یہ سرسامی بڑ بار بار سنی۔ مگر باہر وہ اور اندر یہ دونوں میری اور بچے کی خدمت میں حد درجہ خلوص سے منہمک و مشغول رہے۔ اشرف صاحب ڈاکٹر کو بلاتے تھے۔ دوائیں لاتے تھے۔ اور روپیوں کا بندوبست کرتے تھے۔ اس لئے کہ گھر میں جتنے روپئے تھے وہ سب خرچ ہو چکے تھے۔ اور بنک سے بغیر میرے دستخط کے نکل نہ سکتے تھے۔ اندر ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ دن بھر بھیا کو لئے رہتی۔ اور شب کو اسے کھلا پلا کے جب سلا لیتیں تو میرے پاس آ کے بیٹھتیں اور میری تیمارداری اور خدمت میں بیگم کا ہاتھ بٹاتیں۔ بیگم تو کبھی کبھی تھک کے میرے پاس والے پلنگ پر سو جاتیں مگر ان کا بیان ہے کہ بی ہمسائی خواہ دن میں سوئی ہوں تو سوئی ہوں۔ لیکن تین راتیں تو اس اللہ کی بندی نے پلک سے پلک نہیں ملائی۔"

چوتھے دن مجھے ہوش آیا۔ اور سول سرجن نے جنکا علاج ہو رہا تھا۔ کہا کہ "اب کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

دو دن اور اشرف صاحب باہر اور ہمسائی اندر میرے مکان میں آتے جاتے رہے۔ تیسرے دن ہمسائی تھوڑی دیر کے لئے آئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو بیگم اتفاق سے ان سے باتیں کرتی کھڑکی تک چلی گئیں۔ جب ہمسائی اپنے مکان میں پہنچ گئیں تو انہوں نے کھڑکی اپنی جانب سے بند کرکے قفل ڈالدیا اور کواڑوں کی آڑ سے بولیں۔ "بیوی اب ماشاء اللہ بھیا بھی اچھا ہے۔ اور اس کے باپ بھی۔ مولوی صاحبکو ضعف البتہ ہے۔ وہ بھی دو چار دن میں چلا جائیگا۔ مگر ہاں میری اتی بات یاد رکھئیگا کہ جس دن ان کا غسل صحت ہو تو بسن اور صابون کا ذرا زیادہ انتظام کیجئے گا۔ اور ان سے کہہ دیجئے گا کہ اپنے کو اور بھیا کو اچھی طرح سے پاک کرلیں۔ ایک میری ناپاک گودوں میں ہفتہ بھر رہا ہے اور دوسرے کو میں نے اپنے نجس ہاتھوں سے کئی بار چھوا ہے۔"

بیگم "بہن بہن اے کھڑکی تو کھولو بہن" کہتی ہی رہیں، مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ یہ بھی وہاں سے حد درجہ رنجیدہ پلٹ آئیں اور گھر کے کسی کام میں لگ گئیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن صبح کو جب میں اٹھا تو طبیعت چاق تھی۔ محض ضعف تھا اور کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی۔ میں نے اسدن بیگم سے گھر کی حالت اور بیماری کی ساری کیفیت سنی۔ جب مجھے اپنی سرسامی بک جھک کی خبر ملی اور یہ معلوم ہوا کہ اشرف اور ہمسائی نے باوجود ان تمام باتوں کے عزیزوں سے زیادہ محبت و موانست برتی تو مجھے حد سے زیادہ خجالت و ندامت ہوئی۔ مجھے اس روز محسوس ہوا کہ رذیل و شریف کا فرق حد سے زیادہ مشکل ہے اور سوسائٹی کے قوانین کی پابندی میں افراط بعض وقت خود ہمیں بداخلاق و بدتہذیب بنادیتی ہے۔ چنانچہ میں نے حد درجہ شرمسار و منفعل ہو کے بیگم سے کہا "للہ ہمسائی کو بلالاؤ۔ میں ان سے معافی مانگونگا۔ میری اخلاقی حالت ان سے پست تر ہے مجھے انکو ذلیل کرنیکا کوئی حق نہ تھا" بیگم نے کھڑکی خوب کھٹکھٹائی اور "بہن بہن" کہہ کے پکارا مگر صدائے برخاست۔ میں نے ظہورن سے کہا کہ "امامن کو بھیج کے اشرف صاحب کو بلواؤ" وہ تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ معلوم ہوا وہ لوگ کل شام ہی کو اس مکان سے اٹھ گئے!

میں اپنے ضعف کیوجہ سے مجبور تھا ورنہ اسی وقت ان لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ دو دن اور اسی مجبوری میں گرفتاری رہا۔ تین دنکے بعد ڈاک سے ایک لفافہ ملا۔ چاک کرکے پڑھا تو لکھا تھا۔

"مکرم مولانا۔ تسلیم۔ امید کہ آپ کا مزاج اب بالکل اچھا ہوگا ماشاء اللہ بخار تو ہمارے سامنے ہی اتر گیا تھا۔ صرف ضعف تھا۔ یقین ہے کہ اب جبکہ ہمسائی سے ناپاک ہستیاں اٹھ گئیں ہیں تو وہ بھی جاتا رہا ہوگا۔ بھیا البتہ اپنی خالہ کے لئے کڑھتا ہوگا۔ مگر میں کیا کروں مجھے اس سے زیادہ تکلیف ہے۔ وہ تو بچہ ہے بہل ہی جائیگا مگر خود میرے پہلو میں ایسا ناسور ہے کہ جس کا اندمال محال ہے مجھے اسکی خالہ اور آپ کی "تنی ہمسائی" سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اور اس نے محض آپ کی وجہ سے ہم دونوں کو چھوڑ دیا۔ میں نے آپ سے درمیان گفتگو میں ایکبار کہا تھا کہ میں نے اس صورت کی، اس گلے کی اور دل کی رنڈی نہیں دیکھی صورت تو آپ نے دیکھ ہی لی ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں گلے بازی کی حالت آپ کیا جانیں۔ مولوی آدمی مگر اتنا تو شاید آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ کہ بھیا کیسی ہی تکلیف میں کیوں نہ ہو۔

کتنا ہی غصہ میں کیوں نہ ہو۔ جہاں "خالہ" نے کچھ گنگنا دیا اور وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ رہا دل! ہائے کیسے کہوں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئیگا۔ مگر اس نے آجتک باقاعدہ پیشہ نہیں کیا۔ وہ محبت کی بھوکی اور اپنے مادری پیشے سے متنفر ہے۔ پھر اتنی ملنسار۔ اتنی خوش خلق، اتنی فطرۃً نیک ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ آپ کی اور بھیا کی بیماری میں میں نے روپے نہیں خرچ کئے ہیں۔ میرے پاس اتفاق سے ایک پیسہ نہ تھا۔ اسی نے کئی سو روپے اپنے زیورات رہن رکھ کر دیئے ہیں! اس طرح کی عورت اور اس کے ساتھ آپ کا ظالمانہ برتاؤ کہ اٹھتے بیسوا، بیٹھتے قحبہ، واللہ دل پھٹ گیا! جس دن وہ آپ کے ہاں سے آئی ہے اسی دن شام کو وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے ماں کے پاس چلی گئی۔ میں نے ہاتھ جوڑے قسمیں دیں کہ مجھ سے نکاح کر لے مگر اس نے کہا نہیں میں بیسوا کے گھر میں پیدا ہوئی بیسوا ہی بن کے رہ سکتی ہوں۔ شریف نہیں بنسکتی! خدا توبہ قبول کر سکتا ہے۔ مگر انسان نہیں بخش سکتا ہے، وہ اور اسکے قانون خدائی قانون سے بھی زیادہ سخت ہیں! میں نے غلطی، کی کہ میں نے شریف بننے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے کئے کا پھل ملا۔ مجھے مولوی صاحب کے بچے سے محبت ہے۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے۔ میں تم دونوں کو کبھی نہ بھولونگی۔ مگر میں تم دونوں کو اب کبھی گلے نہیں لگا سکتی۔ اس لئے کہ میں رذیل ہوں اور تم شریف۔ میں ناپاک ہوں اور تم پاک"!

میں اس دن کے بعد سے اسوقت تک اسکی ماں کے کوٹھے کا کوئی دس پھیرے کر چکا ہوں۔ مگر وہ مجھ سے نہ ملی اس نے کہلا دیا "سمجھ لیں کہ میں مر گئی۔ میں ان سے زندگی بھر نہ ملونگی"! میں نے اسی لئے یہ حتمی قصد کر لیا ہے کہ چونکہ آپ میرے لئے اس "عذاب الیم" کا باعث ہوئے ہیں لہذا میں بھی آپ سے زندگی بھر نہ ملونگا۔ میں یہ خط آپ کو اسی لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آیندہ آپ مجھ سے ملنے کی کوشش فرما کر مجھے رنج نہ پہنچائیں۔ زیادہ والسلام۔ "خیر طلب

اشرف"

میں نے اسی وقت فٹن کسوائی اور بھیا کو ساتھ لے کر اشرف صاحب کے ہاں پہنچا۔ جب اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا میں نہیں مل سکتا۔ جو لڑکا پیغام لایا تھا میں نے اس کے ہاتھ میں بھیا کا ہاتھ دیدیا اور کہا اسے انکے پاس لے جاؤ۔ بھیا جانے کے لئے تیار نہ تھا مگر میں نے سمجھا کر کے اسے اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اشرف صاحب بچہ کو گود میں لئے ہوئے باہر آئے۔ اور مجھ سے منہ پھیر کے حد درجہ غصے سے بولے "فرمائیے کیا ارشاد ہے"؟ میں نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور ان کے قدموں کی طرف جھک کے کہا "بھئی معاف کر دو"! اور ہم دونوں آبدیدہ ہو کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے!

جب آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو پی چکا تو میں نے کہا "بھئی میں اسکی کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ غلطیوں کی تلافی ہو جائے اور بچھڑے مل جائیں"!

انہوں نے کہا "مگر اس کے لئے آپ کو اسکی ماں کے کوٹھے پر چلنا ہوگا"!

میں نے کہا "میں اسکے لئے تیار ہو کے آیا ہوں۔ آپ میری رہنمائی کریں۔ میں انشاء اللہ ناکامیاب نہ پلٹونگا آخر یہ ہمسائے یہ تو دیکھ لیں کہ میں نرا مولوی ہی نہیں ہوں بلکہ میں انسان بھی ہوں"! غرض ہم لوگ فٹن پر سوار ہوئے اور چوک پہنچے، اور عمر میں پہلی بار، سارے بازار کے سامنے

دل دھاڑے۔ میں اپنے معصوم بچے کو لئے ہوئے ایک رنڈی کے مکان پر چڑھ گیا! میرے پاؤں میں رعشہ ضرور تھا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے یقینی طور پر موجود تھے اور میری آنکھیں شرم سے بلا شبہ جھکی جاتیں تھیں مگر میرا دل ہر ذلت کے لئے آمادہ تھا۔ میں خوش تھا کہ آج میں محبت وانسانیت کی دیوی کے حضور میں اپنی خود بینی وخودداری کی قربانی چڑھا رہا تھا!

ہم لوگ ایک تنگ زینے سے ہوکر۔۔۔۔۔

ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچے۔ سامنے والے کمرے میں ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی اور اسکے گلے سے چمٹی ہوئی بی ہمسائی رو رہی تھیں۔ ہم لوگوں کے پاؤں کی آواز سنکے ہمسائی ماں کے سینہ سے آنسو پونچھتی علیحدہ ہوئیں اور مجھے دیکھ کے گھبرا کے کھڑی ہوگئیں میں نے جلدی سے بھیا کو گود میں اٹھا کے انکی طرف بڑھایا۔ ان کا ہاتھ فطرتاً پھیل گیا مگر وہ کچھ سوچکے جھجکیں۔ میں نے کہا "یہ اپنی خالہ کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں" بچے نے بھی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ بڑی محبت سے "خالہ! خالہ" کہا۔ اور ہمسائی نے روتی ہوئے اُسے آغوش میں لے کے گلے سے چمٹا لیا۔

بڑی بی نے اشرف صاحب سے کہا "اشرف میاں بیٹا نے جب آپ سے کہہ دیا کہ وہ اب آپ سے نہیں ملنا چاہتی تو پھر آپ اسے کیوں پریشان کرتے ہیں؟"

میں نے آگے بڑھ کے کہا "آپ پہلے میری دو باتیں سن لیجئے۔ پھر اشرف صاحب سے کچھ کہئے گا۔"

بڑی بی بولیں "فرمائیے" میں نے کہا "یہ تو آپ شاید جانتی ہونگی کہ اشرف صاحب سے اور آپکی صاحبزادی سے محبت ہے۔ وہ ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں ماشاءاللہ رئیس ہیں، صاحب جائداد ہیں، بن بیاہے ہیں۔ ایک سے ایک لڑکی انہیں مل سکتی ہے لیکن وہ انہیں کے گرویدہ ہیں اور انہیں کے عاشق اور وہ بھی غالباً ان سے محبت کرتی ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان دونوں کا عقد بہتر اور ضروری نہیں؟"

بڑی بی بولیں "بیٹے میں نے کب کہا بہتر نہیں مگر خدا جانے کیوں وہ اب ان سے نہیں ملنا چاہتی، حالانکہ انہیں کے لئے روتی بھی ہے کڑھتی بھی ہے۔۔۔۔"

ہمسائی نے کہا "اماں، اماں۔۔۔۔"

بڑی بی بولیں "چل چھوکری، میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں۔ اس وقت میری باتوں میں دخل نہ دے۔۔۔۔"

میں نے کہا "آپ کی صاحبزادی کو میری ذات سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ اسی لئے وہ اشرف صاحب سے بھی خفا ہوگئی ہیں۔ میں نے انہیں بیسوا اور قحبہ کہا اور انہیں اپنی عورتوں سے نہ ملنے دیا وہ اسی پر آزردہ ہیں۔۔۔۔"

بڑی بی بولیں "تو میاں آپ نے بڑی زیادتی کی آپ مجھے یہ سب کہہ سکتے تھے مگر اسے نہیں۔ قسم لے لیجئے جو سوائے اشرف میاں کے۔۔۔۔"

میں نے گھبرا کر بات کاٹی اور کہا "تو میں اسی لئے تو آج معافی مانگنے آپ کے کوٹھے پر آیا ہوں۔۔۔۔"

میں یہ کہہ کے ہمسائی کی طرف پلٹ پڑا۔ وہ اس وقت تک بھیا کو کلیجے سے لگائے تھیں وہ بھی انکی صورت دیکھ دیکھ کے کھلا جاتا تھا۔ اور بس ایک بات کی رٹ لگائے تھا کہ "خالا گھر چلو، خالا گھر چلو"

میں نے ہمسائی سے بہت ہی لجاجت سے کہا بی ہمسائی اب خدا کے لئے میرا قصور معاف کردو، واللہ تم میرے ایسے لاکھ شریفوں سے بہتر ہو! دیکھو بھیا تم سے کس کس طرح گھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ تمہاری بہن سخت انتظار کر رہی ہے۔ مجھے حکم ہے کہ میں تمہیں لے ہی کے پلٹوں۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتا پھر اپنی اور اشرف صاحب کی زندگی میری غلطیوں کی وجہ سے کیوں برباد کرو؟ تم ہمسائے میں نہیں میرے گھر چلو۔" تمہاری بہن اپنے ہاتھوں سے تمہیں دلہن بنائیگی۔ میرے ہی گھر سے تمہاری شادی ہوگی۔ میرے ہی پڑوس میں تم دونوں ہمیشہ رہو گے اور میں زندگی بھر تمہیں اپنی حقیقی سالی اور چھوٹی بہن سمجھونگا اور تمہاری خدمت کرونگا۔"

ہمسائی نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ بھیا نے پھر کہا "کھالا گھر چلو" میں نے کہا

"دیکھو تمہارا بھانجا کیا کہہ رہا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانتیں تو اس کی بات تو مان لو؟" ہمسائی نے گھبرا کے ماں کا منہ دیکھا۔ وہ بولیں بی بی میں تمہاری باتوں میں دخل دینا نہیں جانتی۔ مگر اتنا کہے بغیر بھی نہیں مانتا کہ اشرف میاں جیسا چاہنے والا میاں اور مولوی صاحب کے ایسے شریف ہمسائے بیٹیوں اور کسبیوں کو نصیب نہیں ہوتے!"

اشرف صاحب خاموش کھڑے ہم لوگوں کا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا بھئی تم چپکے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ کسی سے کہہ کے ڈولی منگواؤ۔ انہوں نے ہمسائی کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔ ان کی مسکراتی ہوئی آنکھوں پر بھیا نے اپنا پھول سا ہاتھ رکھ دیا وہ اس کی اس شوخی پر کھکھلا کے ہنس پڑی۔

میں نے اشرف صاحب سے کہا ارے یار ڈولی منگواؤ تم تو اب تک کھڑے منہ دیکھ رہے ہو؟"

بڑی بی نے کہا۔ آے تو یونہی؟ نہ سر میں کنگھا نہ بال میں تیل، نہ زیور پہنے نہ کپڑے بدلے؟"

میں نے کہا ہاں میاں یونہی! میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے: اور پھر میں تو بی ہمسائی کا قرضدار بھی ہوں!"

بڑی بی نے گھبرا کے میری طرف دیکھا۔ ہمسائی نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے کچھ کہنے سے منع کیا۔ اور جلدی سے بولیں تو ڈولی تو منگوا یئے!

بھیا نے خوش ہو کے اپنی خالہ کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ گویا گلاب پر گلاب رکھا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ کہتا ایک نجس ہے، دوسرا طاہر، ایک ناپاک ہے، دوسرا پاک! محبت کی شعاعیں دونوں کے چہروں کو نورانی کر رہی تھیں۔ اور دونوں کی آنکھیں روحانی مسرت سے چمک رہی تھیں۔

میں نے دل میں کہا مولویانہ پن ان پر سے قربان اور قدامت پرستی ان پر سے نچھاور!"

(علی عباس حسینی)



تنوع

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

نیرنگیٔ فطرت سے انساں مغموم بھی ہے مسرور بھی ہے
آزاد بھی ہے پابند بھی ہے مختار بھی ہے مجبور بھی ہے

کیفیتِ عشق و محبت سے دل شاد بھی ہے رنجور بھی ہے
ہمراز بھی ہے ناساز بھی ہے موصول بھی ہے مہجور بھی ہے

پابندِ تعین دیدہ و دل پروازِ تخیل بے پایاں
انساں اک طرفہ تماشا ہے محصور بھی نامحصور بھی ہے

ہیں دیکھنے والے بے گنتی پہچاننے والا ایک نہیں
وہ دُور بھی ہے نزدیک بھی ہے مستور بھی ہے منظور بھی ہے

آئینۂ فطرت ہے کوکب عکاسِ حقیقت ہے کوکب
محمود بھی ہے محمود بھی ہے بدنام بھی ہے مشہور بھی ہے

شاعری اور سوءِ مشاہدہ

از جناب مولانا محمد حسین صاحب ادیب ایم اے بی-ای-ڈی-

بعض نقاد محض فروعی باتوں کو لے کر بڑے بڑے شاعروں پر عدم صداقت اور سوءِ مشاہدہ کا الزام عاید کرتے ہیں مثلاً اولیور ہومس نے اپنے ایک شعر میں کروکس "(ایک قسم کا پھول جیسے زعفران کہتے ہیں) کو فیاض کی صفت سے متصف کیا ہے اور ساغر زریں سے اسکی تشبیہ دی ہے۔ اس پر رسکن کا اعتراض ہے کہ کروکس سال بھر میں صرف ایک بار پھول لاتا ہے اور پھولوں کی تعداد بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اسلئے وہ فیاض نہیں بلکہ سخت بخیل اور ممسک ہے۔ علاوہ بریں اس کا رنگ پیلا تو ہوتا ہے۔ لیکن اسمیں چمک نہیں پائی جاتی اس لئے ہم اسکو سنہری نہیں کہہ سکتے اور نہ اُسے ساغر زریں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن دنیائے شاعری میں اس قسم کا اعتراض کوئی وزن و اہمیت نہیں رکھتا۔ رسکن کیطرح شاعر نے کیمیاتی یا نباتاتی نقطہ نظر سے کروکس کا مشاہدہ و مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ اسکو اس کی ضرورت تھی۔ کوئی مرقع پیش کرنے میں شاعر کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ قدرتی منظر کی ہو بہو تصویر کھینچکر قارئین کے سامنے رکھدے بلکہ منظر نگاری کی غرض و غایت یہ ہے کہ شاعر کے دل پر جو اثرات مرتسم ہوئے ہیں وہی اثرات وہ سامعین یا قارئین کے دل میں پیدا کر دے۔ اولیور ہومس کے دل پر کروکس کی رعنائی وخوش نمائی کا جو اثر پڑا تھا اسے اس نے نہایت شاندار پیرایہ میں بیان کر دیا۔ شعر کو پڑھ کر ہر شخص کے دل میں پھول کی خوشنمائی، نظر فریبی اور رعنائی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے اسکو بیحد فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ شاعر کا یہی مقصد تھا جو پورا ہو گیا۔

اسی طرح مارک پیٹی سن نے ملٹن جیسے عظیم المرتبت وجلیل القدر شاعر کے کلام سے ایسے بیانات کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو اسکی دانست میں حقیقت و اصلیت پر مبنی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک معترضانہ بیان یہ بھی ہے کہ ملٹن نے اپنے دوست کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں لیسیڈاز کے تابوت پر جن پھولوں کے نچھاور کئے جانیکا ذکر ہے وہ ایک ہی موسم میں نہیں پائے جاتے۔

مغربی نقادوں نے شاعری کے جتنے عیوب و نقائص گنائے ہیں ان سب کو مولانا حالی اردو شاعری پر منسوب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوءِ مشاہدہ کی مثال ڈھونڈنے میں انکو بڑی دقت پیش آئی کیونکہ اردو شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے غزل کا شمار داخلی شاعری میں ہوتا ہے اور اس میں زیادہ تر جذبات وحسیات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اسلئے وہاں ایسے خارجی واقعات کا

جہاں حسن کی مشاہدہ و تجربہ سے تکذیب ہوتی ہو الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ جب غزلیات کے دفتر بے پایاں میں مولانا حالی کی تجسس نگاہیں سوء مشاہدہ کی کوئی مثال دریافت نہ کر سکیں تو مثنویات کا رخ کیا۔ بالآخر بڑی تلاش و تفحص کے بعد انکی عقابی نظر مثنوی سحر البیان کی حسب ذیل دو بیتوں پر پڑی۔

وہ گانے کا عالم وہ حسن بتاں
وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

مولانا حالی کا یہاں اعتراض ہے کہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں بوئی جاتی ہے لیکن شاعر نے متفرق فصل کے پودوں کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ شاعری میں ایما و اشارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے انگریزی میں اسے "سجسشن" کہتے ہیں۔ نثر میں واقعات من وعن بیان کر دیئے جاتے ہیں لیکن شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے وہ محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں۔ بعض وقت شاعر محض بے معنی اصوات کے اجتماع سے اس حالت کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جس کا ذہن نشین کرانا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ اردو میں ایسے سنجیدہ شعر کم پائے جاتے ہیں۔ جو بے معنی الفاظ و اصوات پر مشتمل ہوں۔ البتہ ایک مردم خوار دیو کا گھریلو قصہ ہے کہ اس نے بہت سے آدمی قید کر رکھے تھے۔ دن بھر وہ باہر جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا لیکن رات کو جب مکان پر آتا تو اپنی ڈراؤنی شکل کی بوڑھی ماں سے دو بدقسمت قیدیوں کو طلب کرتا اور انہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتا تھا۔ طلب کرنے والے الفاظ یہ تھے

"یاؤ ماؤ کھاؤ مانسوں کو لاؤ"

ظاہر ہے کہ پہلا فقرہ کچھ معنی نہیں رکھتا لیکن قصہ گو ان مہمل الفاظ کے ذریعہ سے بچوں پر خوف و ہراس کا جو جذبہ طاری کر سکتا ہے وہ معنی دار الفاظ کے ذریعہ سے ممکن نہیں بہرحال اس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کسی ذریعہ سے اگر پڑھنے والے کے ذہن میں اس حالت و کیفیت کا نقشہ کھنچ جائے جو شاعر بیان کرنا چاہتا ہے تو شاعری کا مقصد پورا ہو جائیگا۔ اگر ملٹن نے مختلف فصلوں کے پھولوں سے تابوت کو آراستہ کیا یا انکی خوش رنگی اور خوشنمائی بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا تو اس سے "لیسیڈاز" کے شاندار تابوت کی تصویر میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح میر حسن نے جو سماں باندھا ہے اسکی دلکشی و فرحت بخشی میں دھان اور سرسوں کی یکجائی کوئی رکاوٹ پیش نہیں کرتی۔ میر حسن کا بیان پڑھ کر ذہن ایک دلفریب مرقع کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور منظر کی خوشنمائی سے متاثر ہو کر حظ و انبساط حاصل کرتا ہے۔ قاری کا ذہن دو پودوں یعنی دھان اور سرسوں کے فصلی اختلاف کا اسوقت تک پتہ نہیں لگا سکتا۔ جب تک مثنوی کا ادبی کے بجائے نباتاتی یا زراعتی نقطہ نظر سے مطالعہ نہ کیا جائے یا جب تک سوء مشاہدہ کی مثال ڈھونڈنے کا پہلے سے خیال نہ رکھا جائے۔ لیکن شاعری ہمیں نباتاتی تفتیش یا حکمیاتی تحقیق کی

دعوت نہیں دیتی بلکہ وہ ہمارے احساس حسن کو بیدار کر کے ہمیں لذت اندوزی و مسرت گیری کا موقعہ بہم پہنچاتی ہو جب تک ملٹن یا میر حسن کے اشعار سے ہمارے قلب میں نشاط و اہتزاز پیدا ہوتا رہیگا۔ تجربہ و مشاہدہ کی احتسابی دار و گیر ان کی خوبی و لطافت کو زائل نہیں کر سکتی مسٹر اڈیسن جیسے بلند پایہ ادیب و نقاد کا خیال ہے کہ قدرتی مناظر و مرایا ہماری اعلیٰ انبساط جُو روح کے لئے باعث تسکین نہیں ہوتے کیونکہ وہ ظاہری حواس سے محسوس ہونیوالی اشیا سے کہیں زیادہ شاندار اور حسین و جمیل نظارہ کی طلب گار رہتی ہے۔ اسلئے ماہرین فنون لطیفہ قدرت کی محض نقالی و عکاسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے اعلیٰ تخیل کی سحر کاری انکی ذہنی پیداوار کو قدرتی پیداوار سے بہت زیادہ خوش منظر اور حیرت افزا بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کسی فنی شاہکار سے جو حظ و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ اسکا عشر عشیر بھی اصلی قدرتی اشیاءً سے حاصل نہیں ہوتا۔ مسٹر اڈیسن کے نزدیک رنگ آمیزی و حسن آفرینی کے ذریعے قدرتی اشیا و مناظر کو زیادہ شاندار لباس میں جلوہ گر کرنا اور روح انسانی کے ذوق طلب و شوق جستجو کی آسودگی و تشفی کے لئے کافی سامان بہم پہنچانا شاعر یا دوسرے صناع کا فریضہ ہے۔

قوانین قدرت و نوامیس فطرت کے تحت موسموں کی تبدیلی۔ فصلوں کا تغیر پودوں کی نشو و نما۔ پھولوں کا کھلنا پھلوں کا لگنا آہستہ آہستہ عمل میں آتا ہے۔ بیج سے پودے کے پھوٹنے اور بروز و بالیدگی کے مختلف مدارج طے کر کے بار آور ہونے کیلئے ایک مدت درکار ہے لیکن شاعر کی تعجیل کاری قدرت کی سست رفتاری کا ساتھ دینا پسند نہیں کرتی۔ اسکی سحر طرازی و طلسم سازی سے تمام ارتقائی مراحل آن کی آن میں طے ہو جاتے ہیں۔ وہ مختلف موسموں کی انفرادی خوبیوں کو یکجا کر کے ہمارے سامنے نہایت خوشگوار و تعجب خیز منظر پیش کر دیتا ہے۔ ریاض دہر میں گلہائے بوقلموں کے کھلنے کے اوقات ہوں تو ہوں لیکن سامری فن شاعر کی تخیلی کرشمہ سازی ہمیں وقت واحد میں رنگ برنگ کے پھولوں کی تر و تازگی و شگفتگی کا باصرہ نواز سماں دکھا سکتا ہے۔ اسکے طلسمی باغ میں موسموں اور فصلوں یا روشوں اور تختوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ وہ نہ مرز بوم کی نوعیت اور نہ آب و ہوا کی تاثیر کے اختلافات کی کچھ پرواہ کرتا ہے۔ وہ ایک ہی قطعہ زمین پر مختلف ملکوں اور مختلف فصلوں کے پھول پھل اُگا سکتا ہے اسکے پیدا کردہ چمن میں گل و لالہ، سنبل و ریحان، نرگس و بنفشہ کے پہلو بہ پہلو گیندا۔ موتیا۔ موگرا۔ بیلا ڈھاک اور کچنار کے تختے۔ بادام، پستہ، چلغوزہ اور اخروٹ کے متصل آم، جامن لیچی اور امرود کے پھل۔ اور سرو شمشاد کے محاذی مولسری اور فالسے کی قطاریں عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ وہ سرد سے سرد ملک میں آفتاب سے کافی نور و حرارت حاصل کر کے گرم ملک کے معالے پیدا کر سکتا ہے وہ ایک ہی کنج سے بلبل کا نغمہ۔ قمری کا ترنم۔ کوئل کی کوک۔ اور پپیہے کی ہوک سنا کر ہمیں وجد میں لا سکتا ہے۔ ہوا، پانی اور دوسرے عناصر پر بھی اسے اختیار حاصل ہے۔ وہ باد سموم کے جھونکوں اور دریائے ذخار کے بہاؤ کو جدھر چاہے پھیر سکتا ہے۔ جب اس عالم آب و گل کی مختلف اشیا کی یکجائی سے اسکو تشفی نہیں ہوتی۔ تو وہ عالم خیال سے ایسی ایسی عجیب و غریب چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے

جنکا نظارہ کسی انسانی آنکھ نے نہیں کیا ہو۔ وہ حوروں کو زمین پر اتار لاتا ہے۔ یہیں بجلی کے باغ کی سیر کراتا ہو۔ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر کا لانا سحر ائے لق و دق میں دریائے سیماب بہانا تشنہ کاموں کو کوثر و تسنیم سے سیراب کرنا اسکے تخیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسکے عجائب خانہ میں جام جم آئینہ سکندر خاتم سلیمان زنبیل عمرو۔ بال سیمرغ جیسے ہزاروں نوادرات پائے جاتے ہیں جو آجتک کسی آدم زاد کے ہم آغوش نظر نہیں ہوئے ہیں۔ اسکی فضائے تخیل میں عنقائے نادیدہ، ہمائے زریں پر۔ نسر طائر اور کرگس فلک معروف پرواز رہتے ہیں، وہ عربی جنوں اور عفریتوں، ایرانی دیوؤں اور پریوں۔ اور ہندی راکشسوں اور اپسراؤں کو ایک ہی اکھاڑے میں جمع کر کے اور متباین الاصل اشیار کو باہم ملا کر ایسی لطیف خوش آہنگی اور دلچسپ نیرنگی پیدا کر دیتا ہے جس کی نظیر قدرتی مادی دنیا میں ملنی محال ہے۔

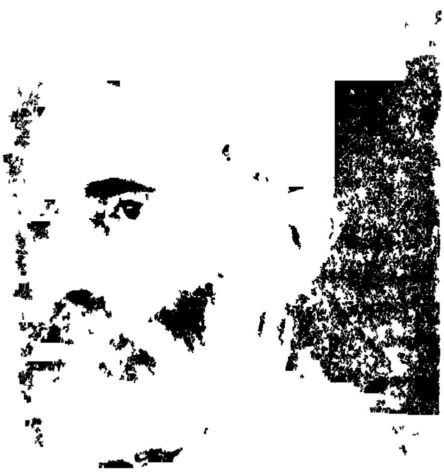
اگر مختلف مذاق کی چیزوں کا نہایت خوشگوار اتصال دیکھنا ہو تو امانت کی اندر سبھا کا مطالعہ کرو جس کے متعلق مولانا شرر فرماتے ہیں کہ "راجہ اندر ہندوؤں کا ایک بڑا دیوتا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے وضع ولباس میں ایرانی تاج پہنے مغلیہ دربار کے تخت پر بیٹھا ہے۔ اور ہندو دیومالا کے مذاق کے مطابق پریوں کا ناچ دیکھ رہا ہے، ایران کے دیوؤں نے ہندو راکششوں کا حلیہ اختیار کر لیا ہے جو راون کی فوج اور سپاہی بنے ہوئے ہیں۔ ایران کی لال۔ سبز۔ نیلم اور پکھراج پریاں پر لگائے اور مسلمان امیرزادیوں کا لباس پہنے ہندی اڑن کھٹولوں پر بیٹھ کے آتی ہندی دھنوں میں گاتی اور ہندی گتوں پر ناچتی ہیں۔ رہتی کوہ قاف میں ہیں اور بولتی اردو زبان ہیں۔ ہندوستان کی مسلمان سوسائٹی کی معشوقائیں ہیں اور اردو غزلوں کے ساتھ ہندی گیت ان کے گلوں سے سنے جاتے ہیں۔ شہزادہ گلفام اپنے نام سے ایرانی۔ اپنی وضع قطع سے اودھ کے شاہی خاندان اور لکھنؤ کی شیعہ سوسائٹی کا شہزادہ ہے۔ اس کا لال محل لکھنؤ کی سرخ عمارت ہے جس میں پہلے شاہان اودھ کا تخت تھا۔ اور اب عجائب خانہ ہے۔ اس کا شہر اختر نگر لکھنؤ ہے جسکو واجد علی شاہ کی شاعرانہ خیال آفرینی نے اس نام سے موسوم کر دیا ہے، بڑی لطف کی بات یہ ہے کہ سبز پری رہتی کوہ قاف میں ہے اور گلفام کو اختر نگر لکھنؤ سے بلواتی ہے اور بلواتے وقت کالے دیو سے کہتی ہے کہ

"جا تو سنگلدیپ سے اختر نگر میں یاں"

یعنی جزیرہ سراندیپ ہوتا ہوا جو ہندو دیومالا کی رو سے راون کا مرکز حکومت اور ہندی مذاق کے دیوؤں کا نشیمن تھا۔ پھر راجہ اندر برہم ہو کے گلفام شہزادے کو قید کرتا ہے تو کنوئیں میں جو اگلے زمانہ میں ہندوؤں کا نہیں بلکہ کیانیوں اور زابلستانیوں کا قید خانہ تھا۔ بعد ازاں سبز پری اس کے فراق میں بیتاب ہوتی ہے تو ہندوستان کی جوگن بنتی ہے جس کے چہرے اور پنڈے میں ہندوستان کی بھبھوت ملی ہے۔ سر پر ہندوستانی اِنڈوا ہے۔ زلفیں ہندوستان کی جوگنوں کی جٹائیں ہیں اور کندھے پر ہندوستان کا پرانا باجا بین ہے۔ اسکے نغمہ میں فارسی شاعری۔ ہندوستانی موسیقی، لکھنؤ کی ٹھمریاں۔ ہندوؤں کی ہولیاں اور اردو اور بھاشا زبانیں شامل ہیں۔"

اسے تم گڑبڑ جھالا سمجھو یا خیال آفرینی کا نتیجہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان متبائن اشیا کے باہمی اتصال میں جو لطف و خوبی ہے وہ ان کے افتراق سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اندر سبھا کے کردار زیادہ تر فرضی مخلوق ہیں۔

اور انکی ظاہری و باطنی خصوصیات میں ایرانی و ہندی عناصر کی آمیزش ہے تاہم اردو کا یہ پہلا ڈرامہ مدت سے انسانی قلوب کو محظوظ و مسرور کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی وہ لطف و دلچسپی کا مرکز بنا رہیگا وجہ یہ ہے کہ شاعر یہاں تعقل کو نہیں بلکہ تخیل کو مخاطب و متاثر کرتا ہے۔ جب متبائن الاصل چیزوں اور مختلف موسموں اور فصلوں کے پھول پودوں کا انبساط انگیز اجتماع شاعر کیلئے جائز ہے تو ملٹن یا میر حسن کے زیر بحث اشعار پر سوء مشاہدہ کا الزام عائد کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ جس شاعر کا دعوٰے ہو کہ جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں اور جس کے گلدستہ سخن کی زینت دہی کیلئے خود باغ جناں کے سدا بہار پھول بیتاب ہوں اس نے اگر صرف چمن دہر ہی کے بے موسم پھولوں سے اپنے دوست کا تابوت آراستہ کیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ تو اس متبرک تابوت پر روضۂ قدس کے پھولوں کی بارش کا سماں دکھا سکتا تھا۔ اگر ہم عقل و استدلال کی موشگافیوں اور تجربہ و مشاہدہ کی نکتہ چینیوں سے متاثر ہو کر لیسیڈاز کے تابوت سے بے موسم کے پھولوں کو علیحدہ کر دیں تو یقیناً اسکی شان و تجمل میں بہت فرق آجائیگا۔ اسی طرح اگر ہم میر حسن کی دلفریب سماں بندی سے سرسوں اور دھان کو جدا جدا کر دیں تو منظر بے لطف و بے اثر بنجائیگا۔ ہر شے کو اس کی قدرتی سطح سے بلند کرنا۔ حقیقی کو مثالی بنانا تخیل کی کارفرمائی سے فطری مناظر کے حسن و دلکشی کو دوبالا کرنا کمال شاعری کا تقاضا ہے۔ البتہ شاعر کو اتنی احتیاط ضرور کرنی چاہئے کہ بالکل متضاد و متناقض اشیا ایسی غیر متناسب مقدار میں جمع نہ ہونے پائیں کہ سامع کے دلکو کھٹکے اور اسکی طبیعت مکدر و بیزار ہو جائے۔ اگر خالی الذہن رہ کر کوئی شخص محض ادبی نقطۂ نظر سے ملٹن یا میر حسن کے زیر بحث اشعار کا مطالعہ کرے تو اس کا دماغ پھولوں یا پودوں کے اختلاف موسمی کی جانب ہرگز منتقل نہ ہوگا۔ مارک پٹیسن نے ملٹن کے کلام سے اور مولانا حالی نے میر حسن کے ادبیات سے سوء مشاہدہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ادبی نہیں بلکہ نباتیاتی اور کشاورزانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ اور حکمیاتی (سائنٹیفک) تلاش و تفتیش کا نتیجہ ہیں۔ شاعر کا کام لطف بخشی و انبساط انگیزی ہے۔ ادب و شاعری کا مطالعہ نکتہ چینی کے خیال سے نہیں بلکہ قدردانی و حظ اندوزی کی غرض سے کرنا چاہئے۔ ملٹن یا میر حسن کے زیر بحث اشعار کے مطالعہ سے ہمیں فرحت و مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کشاورزانہ عیب جوئی اور خشک منطقی اعتراضات کی زد سے باہر ہیں۔ علاوہ بریں میر حسن پر سوء مشاہدہ کا الزام اسوقت تو اور بے بنیاد و کاواک معلوم ہوگا۔ جب ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ شاعر نے اپنی مثنوی میں طلسمی اور مافوق العادت عناصر کا آزادی کیساتھ استعمال کیا ہے۔ وہ جس مقام کا مرقع پیش کر رہا ہے وہ دہلی یا لکھنو کا کوئی حقیقی باغ یا کھیت نہ تھا بلکہ وہ ایک خیالی و طلسمی منظر ہے جہاں دو مختلف فصلوں کے پودے آسانی سے پہلو بہ پہلو کھڑے کئے جا سکتے ہیں۔ طلسم خانہ میں ناممکن باتیں بھی ممکن اور محال چیزیں قابل وقوع بن جاتی ہیں۔



مولانا محمود اسرائیلی

میر تقی میرؒ

جناب مولانا محمود اسرائیلی

نہ مطرب ہے، نہ میکش ہیں، نہ مینا ہے، نہ ساقی ہے
مگر اجڑے ہوئے میخانے کی بنیاد باقی ہے
خم صہبا تھے جن پر وہ شکستہ سنگ ہیں اب تک
شراب ارغواں کے جن سے پیدا رنگ ہیں اب تک
شکستہ جام کے ٹکڑے نگینے بن کے چمکے ہیں
مدور ٹھیکرے خم کے دفینے بن کے چمکے ہیں
رسائی بوئے صہبا کی فضائے آسماں تک ہے
مہک جس کی فلک سے دامن کرّوبیاں تک ہے
اسی خوشبو سے غنچے جام رنگیں اپنا بھرتے ہیں
اسی پر موسم گل میں گلستاں ناز کرتے ہیں

ترے دم سے کبھی آباد تھا اردو کا میخانہ
مگر اب میر تو باقی نہ باقی تیرا کاشانہ
سبوئے دل سے جب تیری شراب شعر ڈھلتی تھی
لب معجز نما سے کیف کی دنیا نکلتی تھی
ترے جذبات رنگیں سے ہوئی زینت گلستاں کو
تری آہوں نے پیکاں کر دیا خار بیاباں کو
تو وہ نقاش فطرت تھا کہ کھینچی شکل غم تو نے
عطا کی عاشقوں کو لذت جور و ستم تو نے

شراب درد سے لبریز ہے تیرا کلام اب تک
نہیں ہے تو مگر گردش میں ہے یہ تیرا جام اب تک

۱۹۶۳

دو ہمنام

(عربی کے ایک دلچسپ افسانے کا ترجمہ)

از مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی پروفیسر مدراس یونیورسٹی

بیروت کے شہر میں ایک حصہ ہے جو بہت خوبصورت اور سرسبز و شاداب باغوں سے آراستہ ہے۔ اس کا نام "محلہ مارنیقولا" ہے۔ یہ مقام شہر کے شمال مغربی سمت میں واقع ہے۔ اس کا منظر بتا رہا ہے کہ یہ دولت مندوں اور بڑے آدمیوں کا محلہ ہے۔ یہاں شہر کے معزز لوگوں اور امیروں کے مکانات ہیں۔ اسی محلہ میں ایک جانب کو ایک شاندار مکان ہے۔ جس میں ایک نہایت شریف النسب خاندان رہتا ہے یہ گھرانا دو میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل ہے دونوں میں بڑا بچہ وہ ہے جس کی عمر دو برس سے زیادہ کی نہ ہوگی اسی کے ساتھ ایک ننھی سی بچی ہے۔ جسکو ابھی تک دودھ چھٹنے کے دکھ سے کام نہیں پڑا ہے اس گھر کے مالک کا نام امین مظلوم ہے۔ اور تجارت اس کا پیشہ ہے اس کا ایک شریک تجارت اور بھی ہے جس کا نام یوسف فضل اللہ ہے۔ پہلے تو یہ شخص اسی امین کے پاس ملازم تھا۔ مگر اپنی امانتداری اور ہوشیاری کے سبب مالک اس سے بہت محبت کرنے لگا۔ وہ برابر اسکی تنخواہ اور درجہ بڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مالک کی تجارتی کوٹھی میں برابر کا شریک ہوگیا۔

بدقسمتی سے سنہ ۱۸۹۲ء میں امین ایک سخت بیماری میں مبتلا ہوگیا۔ اور اسی میں اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے لئے بلیشمار دولت چھوڑ کر اس نے انتقال کیا۔ اور مرنے سے پہلے وہ اپنے اسی امانتدار شریک کو ان کا نگران بنا گیا اسکی وفات کو تقریباً ایک سال گزرا ہوگا کہ لالچ کے بھوت نے یوسف کو بہکایا کہ ایسا کیوں نہ کرو کہ یہ سارا دھن دولت تمہارے ہی قبضے میں آجائے۔ اور تمہارے سوا کوئی اس کا مالک نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے یوسف کو مناسب معلوم ہوا کہ اپنے مرنیوالے محسن کی بیوہ سے شادی کرلے۔ وہ یہ منصوبے باندھ کر طرح طرح سے اُسے پرچانے اور لبھانے لگا بہتیری کوششیں کیں۔ زور لگایا کہ کسی صورت سے بیوہ اُسکو اپنا شوہر بنانے پر راضی ہوجائے پر وہ نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ اس نے صاف انکار کردیا اور یوسف کی درخواست کو حقارت سے ٹھکرادیا۔ اسے اپنی امید پوری ہونیکی ذراسی گنجائش بھی نہ رہی، کوئی فریب نہ چلا، ساری ترکیبیں بیکار گئیں۔ مگر اس سے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اپنی ہوس بیجا سے ہاتھ اٹھائے غرض اب اُسے ایک اور نئی سوجھی۔ اس نے تمام دولت کو گن کر اکٹھا کیا۔ کیونکہ سب نقدی کی صورت میں تھی۔ اور سب کو لے کر ایسا چمپت ہوا کہ پھر کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔

مظلوم کی بیوی بچوں کے لئے یہ ایک زبردست چوٹ تھی کہ وہ یوسف کی بددیانتی سے ذرا سی دیر میں اپنی ساری دولت کھو بیٹھے۔ اور یہ حالت ہوگئی کہ جس گھر میں کھڑا رہتا تھا اب اس میں انکے سوا نقد ایک چھنچی کوڑی بھی نہ تھی اس مصیبت کو زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس مصیبت زدہ خاندان کو ان قرض خواہوں کی بدولت اس گھر سے بھی بالکل خالی ہاتھ نکل جانا پڑا جو مرحوم کے ترکے پر اپنا اپنا قرض وصول کرنیکے لئے ٹوٹ پڑے تھے آخر یہ بدنصیب اپنے دونوں بچوں کو لیکر ایک چھوٹے سے کرایہ کے گھر میں چلی آئی۔ مگر اس حالت سے کہ دیکھنے والوں کے دل غم سے پگھلے جاتے تھے۔ اس لئے کہ اسکے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ نہ وہ کوئی ایسا کام دھندا جانتی تھی کہ اسی کو کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتی نہ اسکی خودداری دوسروں کے آگے سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز آبرو اس طرح کھو دینے، بھوکا فاقوں سے مر جانیکو ہزار درجہ بہتر جانتی تھی غرض ایک روز ایسا آیا کہ اس کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے بچوں کا حلق تر کرسکے۔ وہ بھوک کے مارے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اور ماں کے پیروں سے لپٹ لپٹ کر اس سے کھانا مانگتے تھے وہ حیران تھی کہ کیا کرے آخر اس کی حیرت اور غم کی حالت میں تاریکیوں کے بادل چھا گئے وہ پل پل موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو ٹپکا رہا تھا۔ اور ان دونوں معصوم فرشتوں کی حالت دیکھ دیکھ کر سوز غم سے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ دونوں بار بار روتے اور ماں کا دامن پکڑ کر کھانا مانگتے تھے بھوک کی شدت نے انکی ساری قوت سلب کر لی تھی۔ ان کے پھول سے چہروں کی شادابی کو بالکل کملا دیا تھا اب اس بیچاری کو اس ہولناک منظر کی تکلیف دیر تک برداشت کرنے کی سکت نہ رہی۔ وہ زمین پر گر پڑی اور اپنی آنکھیں بند کرکے نہایت درد و غم کے ساتھ چپکے چپکے گڑگڑانے لگی۔ اس دانا سے رحم کی طالب تھی۔ جس کی آنکھ کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس کے بچے بھی اس کے پاس لپٹ گئے۔ ان تینوں کے آنسو لمبی لمبی سانسوں اور گرم گرم آہوں کے ساتھ ٹپ ٹپ ایک ایک کرکے ٹپک رہے تھے اور اس بیکس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے جو انتہائی گڑگڑاہٹ اور غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس وقت گرجوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں جو دینداروں کو نماز کے لئے بلا رہی تھیں۔ اس لئے کہ بڑی عید کی رات تھی اور ان گھنٹیوں کی گونج کے ساتھ خوشی کا جوش پھیلتا جاتا تھا لوگوں کا شور وغل اس مسرت کے جوش کو اور بڑھا رہا تھا مگر یہ تینوں اسی بیکسی کی حالت میں تھے کہ آہستہ آہستہ گھر کے دروازے کی کنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ پھر کسی خوبصورت ہاتھ نے چپکے سے دروازہ کھولا، صرف، چار حسین انگلیاں نظر آئیں، یہ گویا بلور کی قلمیں تھیں جو اس بدبختی اور بیکسی کے صفحے پر امید اور تسلی کی چند سطریں لکھنے آگئی تھیں۔ دروازہ پورا نہیں کھلا تھا کہ چوکھٹ پر ایک نہایت حسین، نوجوان عورت دکھائی دی، بڑی نازک اندام، بلا کی خوبصورت، نگاہوں میں فتنہ اور جادو بھرا ہوا، قد درمیانہ، خالص عربی حسن کی پوری وہ حسن جو نگاہوں کو اچک لینے اور دلوں کو موہ لینے میں جادو سے کم نہیں۔ وہ دم بھر کھڑی ہوئی۔ ان تینوں کو دیکھتی رہی —— اس کی شگفتہ اور روشن پیشانی پر رنج و حزن کے آثار نمایاں ہوئے، اسکی سیاہ چمکدار آنکھوں میں رحم کی جھلک نمودار ہوئی، اس نے جھٹ گھر والی کو رحم آمیز اور تہذیب

کے ساتھ سلام اور پھر کلام شروع کیا۔ اس طرح بغیر اگلی جان پہچان کے اپنے حاضر ہو جانے پر معذرت چاہی گھر والی نے خوش آمدید کہا، اور بلایا کہ آئیے بیٹھئے۔ وہ آکر بیٹھ گئی اور بولی۔ مجھے جو چیز آپ سے ملنے کے لئے یہاں کھینچ لائی ہے وہ اے معزز خاتون آپ کی شکستہ حالت ہے اور یہ کہ آپ کو اور دوستوں کی امداد کی حاجت ہے۔ بیوہ نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے جواب دیا

"ہاں اے معزز خاتون بیشک میری وہی حالت ہے جو آپ کہہ رہی ہیں میں زمانہ کی مصیبتوں کی ماری ہوں۔ مجھے اس نے ظلم اور بیوفائی کے ہاتھوں کچل ڈالا ہے اور میرے دونوں بچوں کو اس حالت پر پہنچا دیا کہ وہ صدموں اور ذلتوں کے کڑوے گھونٹ چار و ناچار پی رہے ہیں وہ بھی عزت اور خوشحالی کے بعد"۔

مجھے سب کچھ معلوم ہے اس بد ذات، ظالم شریک نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے یہ سب سن چکی ہوں، پھر بھی اس بہروقت کے غم اور صدمے سے کیا فائدہ اسوقت ان چند ناچیز درہموں سے کام چلا کر اپنی تکلیف دور کرو ضرور ایک دن ایسا آئیگا کہ جس شخص کے ہاتھوں نے جو کچھ گناہ کیا ہے۔ اسکی پوچھ گچھ ہوگی اور سزا ملیگی،

یہ کہہ کر روپیوں کی ایک تھیلی اس کے ہاتھ میں رکھ دی، پھر اپنی خادمہ کو بلایا، جو دروازہ کے باہر ایک تھیلا لئے کھڑی تھی، اس میں کچھ کپڑے تھے اور ایک قاب جس میں کچھ حلوے کی ٹکیاں تھیں پھر یہ بچوں کو بانٹ دیا۔ اور یہ رحم کی دیوی دروازے کی طرف بڑھی بغیر اس کے کہ بیوہ کو ذرا بھی شکریہ ادا کرنے اور احسان ماننے کا موقع دے اسوقت بچوں کی خوشی کا جو کچھ عالم تھا۔ وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ ان کی ماں اسکے پیچھے جھپٹی اور اس سے پوچھا خدا کے لئے یہ تو بتائیے کہ اے شریف بی بی آپ ہیں کون جو میرے ساتھ ایسی بھلائی کر رہی ہیں؟

اس نے جواب دیا اور حالت یہ تھی کہ بچوں کی وہ خوشی دیکھ کر جوان کو حلوا پاکر ہوئی تھی اسقدر متاثر تھی کہ اسکے آنسو آنکھوں میں ڈبڈبا رہے تھے اور جی چاہتا تھا کہ بے اختیار چلا کر رو پڑے۔

"بہن میں محتاجوں کی مددگار اور مصیبت زدوں کی ہمدرد ہوں، بس یہی میرا نام اور یہی میرا کام ہے۔

نہیں بلکہ تم رحمت کا فرشتہ ہو رحم و کرم کی دیوی ہو، اور محض ہم جیسے مسکینوں، بیکسوں کا دکھ درد دور کرنے کے لئے آسمان سے اتری ہو۔

یہ کہہ کر وہ جوش میں کھڑی ہوگئی اور اپنی محسنہ دیوی کو دیر تک کھڑی دیکھتی رہی۔ گویا اپنی نگاہوں سے اسکی مشایعت کا اخلاقی فرض ادا کر رہی تھی اس نے دیکھا کہ تھوڑی دور جاکر وہ ایک دوسرے گھر میں گھسی، جہاں ایک بوڑھا سخت بیمار تھا یہ سمجھ گئی کہ وہاں بھی یہ رحم و کرم کی دیوی کچھ احسان کرنے گئی ہے اسکو اس قدر حیرت تھی، کہ اس شریف بی بی کا نام معلوم کئے بغیر نہ رہا گیا بے صبری کے ساتھ لپک کر اس خادمہ کے پاس پہنچی جو باہر کھڑی ہوئی اپنی مالکہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اس سے پوچھا

"بہن یہ تو بتاؤ کہ یہ نیک دل اللہ کی بندی ہیں کون؟

اس نے ذرا تامل کر کے جواب دیا۔ ان کا نام ہے (سیدہ) ایلی خاتون

بس بس میں پہچان گئی۔ میں بہت فقیروں سے انکی خیر خیرات کی باتیں

سن چکی ہوں۔ وہ رات دن انہیں کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں۔

یہ کہا اور اپنے گھر کو پلٹ آئی۔ اس شریف بی بی کی تعریف زبان پر تھی۔ کہ کیا اچھی بی بی ہے محتاجوں کی پاس چھپ چھپکر پہنچتی ہے، انکی ہر طرح سے مدد کرتی ہے پھر نہ شہرت کی تمنا ہے نہ اپنی تعریف اور شکریئے کی آرزو

اس بات کو کئی ہفتے گذر گئے، اس بکیس بیوہ کے ساتھ اس شریف خاتون کے احسانوں اور نیکیوں کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ وہ ان کے ساتھ رحم و شفقت کا وہی برتاؤ کرتی رہتی تھی جو اس خاتون کے نسبت مشہور تھا۔ یوں اس نے اس خاندان کی زندگی بچالی، اور عزت آبرو رکھ لی، لیکن آہ وہ اس بیچاری غم کی ماری بیوہ کو موت کے خونخوار پنجے سے نہ چھڑا سکی، جو اس غم و صدمہ کے اثر سے اس واقع کے ایک مہینے بعد ہی اس بیچاری پر پڑا تھا۔ آخر اس نیکدل بی بی کی فطری شفقت نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ ان بچوں کو لیجائے اور اپنے خرچ سے انکی تربیت اور پرورش کرے غرض اس نے بچے کو تو ایک مدرسہ میں بھیجوا دیا، اور اسکی بہن کو جسکی عمر اب تین سال سے زیادہ کی نہ تھی، ایک غریب شریف عورت کے حوالہ کر دیا تاکہ اسکی تربیت کرے۔ اور اس خدمت کے عوض میں اسکی ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی۔

اس یتیم بچی کی انّا کا نام تھا حنّہ۔ اس عورت کا شوہر کسی تجارتی کمپنی میں منشی تھا۔ حنّہ کے چار بچے ہوئے۔ مگر ان میں سے ایک لڑکی کے سوا کوئی نہ بچا۔ اس کا نام اسمٰر تھا۔ اسی کے ساتھ حنّہ نے اس ننّی بچی کو بھی رکھا اس کا نام سلمٰی تھا۔ وہ اس کے ساتھ بھی وہی محبت اور توجہ کرنے لگی جو اپنی بچی کے ساتھ کرتی تھی۔ اور ان دونوں لڑکیوں میں وہی محبت ہوگئی جو سگی بہنوں میں ہوتی ہے۔

اتفاق سے چند روز بعد ہی یہ مصیبت پیش آئی کہ انا کا شوہر ایک سیاسی جرم میں مبتلا ہوا۔ قریب تھا کہ اس جرم کی سزا میں اسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ گرفتار ہو، اپنے گھر والوں کو لے کر بھاگ گیا۔ اسوجہ سے سلمٰی کے حالات اسکی مہربان پرورش کرنے والی خاتون سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگئے، اس نے بہت کچھ چھان بنان کی، بہت دنوں تفتیش جاری رہی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر بیچاری اسکی مایوس ہوکر بیٹھ رہی۔

اس یتیم بچی کی انا کے شوہر کا نام حلیم تھا یہ شخص اپنے وطن سے بھاگ کر سیدھا مصر (قاہرہ) پہنچا۔ یہاں چند روز بعد ہی اسکے مقدر نے اس کا ساتھ دیا۔ اور بہت جلد مالدار بنا دیا۔ وہ بڑی محنت سے کام کرتا اور بڑھتا رہا اس عرصے میں اس نے جو کچھ روپیہ پیدا کیا تھا۔ اس سے ایک زمین خرید لی، اسی اثنا میں زمین کی قیمت بتدریج بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں اس نے سب زمین جس کا وہ مالک تھا فروخت کر ڈالی، اس کی قیمت سے وہ دو ملین فرنک (   ) دولت کا مالک بنگیا۔ اس میں سے زیادہ روپیہ کے اس نے ایک شکر کی کمپنی میں حصے خرید لئے۔ اور یوں فکر معاش کیطرف سے مطمئن ہوکر وہ پورے تیرہ سال غائب رہنے کے بعد امیر بنکر شان سے اپنے گھر والوں کو لے کر اپنے وطن بیروت واپس ہوا۔ جس وقت یہ خوش قسمت خاندان جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ حلیم کی بیٹی اسمٰر کو کئی شدید دورے پڑے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہلک بخار رہنے لگا۔ جس نے اسکے ماں باپ کو سخت پریشانی میں ڈال دیا، جیسے ہی جہاز لنگر انداز ہوا۔ یہ لوگ اترتے ہی سیدھے

ایک ہوٹل میں پہنچے، اور ڈاکٹر کو بلانے کیلئے آدمی بھیجا۔ ان لوگوں سے قریب ہی ایک چھوٹا سا گھر تھا، جہاں ایک طب کا طالب علم رہتا تھا، یہ بیروت کے امریکن طبی کالج سے حال میں ہی ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے نکلا تھا، یہ اپنی ذہانت اور علاج کی عمدگی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ ہوٹل کا آدمی جھٹ اس کے پاس پہنچا، اور ان لوگوں کی استدعا پر لڑکی کے علاج کے لئے اُسے بلایا، ڈاکٹر فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ ڈاکٹر کی عمر کوئی بیس سال سے زیادہ کی نہ ہوگی خوبصورت نوجوان تھا چہرہ کا رنگ کھلا ہوا پیشانی چوڑی، اور بدن چھریرا اسکی صاف نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ بڑا شریف طبیعت اور اچھے اخلاق کا انسان ہے۔ جب وہ مریضہ کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ پلنگ پر بے سدھ پڑی ہوئی ہے، زور زور سے دل دھڑک رہا ہے سر ٹیڑھا ہوا گیا ہے، سیاہ بالوں کی لٹیں کھل کر بکھر گئی ہیں اور اسکے کملائے ہوئے چہرے کے ارد گرد بل کھا رہی ہیں گویا تاریکی پوری پھیل چکی ہے اور اسکی زندگی کا سورج بہت جلد ڈوب جانیکی دھمکی دے رہا ہے، اس رنج دہ سماں نے ڈاکٹر پر بڑا اثر کیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل اس دوشیزہ کی حالت زار دیکھ کر بیتاب ہوگیا ہے اور پگھلا جاتا ہے۔ جو بیچاری فنا کے گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑی اور اس میں گرنے ہی والی ہے، اس نے ماں باپ سے اسباب اور حالاتِ مرض معلوم کرنیکے بعد پوری توجہ سے علاج شروع کر دیا۔ خدا کی شان ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاہم بیماری دور ہو جانیکے بعد بھی ڈاکٹر کی آمد و رفت کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر اور اس خاندان میں محبت اور دوستی کی کڑیاں اس مرحلے

میں بہت مضبوط ہو چکی تھیں، اور اس نے یہ بھی اندازہ کیا کہ اسمار کا میلان اس کی طرف ہے، یہ اور زیادہ اسمار کو پرچاتا اور لبھاتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں نے ایک دوسرے پر اپنی پاک محبت کا راز ظاہر کر دیا۔ جنہیں دونوں ابتک اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ ماں باپ نے ان دونوں کی آپس میں منگنی کر کے اور بھی اس پر مہر ثبت کر دی۔ کیونکہ وہ طبیب کے حسن اخلاق اور شائستگی کا پورا اندازہ کر چکے تھے، اس خاندان میں سب سے زیادہ جسے اس رشتہ کی خوشی ہوئی وہ ان کی پروردہ بیٹی سلمیٰ تھی۔ وہ اسمار کو ایسا ہی چاہتی تھی جیسے سگی بہنیں اور بات یہ ہے کہ وہ اب تک یہی سمجھے ہوئے تھی کہ ان کی سگی اور شرعی بیٹی ہے۔

ان لوگوں نے ہوٹل کو چھوڑ دیا، اور برج کے قریب ایک خوبصورت مکان کرائے پر لے لیا، اسے عمدہ فرش فروش سے آراستہ کر کے مزے سے اس میں رہنے سہنے لگے ان کے گھر کے آس پاس ایک ہرا بھرا باغیچہ بھی تھا۔ اور اسی سے ملا ہوا دوسرا گھر کا پائیں باغ، جس میں کا مالک مکان رہتا تھا۔ صرف ایک دیوار ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھی۔ جو کلیوں اور پھولوں سے لدی تھی۔ دونوں بہنیں صبح شام درختوں کے جھنڈوں میں اور ٹہنیوں کے نیچے ٹہلتی پھرتی تھیں۔ ان دونوں کو جوانی کی شراب نے بدمست بنا دیا تھا۔ اور زمانے نے اپنی مصائب کی نگاہیں انکی طرف سے بند کر لی تھیں غرضکہ یہ دونوں شباب کی متوالیاں دوشیزوں کے گہواروں میں جھولتی رہتی تھیں، وہ فطرت کے حسن و جمال اور اپنی تابناک امیدوں کی روشن جھلکیاں دیکھ دیکھ مسکراتی رہتی تھیں۔

ان کے گھر سے لگے ہوئے گھر کی ایک کھڑکی سے ایک نوجوان جس کی بڑھتی ہوئی جوانی کا عالم تھا، ان دونوں کی پیاری پیاری حرکتوں کو غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے خیالات کا مرکز ان دونوں میں سے کندنی حسن تھا۔ مگر ان لڑکیوں نے باوجودیکہ وہ بہت زیادہ گھورتا رہتا کبھی اسکی کچھ پرواہ ہی نہ کی۔ اس نوجوان کا نام لطیف تھا جس کا باپ بے حساب دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ مگر یہ بدنصیب ساری دولت بیہودہ اور اسی قسم کی اور بیہودہ حرکتوں اور بدچلنیوں میں برباد کر چکا تھا جن کے جال سے اس ملنے کے بہت کم نوجوان بچتے ہیں خاص کر وہ جو بغیر کسی تکلیف ومشقت اور دکھ درد کے بڑی دولت کے وارث ہو جاتے ہیں۔ تحقیق کے بعد لطیف پر پوری طور پر یہ حال بھی کھل گیا کہ یہ گھرانا بڑا دولت مند ہے اس نے اپنے جی میں سوچا کہ ان لوگوں سے راہ ورسم پیدا کرنا اور میل جول بڑھانا چاہیئے ممکن ہے کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو اس کے مدد سے اپنا قرض ادا کرنے میں آسانی ہوگی۔ اور اپنے نام کو رسوائی وفضیحت اور عزت میں بٹا لگنے سے بچا سکوں گا۔

اس امید پر وہ اپنی والدہ کو لیکر ان لوگوں سے ملنے کو آیا۔ جیسا کہ شامیوں میں غیر لوگوں سے پہلے پہل ملنے کے لئے رواج ہے۔ یہ لوگ بہت تپاک اور عزت سے پیش آئے احترام سے استقبال کیا، خاطر مدارت کی اس کے بعد برابر ملاقاتیں ہونے لگیں، سلمٰی اور اسکے نوجوان ہمسایہ میں محبت کے پینگ بڑھنے لگے، اسوجہ سے اور بھی کہ وہ طرح طرح سے سلمٰی کو رجاتا اور لطف ومحبت ظاہر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر بھی برابر اپنی منگیتر سے ملتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز ڈاکٹر نے اپنی سادگی یا شرافت سے اسماء کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا یعنی اسکو اپنے تمام مادی حالات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تو بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ اور انکی امیدوں کا تمام تر سہارا وہ پیشہ ہے جو انہوں نے سیکھا ہے، تعلیم کی مدت تو پوری ہو چکی تھی ڈاکٹر کا اب ارادہ ہوا کہ آستانے (قسطنطنیہ) جاکر امتحان سرکاری میں شریک ہو جائے، اس نے اپنی منگیتر سے رخصت چاہی، دونوں نے نئے سرے محبت کے پیمان باندھے قسمیں کھائیں کہ اپنے وعدوں پر ثابت اور محبت پر قائم رہینگے، اس کے بعد ڈاکٹر روانہ ہو گیا۔

لطیف اس گھر میں آتا جاتا تو تھا ہی، جب تعلقات بڑھ گئے تو ایک دن سلمٰی کے لئے اپنا پیام دیا حلیم اور اس کی بیوی حنہ نے یہ سوچا کہ شادی کا معاملہ ہے عمر بھر کا ساتھ ہے، اس لئے معاملہ طے ہونے سے پہلے سلمٰی کے تمام حالات سے اسے آگاہ کر دینا چاہیئے تاکہ بعد کو کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو اور لطیف غلط امیدیں نہ قائم کر لے۔ غرض انہوں نے سلمٰی کی پوری تاریخ اسکے سامنے دہرادی، جب لطیف کو یہ معلوم ہوا کہ سلمٰی انکی شرعی (سگی) بیٹی نہیں ہے اور نہ ان کے مال ودولت میں اس کا کچھ حصہ بخرہ ہے تو اب یہ بہت سٹ پٹایا اور اپنا پیام واپس لے لیا۔ اب اس نے اسماء پر ڈورے ڈالنا شروع کئے طرح طرح کی ایسی ترکیبیں کرنے لگا کہ کسی صورت سے ڈاکٹر کی طرف سے اس کا دل پھیر دے اور خود اس سے شادی کر کے بلا شرکت غیرے اس خاندان کی تمام دولت

وثروت کا خود مالک بن جائے۔ غرضکہ اسماء کو پھسلانے اور اپنی طرف مائل کرنے میں کوئی کوشش اس نے اٹھا نہ رکھی، ڈاکٹر کی غیر موجودگی، نیز لطیف کے فریب دولت و جاہ نے جس کا وہ اس خاندان پر اظہار کرتا رہتا تھا، اور ڈاکٹر کی مفلسی و غریبی نے اور زیادہ اس کا ساتھ دیا، اسباب مذکورہ کی بنا پر ماں باپ بھی بہ نسبت ڈاکٹر کے لطیف کو زیادہ پسند کرنے لگے تھے، اس لئے کہ آجکل مرد کی قیمت اس کا مال اور جائداد ہے نہ کہ اسکی لیاقت اور شرافت ہنوز سلمیٰ کو کچھ خبر نہ تھی، وہ برابر اپنے پڑوسی پر لٹو تھی اور بڑی بے چینی سے اسوقت کا انتظار کر رہی تھی۔ جبکہ لطیف اس کے آگے اپنی تمناؤں کا پردہ کھولیگا۔ اور اپنی محبت سے اسے آگاہ کریگا مگر یہ وقت نہ آیا، بلکہ اس نے دیکھا کہ اب وہ اسکی بہن اسماء کی طرف زیادہ مائل ہے پھر بھی شریف سلمیٰ نے بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ نہ دی، خاص کر اس سبب سے اور بھی کہ اسکی بہن ڈاکٹر کے ساتھ منسوب ہو چکی تھی۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا، کہ زمانے نے آخر حقیقت کو کھول دیا جسے یہ بھولی بھالی لڑکی اب تک اپنے نزدیک محال سمجھ رہی تھی۔ اس لئے کہ اسکی بہن اسماء کی منگنی اس کے پڑوسی لطیف کے ساتھ ہو گئی، اس کام میں جو چیز سب سے زیادہ معین اور عجلت کا سبب ہوئی وہ اسماء کے باپ کی ناگہانی تباہی تھی۔ جو حال ہی میں شکر کی کمپنی کے دوالیہ ہو جانے اور اس کے شیئرز (حصوں) کی قیمت بے انتہا گر جانے کی وجہ سے اس پر نازل ہو گئی تھی، مگر یہ بات گھر کے سوا باہر کے ہر آدمی سے مخفی تھی۔ منگنی کے بعد ہی اسماء کے ماں باپ کو شادی اور رخصتی کی جلدی ہوئی۔ تاکہ یہ بات مشہور ہونے سے پہلے ہی اس نیک کام سے فراغت ہو جائے اور شادی سے پہلے دولہا کو خبر نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ انکی بیٹی

اس مبارک دولت سے محروم ہو جائے۔ جو اس شادی کے بعد شوہر کی طرف سے میسر آنیوالی ہے۔ اب سلمیٰ پر حقیقت کھلی کہ اس کے ساتھ لطیف کی ساری محبت اور للو پتو، صرف اس کی بہن تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی، اس کے سوا اور کچھ نہیں، لطیف کی اس فریب کاری اور بیوفائی کا اس پر بہت برا اثر پڑا تاہم اس نے اپنے غموں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اس نے اشارتاً کنایتہً بھی کوئی ایسی بات نہ کی جس سے اس کے دکھ درد کا ذرا سا بھی اندازہ لگایا جا سکے، اسی وجہ سے روز بروز وہ کڑھ کڑھ کر گھلنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آخر کار سخت بخار رہنے لگا۔ اسوجہ سے اس کے مربی (تربیت کرنیوالے) مجبور ہوئے کہ اسے امراض معدہ کے اسپتال میں داخل کر دیں:

اس اسپتال کی نگران (سپرنٹنڈنٹ) سیدہ ادمار تھی جو اپنے اخلاق و تہذیب اور حسن و جمال نیز اپنے نیک کاموں کی وجہ سے بیحد شہر میں مشہور تھی، باوجودیکہ وہ اونچے گھرانے کی اور بڑی امیر کبیر بی بی تھی۔ پھر بھی مریضوں کی دیکھ بھال اور بیکسوں کی امداد سے ذرا بھی نہیں گھناتی تھی۔ وہ اپنے روپے، اور حسن سلوک سے احسان کرتی رہتی، اور خود انہیں اپنے گورے گورے سفید ہاتھوں سے دوا پلاتی تھی۔ وہ پیارے ہاتھ جنہیں غیر ممکن تھا کہ کوئی دیکھے، اور ان کا تمنائی نہ ہو جائے کہ کاش میں بھی بیمار ہوتا۔ اور یہ ہاتھ میری تیمارداری کرتے میں بھی اس فرشتہ صفت دیوی کی لطیف اخلاق اور پاکیزہ تہذیب سے مستفید ہوتا۔ سیدہ ادمار سلمیٰ کو دیکھتے ہی حد سے زیادہ اس پر مہربان ہو گئی، خود اسکی تیمارداری اپنے ذمے لی۔ مگر آہ وہ کیا کرتی، اس لڑکی پر بخار کا حملہ نہایت سخت تھا، کسی علاج سے اسے

کوئی فائدہ نہ ہوا، اسکی حالت روز بروز بگڑتی اور بیماری
دن بدن طول پکڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ دن بھی آگیا۔
جس دن اس کی بہن کا پہلا منگیتر ڈاکٹر آستانے سے کامیاب
ہوکر واپس آگیا۔ یہ بھی پہلے پھر روز اس اسپتال میں کام
کرچکا تھا۔ جب اسپتال کی نگران کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فرید
آستانے سے واپس آگیا ہے تو اس نے فوراً ہی اسے بلانے
کیلئے آدمی بھیجا، کیونکہ اس بی بی کو اس کی رائے پر پورا بھروسہ
تھا، اسے امید تھی کہ شاید اس دوشیزہ کو ڈاکٹر کے علاج سے
صحت ہو جائے گی۔

ادھر طبیب نے اپنے وطن پہنچتے ہی سب سے پہلے
سیدھا اپنی منگیتر کے گھر کا رستہ لیا دروازے پر ہی خادم سے
مڈبھیڑ ہوئی، اس نے مختصر طور پر خبر دی کہ اسماء کی شادی
ایک دوسرے شخص لطیف نامی سے ہو چکی ہے اسکو سخت
صدمہ ہوا، اور یہ نہایت غم واندوہ اضطراب اور پریشانی
کی حالت میں گرتا پڑتا وہاں سے روانہ ہوا، اور سیدھا
ایک بڑے شاندار مکان پر پہنچا، اور بلا اجازت گھر کے
اندر داخل ہوکر اس نے سیدہ امیلی سرتق سے ملنے کیلئے
نوکر سے کہا۔ تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ گھر کی مالکہ نہایت
شگفتگی اور مسرت کے ساتھ آگئیں، اور جیسے ہی انہوں
نے ڈاکٹر فرید کو دیکھا، بڑی گرمجوشی اور محبت کے ساتھ
ہاتھ ملایا۔ لیکن وہ ابھی زبان نہیں کھولنے پائی تھی کہ غم و
اندوہ سے ڈاکٹر کا چہرہ نڈھال اور اسکی نگاہوں میں پریشانی
کے آثار دیکھ کر دہل گئی، اور گھبرا کر زور سے بولی، عزیزی
فرید یہ کیا حالت ہے۔ میں تمہیں اس پریشانی میں کیوں دیکھ
رہی ہوں؟

اس نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے روتی
آواز میں جواب دیا۔

محترم خاتون! میں بالکل آمادہ سفر ہوں، اور
آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کو آیا ہوں۔ شاید
اسکے بعد پھر ملاقات نہ ہوگی۔ مگر میں آپ کی شفقتیں آپ
کے احسانات جو مجھ پر ہمیشہ رہے ہیں کبھی نہ بھولوں گا کیونکہ
آپ برابر تیرہ سال تک مجھ پر وہ شفقت فرماتی رہی ہیں
جو صرف ایک ماں ہی اپنے بچے پر کرسکتی ہے،

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری ان باتوں کا
آخر مطلب کیا ہے اور یہ کیسا سفر ہے جس کا تم نے ایسا پکا
ارادہ کرلیا ہے۔

میں اس لئے جانا چاہتا ہوں کہ اپنی بہن کو ڈھونڈونگا
وہ بہن جس کے سوا اب میں کسی کے لئے دنیا میں جینا نہیں چاہتا

لیکن وہ تمہیں کہاں اور کیونکر مل سکتی ہے میں
اسے بارہ تیرہ سال سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ ملنا تو کجا اب تک
اس کا پتہ بھی نہیں چلا۔ باوجودیکہ برابر تفتیش کا سلسلہ جاری ہے

میں دنیا کے تمام آباد حصوں میں اس کا کھوج
لگانے کی کوشش کرونگا۔ بس یا تو یہ کہ اسے پاؤنگا۔ ورنہ دنیا
اور جو کچھ دنیا میں ہے سب پر سلام بھیج دوں گا۔

وہ یہ باتیں کر رہا تھا، اور خاتون اسکی حالت
پر نہایت متاثر ہوکر سر جھکائے سن رہی تھی کہ وہ آدمی آیا جسے
اسپتال کی نگران نے اس نوجوان ڈاکٹر کو بلانے کے لئے
بھیجا تھا۔ اور جو ڈاکٹر کو اس کے اور اسکی منگیتر کے گھر
تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

طبیب نے اس سے پوچھا، کہ کس لئے بلایا ہے
نوکر نے اس مریضہ کی شدید بیماری اور منتظمہ کی اس پر
غیر معمولی توجہ اور شفقت کا حال بیان کیا۔ سیدہ امیلی کی

رگ شفقت بھی اکدم بھڑک اٹھی، وہ بھی بیتاب ہوکر اپنی عادت کے موافق ڈاکٹر کے ساتھ ہوگئی، اس دوشیزہ کی اور نیز دوسرے غریب محتاج اعانت بیماروں کی امداد کے خیال سے جیسے ہی سیدہ امیلی دروازے پہنچی، ایک اور گاڑی اسپتال کی طرف تیزی سے آئی اور دروازہ پر آکر ٹھیری اور اس میں سے ایک عورت اتری، اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر اس طرح دم بخود تھا جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ مگر وہ خود بڑھ کر اسکے پاس آئی۔ اور وقار کے ساتھ اسے سلام کیا۔ جس میں ندامت بھی شامل تھی۔ اور ضمیر کی گریہ زاری بھی، ڈاکٹر نے سرد مہری سے سلام کا جواب دیا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ عورت نے اسکو مخاطب کرکے کہا۔

میرے بچے! کیا تم ہم سے خفا ہو؟

ڈاکٹر کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ سیدہ امیلی نے چلاکر کہا:

اخواہ آپ ہیں حنہ!

ہاں اے میری محترمہ میں ہوں۔

تم آخر اتنی مدت تک کہاں رہیں: میں اب تک برابر تمہیں تلاش کرتی رہی مگر کہیں پتہ ہی نہیں چلا۔

میں مصر میں تھی۔

یہ تو بتاؤ کہ اس لڑکی کا تم نے کیا کیا، آخر وہ ہے کہاں؟

وہ یہیں بیمار ہے اور میں اسی کی عیادت کے لئے یہاں آئی ہوں۔

طبیب اسوقت تک خاموش تھا۔ اور ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اسے کچھ روشنی امید کی جھلک نظر آئی، وہ منہ کھولے ہوئے حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ ... نے اس ... کہا

آؤ آؤ اپنی بہن کو دیکھ لو۔ یہ سب کے سب مریضہ کے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں سیدہ اوما اس کے پلنگ کے پاس نہایت اداس اور متفکر بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ بار بار ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ غم واندوہ کے آثار اس کے بشرے سے نمایاں تھے۔ جیسے ہی اس نے ڈاکٹر کو دیکھا جھٹ بولی

ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے جلدی کیجئے، یہ بچی سخت بیمار ہے۔

طبیب مریضہ کے پلنگ کے پاس آکر جھکا، زور زور سے سانسیں لینے اور رونے کو ضبط کرتے ہوئے۔

بڑی محبت اور پیار سے بھرے ہوئے لفظوں میں پکارنے لگا۔ اسکی سانس کی گرمی نے مریضہ میں ایک نئی زندگی پیدا کردی، اس نے کچھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ پھر طبیب کو اسوقت، اس حالت میں دیکھ کر مسکرائی اور پھر شدت بخار کے اثر سے آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکٹر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومنے اور سلمیٰ کو بہن بہن کہہ کر پکارنے لگا۔ وہ ضعف سے منمنائی۔ آہ غریب ہے۔ ظالم (اسما) نے اس کے ساتھ بڑی بیوفائی کی، پھر اس پر بخار کا غلبہ ہوا، اور وہ کچھ نہ بول سکی۔

ذرا دیر بعد لڑکی نے پھر وہی الفاظ دہرائے ظالم نے ان کے ساتھ بڑی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی۔

"ہاں لیکن امید ہے کہ جلد اس کا قصور معاف کر دینگے" حنہ نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔

ان لفظوں کو سنکر ڈاکٹر ذرا چونکتا ہوا، اور مطلب سمجھ کر اسکی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر کچھ جواب نہ دیا۔ پھر وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بولی۔

سینئے ڈاکٹر صاحب۔ ہم پر تو یہ مصیبت پڑی کہ ہمارا تمام مال و دولت برباد ہوگیا، اور اب اسماء ایک جھنجی کوڑی کی بھی مالک نہیں۔ اس لئے آپ اسکے نہ ملنے پر ہرگز کوئی رنج و افسوس نہ کیجئے۔

معزز خاتون! کیا تم سمجھتی ہو کہ اس قسم کے ناگوار حادثے کا میرے جذبات پر کچھ کم اثر پڑا ہوگا۔ میں تو تمہاری بیٹی کو اسکے مال و دولت کی وجہ سے نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ محض اسکی ذات کے لئے، میرے نزدیک تو غریبی امیری سب یکساں ہے، دولت میرے لئے محبت کا سبب نہ تھی۔

مانا کہ آپ اپنے لئے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوں، مگر جس سے آپ محبت کرتے تھے اسکی خوشحالی اور کامرانی کا بھی کیا آپ کو خیال نہ ہوگا۔

تو کیا اب اسے وہ کامرانی اور خوشحالی حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی طرف آپ کا اسوقت اشارہ ہے۔

ہم لوگ پہلے تو یہی سمجھتے تھے، اس لئے کہ جب ہم نے لطیف کے ساتھ اسکی شادی کی ہے تو ہمیں کامل یقین تھا کہ لطیف بڑا دولت مند ہوگا۔ اس لئے کہ اس کا باپ یوسف فضل اللہ بڑا امیر آدمی تھا اور بہت دولت چھوڑ کر مرا تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ہم نے دیکھ لیا کہ ہم نے اپنی آرزوں کا بیج ایک بنجر زمین میں غلطی سے بو دیا ہے، اسکے پاس روپیہ پیسہ کچھ نہیں ہے۔

سیدہ ایملی یہ نام سنکر چلا پڑی۔

ارے وہ تو تمہارا جانی دشمن ہے یوسف فضل اللہ وہی شخص تو تھا۔ جس نے تمہارے باپ کے ساتھ بے ایمانی کی اور ان کی تمام دولت چرا لے گیا، وہی تو تم دونوں بھائی بہن کی تباہی و بربادی اور تمہاری باہمی جدائی کا سبب ہے۔ وہ سارا مال و دولت جس سے اب تک وہ مزے اڑاتا رہا۔ تمہیں دونوں کا ہے۔ اور میرے پاس اسکے بہت سے ثبوت ہیں۔ جو میں نے تمہاری والدہ مرحومہ سے اسوقت بہم پہنچائے ہیں جبکہ وہ بیچاری مصیبت کی ماری موت کے بستر پر نہایت بیکسی کی حالت میں دم توڑ رہی تھی، ان ثبوتوں کے ساتھ تم عدالت میں مطالبہ کر کے اپنا پورا حق حاصل کر سکتے ہو۔

مگر اب تو اے شریف خاتون وہ ایک درہم کا بھی مالک نہیں رہا۔ کل ہی بہت سے قرضخواہ اس کے گھر پر قرقی لے کر آئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کی تمام دولت جوئے میں اڑا ڈالی۔ حنہ نے کہا۔

اے بیوہ! اللہ نے تم دونوں کا دونوں سے بدلہ لے لیا۔ تمہاری منگیتر نے تمہارے ساتھ جو بد عہدی اور بیوفائی کی، وہ اپنے کئے کی سزا کو پہنچی۔ یوں کہ اسکی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو خود جواری، ذلیل اور چور ڈاکو عیار کا بیٹا ہے، اس کے علاوہ بالکل مفلس قلاش کا بیٹا ہے، نیز وہ تمہارے دشمن کا بیٹا ہے۔ اس نے اس امید پر شادی کی تھی کہ وہ اسے اپنی دولت کی بدولت رسوائی اور ذلت سے بچا سکیگی مگر اب پتہ چلا کہ اس نے بھی ایک بے وفا خائنہ سے شادی کی ہے جس نے اپنے منگیتر سے بیوفائی کی، غرض اس طرح اس بے وفا عورت نے اس خائن جواری کو اس جال میں پھانسا جو اس مکار نے اس مکارہ کے لئے بچھا رکھا تھا۔ مکاروں، دغا بازوں کی یہی سزا ہے۔ آدمی کو دنیا ہی میں اچھے برے کا بدلہ مل جاتا ہے۔

اس کے بعد لڑکی کی مربیہ حنہ رخصت ہوئی۔ وہ

ندامت اور غم کے آنسو اپنی آنکھوں سے پونچھتی جاتی تھی۔ اور اب ڈاکٹر اطمینان سے اپنی بہن کے علاج کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنی پوری طبی مہارت اور کمال قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اسے عطا کیا تھا۔ سلمیٰ کی حالت بہت جلد سنبھل گئی۔ دھیرے دھیرے صحت ہونے لگی۔ اس کی صحت یابی میں سب سے زیادہ چین و مسرت اور خوشی ہوئی جو سلمیٰ کو اپنے بھائی کے پانے سے ہوئی تھی۔ اس نے ساری بیماری رفوچکر کر دی۔ بھائی بھی کیسا جو ہر قابل۔ نیز ان تمام واقعات کے ظاہر ہونے سے مجھی بے حد خوشی ہوئی کہ لطیف کا کمینہ پن، اور سلمیٰ کے ساتھ اسکی بے وفائی کا سبب کھل گیا۔ اور اس مسرت نے لطیف کی محبت کے جراثیم سلمیٰ کے دل سے بالکل ملیامیٹ کر دیئے، اس کا کھویا ہوا حسن، شباب کی تازگی اور رعنائی پھر بہت جلد عود کر آئی جب وہ بالکل تندرست ہو گئی تو اس کا مہربان بھائی اسے اسپتال سے لے آیا۔ اور ایک مکان کرایہ کا لے کر اس کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ اسوقت دونوں کے مل جانے کی خوشی کا اندازہ کرنا بھی محال ہے

(ترجمہ از عربی)

غزل

اثر جناب رشید متھرائی !

آنکھوں کا کیا قصور جو کوسوں نظر کو میں — "اے کاش جانتا نہ تیری رہگذر کو میں"
آہ رسا سے پھونک دوں دشمن کے گھر کو میں — لیکن کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں اثر کو میں
تا ہو نہ دل سے محو کہیں لذت ستم — پھر یاد کر رہا ہوں کسی فتنہ گر کو میں
انجام عشق سے ہے ہر اک آنکھ بے خبر — بے نور دیکھتا ہوں ہر اک دیدہ ور کو میں
جلوہ دکھا کے تو تو نہ جانے کہاں چھپا — اب جانتا ہوں نور ترا ہر ایک در کو میں
پہنچے نہ پہنچے۔ لائے نہ لائے جواب خط — کرتا تو ہوں سپرد خدا نامہ بر کو میں
کس کا جمال میری نگاہوں میں بس گیا — اب دل میں دیکھتا ہوں ضیائے قمر کو میں
حال غم فراق چھپائے نہ چھپ سکا — جی چاہتا ہے پھوڑ دوں اس چشم تر کو میں

متھرائی راہ عشق کی دشواریاں نہ پوچھ
منزل سمجھ رہا ہوں ہر اک رہگذر کو میں

گورکن!

از مسافر!

آج میں نے ایک گل اندام کو خاک میں چھپا دیا، سچ کہوں، میرا دل بھر آیا۔ میرا یہی کام ہے کہ قبر کھودوں انسان کو دباؤں اور اس کی ساری داستان مٹا دوں۔ اچھا بُرا سب چھپا دوں۔

میرا دل پتھر کی طرح سخت ہے پھر بھی ایک آنسو نکل ہی آیا۔ سیکڑوں مُردے دیکھے، ہزاروں دفن کئے، میرے بال سفید مگر دل سیاہ ہوتا جاتا ہے اب تو یہ کیفیت ہے کہ اگر میرا بیٹا مر جائے اور میں اپنے ہاتھ سے قبر کھود کر گاڑ دوں تو بھی ابرو میلے نہ ہوں، چتون پر بل نہ آئے۔

مگر — اُف۔ آج جس کی لاش میں نے قبر میں اتاری ہے وہ لڑکی تھی یا چودھویں کا چاند۔ چودہ سے زیادہ کی نہ رہی ہوگی۔ کیا آئی کیا گئی۔ نہ جوانی کی لذت اُٹھائی نہ جمال کا مزہ پایا۔ جانے کیوں صانع نے یہ تصویر بنائی اور مٹا دی — حیران ہوں آئینہ ہوں کہ دیکھوں دیکھوں

(۲)

آج میں نے ایک اور کو پیوند خاک کیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ناپاک تھا، ابھی میں نے اپنے ہاتھ اور دامن کی خاک بھی نہ جھاڑی تھی کہ جنازہ لانے والوں میں سے ایک نے کہا، خدا بخشے کام کیا، روپیہ لیا، نہ خود کھایا، نہ دوسروں کو کھلایا، ہاتھ پھیلائے آیا مٹھی باندھے چلا گیا۔ ساری دولت سود سے جمع ہوئی تھی، کنجوس ایسا تھا کہ چمڑی جائے دمڑی نہ دے — پر عمل کرتا تھا۔ میں کیا جانوں کون تھا، کیا تھا، مگر ایسی نفرت ہوئی کہ میں نے بغل میں سلاتے وقت دست شفقت کی جگہ پائے نفرت سے کام لیا۔ اور کہہ دیا، "او، وہاں جا جہاں سے پھر کر نہ آئیگا۔ آہ نے بڑی قیامتیں ڈھالی، ہونگی، بے۔ یہی ایک مٹھی خاک تیرا حصہ تھا۔

(۳)

آج دو تلی ایک جنازہ لائے اور کہنے لگے کہ ہمارے کاندھے کا سوار ڈاکو تھا آدم کش تھا، ہم لائے ہیں تم دفن کرو۔

میرے آدم کش کو جو اس وقت معدوم اور جامد تھا تابوت سے اٹھایا دبانے سے پہلے جی چاہا کہ ذرا دیکھ تو لوں کس رنگ کا جانور ہے۔ کیا شکل ہے کیا قد ہے کس قسم کا درندہ ہے۔ بند کفن کھول دئے۔ صورت دیکھی، آدمیوں اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ مجھے خیال تھا ڈنک ہوگی، زہر یلے دانت اینکے ناخن ہونگے۔ مگر ان میں کوئی بات نہ تھی۔ میں نے کہا کہ اگر یہی آدم کش تھا تو سب آدم کش ہیں

قتل کیسا؟ قاتل کون؟ مجرم کے کیا معنی! ہم سب اپنی خلقت اپنی طبیعت کے زیر اثر ہیں نہ ہم آزاد ہیں نہ مختار۔ قابو ہوتا تو معصوم اور فرشتہ ہوتے۔ ہمارے افعال دماغ کے تابع ہمارے اعمال مزاج کے ماتحت پھر گناہ کیسا، قصور کیا چیز ہے!

(۴)

آج میں نے ایک شیر خوار کو دفن کیا۔ پاک آیا پاک گیا۔ معصوم رہا۔ آلودہ نہ ہوا۔ جیتا تو بڑھتا اور پھنستا جاتا۔ مگر تو ایسا ہی کیوں ہوا۔ موت کے پنجے میں پہلوان اور ناتوان، دونوں برابر ہیں۔

خاک ہی اول ہے خاک ہی آخر ہے مگر کبھی کبھی یہی خاک، ایک ایسا تیلا بنا ہے جسکی حیات ایک عالم کی حیات سے بھاری ہوتی ہے۔

میرے سے دفن کیا ہر دو، رے مجھ کو گاڑیں گے لوگ جاتے ہیں آتے ہیں، دیکھنے والے

(۔ ۔ فرازق ہی)

اے جاؤ جی

ایم اسلم کی شہرۂ آفاق تصنیف مرزا جی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ہمارے ناظرین یہ سُنکر خوش ہونگے کہ عنقریب مرزا جی کا دوسرا حصہ شائع کیا جائیگا۔ "اے جاؤ جی" اسی دوسرے حصے کا ایک لطیف مضمون ہے۔ جو انشاء اللہ ہر کہ و مہ کے لئے دلچسپ ثابت ہوگا (ادارہ)

واقع عرض ہے۔

ایک روز میں اور میرے ایک دوست بیٹھے تھے۔ اتفاق سے کچھ مرزا صاحب کا ہی ذکر اذکار ہو رہا تھا۔ کہ اتنے میں آپ بھی کہیں سے مسکراتے ہوئے، آ نمودار ہوئے۔ آپ کو دیکھ کر میرا دوست بولا۔

"لو! وہ آ گئے"

اور آپ نے حجازی لہجہ میں سلام علیکم کہہ کر پوچھا "کیا باتیں ہو رہی تھیں اسوقت۔ میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا"

"بھلا ہمارا ذکر ہو اور ہم نہ پہنچیں"؛ آپنے مسکرا کر کہا "نام کی کشش ہی تو کھینچ لاتی ہے ہمیں"

"جی ہاں!" میں نے سر ہلا کر کہا۔ انگریزی میں بھی کچھ اسی قسم کا ایک مقولہ ہے"

"کیا ہے؟" آپ نے پوچھا۔ ہمیں بھی تو بتلایئے"

"بتلا تو دوں" میں نے کہا۔ لیکن ڈر ہے کہ آپ برا نہ مانیں!"

"اجی نہیں!" آپ بولے۔ بھلا ہم کیوں برا ماننے لگے۔ سُنا نہیں آپ نے۔ علم شے بہ از جہل شے"

"تو پھر بتلا ہی دوں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ برا تو نہ مانئے گا"

"ارے یار! آپ نے سر ہلا کر کہا "تم تو نکاح کی سی شرطیں منواتے ہو۔ "حرف علم کے بتلانے میں اتنا بخل! توبہ ہے!"

"سنئے!" میں نے کہا۔ حضرت! جب کسی شخص کا ذکر ہو رہا ہو اور اوپر سے وہ بھی آ جائے تو انگریزی میں ایسے موقع پر... "سپیک آف دی ڈیول۔ اینڈ ہی از پریزنٹ"[1] Speak of the devil & he is present کہا جاتا ہے۔ یعنے شیطان کا ذکر کرو تو وہ جھٹ آ موجود ہوتا ہے"

یہ سُنکر آپ میری طرف ذرا غور سے دیکھنے لگے اور پھر گردن آگے بڑھا کر پوچھا۔

"تو یوں جی! ہم پھر شیطان ہوئے نا؟ بڑے واہیات ہو تم! بزرگوں کی پگڑی اچھالنا تمہیں خوب آتا ہے"

---

[1] اصل محاورہ یہ ہے۔ Think of the devil & he is there.

پاس سے میرا دوست بولا۔

"بجا ارشاد ہوا۔ لیکن یہ آپ کی ہی صحبت کا تو اثر ہے"

"چپ رہو جی تم!" آپ نے ذرا غصے سے کہا: "تم کون دخل در معقولات دینے والے۔ ہوں۔ ذرا آئینہ اُٹھا کر اپنی شکل تو دیکھو۔ جانے کس احمق نے تمہیں مرد بنایا ہے۔ تم تو عورت بننے پر مٹے ہوئے ہو۔ یہ مونچھیں منڈوا کر کچھ پورے "زنانے" نہیں بنے تم۔ اب آنکھوں میں کاجل بھی لگے۔ ہونٹوں پہ مسّی بھی جمے۔ اور ذرا ناک پر (بتا کر) یوں انگلی رکھ کر بات بھی کرو تو بات بھی ہے۔ تُف ہے تمہاری حمیت اور غیرت پر۔ لو جی! (میری طرف دیکھ کر) یہ بھی مسلمان کہلاتے ہیں۔ کھاؤ تو قسم ہمارے سر کی کبھی نماز بھی پڑھی تم نے!"

پھر میری طرف دیکھ کر

"کیوں میاں! کچھ غلط تو نہیں کہا ہم نے؟"

"اجی توبہ کیجئے مرزا صاحب!" میں نے کہا۔

"توبہ کون کرے؟" آپ ذرا آنکھیں نکال کر بولے "کیا میں؟ سوچ کر بات مُنہ سے نکالا کرو۔ آخر انسان ہو تم بھی اور پھر مُسلمان بھی ہو"۔

"کیوں جی!" میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "ٹھیک ہے نا انسان ہو تم بھی۔ مُسلمان نہ سہی۔ لو کان پکڑو آج سے۔ پھر کبھی دخل در معقولات مت دینا اور خبردار جو کل سے مونچھیں منڈوائیں تم نے"

"اجی منڈوانے دو! مرزا کہنے لگے: "زنانے" بھی تو آخر اللہ کی ہی مخلوق ہیں نا۔"

یہ کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں مرزا صاحب! آج آپ مُسکرا کیوں رہے تھے"

"کب؟"

"ابھی ابھی جب آپ تشریف لائے"

"مسکرا رہا تھا میں؟" یہ کہہ کر آپ کچھ چپ ہو گئے اور پاس سے میرا دوست بولا۔

"اجی آپ کے نصیب میں مُسکرانا کہاں۔ جو دن بھر روتا۔۔۔۔۔"

"پھر لگے بولنے تم" مرزا نے بات کاٹ کر کہا: "خدا کی قسم گز بھر کی زبان ہے تمہارے منہ میں"

اور میری طرف دیکھ کر۔

"ہاں یاد آگیا۔ کچھ مُسکرا ہی رہے تھے!"

"تو پھر مُسکرانے کی کچھ وجہ بھی؟"

"بس ایسے ہی ذرا خانگی معاملہ تھا۔"

"تو کیا ہمیں نہ بتلائیے گا"

"مرے یار!" آپ نے ہنس کر کہا۔ "کیا لوگے پوچھ کر تم۔ خیر! بتائے دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ چند روز سے گھر والی کی ہم پر کچھ نظرِ عنایت معلوم ہوتی ہے"

"کیسے جانا آپ نے؟"

"میاں!" آپ نے کہا "کسی نے خدا کو دیکھا تو ہے نہیں صرف عقل سے ہی پہچانا ہے۔ کئی ایک روز سے وہ باتوں باتوں میں ذرا پیار سے کہہ دیا کرتی ہیں "اے جاؤ بھی! کیوں؟ کیسا محبت کا "بول" ہے"۔

"کیا؟" میں نے بناوٹی تعجب سے پوچھا۔

"یہی! اے جاؤ بھی"

میں نے یہ سُنکر سر جھکا لیا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے تم"

"تو اور کیا کروں؟"

"تم کیا جانو!" آپ نے پھر ذرا سر ہلا کر کہا۔ "جو رو کی محبت کس جانور کا نام ہے"

- میں نے کہا۔

"حضرت! معاف فرمائیے۔ کبھی آپ نے غور بھی کیا؟"

"غور! کس پر؟"

"اسی 'لے جاؤ بھی' پر۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں"

"میرے یار!" آپ ذرا خوشامد کے طور پر بولے "یہ ہر وقت کا مذاق بھی اچھا نہیں"

"کافر ہو جو سیدھی بات کو بھی مذاق سمجھے تو" میں نے سنجیدہ صورت بنا کر جواب دیا۔

"تو اس میں پھر کیا قباحت ہے" آپ نے پوچھا۔

"کس میں؟" میں نے ذرا 'کس' پر زور دے کر کہا۔

"اسی 'لے جاؤ بھی' کہنے میں ان کے"

"تو کیا آپ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ہیں عقل و دانش ....."

"فارسی کی ٹانگ کیوں توڑنے لگے" آپ نے بات کاٹ کر کہا۔ "مطلب کی بات کرو"

"مرزا صاحب!" میں نے کہا۔ آپ نے بیگم صاحبہ سے تو کبھی پوچھا ہوتا کہ اے نیک بخت! تمہارا ہمیں ہر روز 'لے جاؤ بھی' کہنے سے کیا مطلب ہے"

"بھیا!" آپ بولے "ان کی بات رہنے دو۔ ان سے جو سیدھی بھی کروں تو ٹیڑھیاں ہی سناتی ہیں۔

"نہیں صاحب! انہیں سے پوچھئے گا۔ ہم کسی کے خانگی معاملات میں کیوں ٹانگ دیں"

میرے یار! کیوں تنگ کرتے ہو ناحق مسکینوں کو تنگ کرنا اچھا نہیں"

"خیر!" میں نے کہا۔ آپ کی خاطر سے بتلائے دیتا ہوں لیکن آپ ناراض نہ ہوں تو"

"کافر ہو جو ناراض ہو تم سے" آپ بولے "خوب! تم ہمارے بھلے کی کہو اور ہم تم سے ناراض ہوں"

"سنئے! جسے آپ محبت کا بول سمجھتے ہیں حقیقت میں تو وہ آپ کے حق میں بددعا ہے"

"بددعا!" آپ نے تعجب سے پوچھا "کیا؟"

"یہی کہ 'لے جاؤ بھی'"

"تو اسکا مطلب!"

"یہی! کہ جہنم میں جاؤ۔ اور کیا؟"

"بکتے ہو تم!" آپ جھنا کر کہنے لگے۔ پاس سے میرے دوست نے جو ایک قہقہہ لگایا تو آپ کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ گرج کر بولے۔ "بڑے واہیات ہو تم دونوں۔ لو جی! پہلے آتے ہی ہمیں شیطان بنا دیا اور اب لگے جہنم میں بھی بھیجنے۔ جہنم میں تو تم ایسے کریانی" جائینگے"

"کریانی" سنکر مجھے ہنسی آگئی میں نے پوچھا۔

"اے حضرت! یہ کریانی کس بلا کا نام ہے"

"تم دونوں کا!" آپ نے غصے سے جواب دیا "تم کریانی نہیں تو اور کیا ہو۔ گلے میں پھانسی کی رسی کی طرح جو یہ رنگ رنگ کے چیتھڑے باندھے پھرتے ہو۔ حشر کے روز انہیں سے تمکو پھانسی دی جائیگی"۔

"آخر کس خطا پر؟" میں نے پوچھا۔

"بزرگوں کی تحقیر کرنے کے جرم میں۔ ہماری ہنسی اڑانے کے جرم میں ہمارا مذاق اڑانے کے جرم میں"

"اور یہ بھی تو کہئے" میں نے کہا "کہ سچی بات کہنے کے جرم میں"

"کیا کہا؟" آپ نے آگے کو جھک کر پوچھا "سچی بات! ہوں۔ پڑھو انگریزی اور بولو سچ"

یہ کہتے ہوئے آپ اٹھے۔ میں نے کہا۔

"اے حضرت! ذرا بیٹھئے تو سہی۔ کیا آئے اور کیا چلے گئے"

"نہیں!" آپ نے دروازہ کا رخ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بس کافر ہو جو ادھر کا اب رخ بھی کرے" (ابراہیم اسلم)



حسن فطرت کے تماشا سے ہوا حیران وہ شوخ - آئینہ دیکھا تو خود آئینہ بن کر رہ گیا

کلامِ ریاض

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی

نشتر چبھونے آئے ہیں دل میں کہاں سے آپ
چھیڑیں ذرا نہ کیجیے مجھ بدگماں سے آپ

کیا آج خوابِ ناز میں تھے بامِ غیر پر
اُترے ہیں فتنہ لے کے کوئی آسماں سے آج

جب یہ سمجھ لئے کہ نہیں اس میں جان کچھ
سر کو مرے اُٹھاتے ہیں اب آستاں سے آپ

بوئے دہانِ غیر چھپے گی شراب سے
بس بس نکالئے نہ کچھ اپنی زباں سے آپ

یہ حال ہے ریاض کا روتے ہیں آج غیر
پھر بھی تو پھر رہے ہیں مگر شادماں سے آپ

قربانی

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی مدیر "اکبر"

داروغہ عباس علی اپنے بنگلہ کے برآمدہ میں ایک پرانی آرام کرسی پر لیٹے تھے بغل میں ایک اسٹول پر حقہ رکھا ہوا تھا اور اسکی نَے ان کے ہاتھ میں تھی۔ چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی گہری فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں یکبارگی حقہ گڑگڑا اٹھا لیکن چلم خاموش رہی۔ اس سے دھواں نہ نکلا۔ "اُفوہ! ذراسی بات کو سوچتے سوچتے اتنی دیر ہوگئی۔ حقہ تک ٹھنڈا ہوگیا" کہتے ہوئے داروغہ جی نے اپنی چاروں طرف نظر دوڑائی "بڑا پاجی نوکر ہے کم بخت گھڑی بھر یہاں نہیں بیٹھ سکتا" بڑبڑاتے ہوئے داروغہ جی نے زور سے پکارا —— "چھوٹا! ابے او چھوٹا کم بخت کہاں مرگیا؟"

"جی حضور" کہتا ہوا۔ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی میلے کچیلے کپڑے پہنے داروغہ جی کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"بیوقوف! تجھے اب میرے کام کی کچھ فکر ہی نہیں رہتی ہے جا چلم میں آگ بھر لا"

چھوٹا چلم لیکر جانے لگا تو داروغہ جی نے دوسرا حکم دیا —— "ابے او سن! چلم بھر کر رحمت کو فوراً بلا"

چھوٹا چلم بھر کر رحمت کو بلانے چلا گیا۔ اور داروغہ جی حقہ گڑگڑانے لگے۔

پانچ منٹ کے بعد رحمت آتا دکھائی دیا داروغہ جی کرسی پر اکڑ گئے۔ رحمت نے داروغہ جی کو قاعدہ سے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہوگیا —— بت کی طرح —— رنگ آبنوس کو مات کرنیوالا۔ کپڑے صاف ستھرے۔

داروغہ جی نے فرمایا —— "رحمت کل بقرعید ہے؟"

"جی حضور"

"تم نے قربانی کے لئے تو کچھ انتظام کر لیا ہوگا"

رحمت ایک دم انجان، بھولا بھالا اور سیدھا سادا تھا۔ تیس روپیہ تھوڑی تنخواہ پانے والا، غریب سپاہی بھلا قربانی کا کیا انتظام کر دیگا "حضور!"

داروغہ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی بولے۔

"تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا رحمت! میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے میرے لئے کیا انتظام کیا ہے؟"

"خطا معاف ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ حضور قربانی کرینگے۔ ورنہ یہ کون بڑی بات تھی ایک نہیں پچاس قربانیوں کا فوراً انتظام کر دیتا۔ آج ہی تو دیہات سے لوٹا ہوں۔ اگر

حضور ذرا سا اشارہ کر دیتے تو عمدہ عمدہ گائیں اور موٹے تازے بچھڑے خرید لاتا۔ کس کی مجال ہے جو حضور کے نام پر اس کارِ ثواب کے لئے رحمت بیگ سے نہیں" کہنے کی جرأت کرے" اتنا کہہ کر رحمت تنکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دعویٰ بھی جھوٹا نہ تھا۔ اول تو وہ پولیس کا کانسٹیبل دوم داروغہ جی کا اردلی تمام علاقہ میں اس کا رعب تھا۔ پھر بھی شاید داروغہ جی کو رحمت کا جواب کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ انہوں نے کہا۔

"کیسے اردلی ہو بھائی! گویا جب تک میں نہ کہوں تم میری ضروریات کا خیال ہی نہ کرو گے واہ! واہ! مجھے تو سر تک کی فرصت نہ تھی۔ تحقیقات پر تحقیقات۔ قتل۔ ڈاکہ نقب زنی کی تحقیقات کرتے کرتے میرا ناک میں دم آ گیا۔ ایسی حالت میں بھلا میں کون کونسی باتیں یاد رکھتا۔ لیکن تم میرے اردلی ہو تم کو تو ضرور خیال رکھنا چاہئے تھا گائیں گئیں بھاڑ میں کوئی اچھا سا بکرا ہی تلاش کر رکھتے اب یہاں دیہات سے زیادہ پیسے خرچ ہونگے پھر بھی عمدہ مال نہ ملے گا"

"اب تو غلطی ہو گئی حضور!" کہہ کر رحمت نے اس طرح سر لٹکایا۔ اس طرح منہ بنایا گویا اس نے سچ مچ کوئی بڑی غلطی کر ڈالی ہے اور اسکو اس پر دلی صدمہ ہو رہا ہے کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا: "اب بھی کام بن سکتا ہے۔ میری نظر میں ایک اچھا بکرا ہے آپ اسکو دیکھیں گے تو پھڑک جائینگے میرے خیال میں بہت سستا بھی مل جائیگا"

خوشی کے مارے داروغہ جی کی آنکھیں چمک اٹھیں اٹھ کر بیٹھ گئے بولے "کہاں ہے وہ بکرا۔ کتنے میں مل جائیگا"

"وہ جو آپ کے چھوٹے منشی جی ہیں نہ بس انہیں کے پاس وہ بکرا ہے بازار میں پندرہ بیس سے کم میں نہ ملے گا لیکن آپ جو دیں گے وہ انہیں منظور کرنا پڑیگا گھر کا معاملہ جو ٹھیرا"

داروغہ جی نے کہا۔ "تو بس ٹھیک ہے تم ذرا جا کر منشی جی کو فوراً بلا لاؤ۔"

داروغہ جی کا حکم پاتے ہی رحمت تھانہ میں پہنچا منشی آرزو ڈیکس پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کا قلم روزنامچہ پر دوڑ رہا تھا۔ رحمت نے حکم سنایا "منشی جی فوراً چلئے آپ کو داروغہ جی یاد فرما رہے ہیں"

داروغہ جی کے اردلی کی آواز سنکر منشی جی چونک اٹھے۔ ایک نظر رحمت کے چہرے پر ڈالی۔ اور پوچھا "رحمت یہ تو بتاؤ سرکار نے مجھے کیوں فوراً بلایا ہے؟"

رحمت نے مسکرا کر کہا ——— "وہیں چلکر سن لینا"

منشی آرزو گھبرا گئے۔ گھبرانے کی بات ہی تھی داروغہ جی نے فوراً بلایا ہے اور وہ بھی اپنے بنگلہ پر انہوں نے کبھی اور اس طرح سے نہیں بلایا تھا۔ آخر آج کون ایسا سنگین معاملہ درپیش آیا جو مجھے بلایا ہے یہی سوچتے ہی منشی جی رحمت کے ساتھ چل دیئے۔ راہ میں انہوں نے پھر پوچھا "آخر بھائی بتاؤ تو سہی کیا معاملہ ہے"

ادھر ادھر نظر دوڑا کر رحمت نے جواب دیا "منشی جی کیا بتاؤں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ یہ سالا داروغہ نہیں ہے پاجی ہے بدمعاش ہے شیطان ہے۔ لوگوں کو پریشان کرتے ہی میں اسکو مزا آتا ہے اسکی ......"

منشی جی کی گھبراہٹ بڑھی اور بولے ——— "میں نے تو کوئی قصور نہیں کیا اپنے کام سے کام رکھتا ہوں ...."

"سنیئے تو" رحمت نے کہا۔ "آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ اسکی نظر آپ کے بکرے پر پڑ گئی ہے کل بقرعید ہے وہ سوچ رہا ہے کہ اگر یہ بکرا مل جائے تو ....؟

منشی جی کا چہرہ اتر گیا بھرائی ہوئی آواز سے بولے ——"اف! یہ تو بڑی مصیبت کا سامنا ہے رحمت تم تو میرے پڑوسی ہو تم کو خوب معلوم ہے کہ میرا بچہ . . . ."

بات کاٹ کر رحمت نے کہا "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں میں سب جانتا ہوں میں نے اس بدمعاش سے کئی بار کہا کہ آپ منشی جی پر رحم کیجئے گاؤں میں بکروں کی کمی نہیں ہے آپ کو اچھے سے اچھا بکرا لا دونگا مگر اس کم بخت نے میری بات نہ مانی زیادہ زور بھی نہیں دے سکتا جانتے ہو افسری ماتحتی کا معاملہ ہے" یہ باتیں رحمت نے اس لہجہ میں کہیں گویا اس کے دل میں ہمدردی کا دریا لہریں مار رہا ہو۔

منشی جی داروغہ جی کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے ان کا جی گھبرا رہا تھا سر گھوم رہا تھا گلا سوکھا جا رہا تھا اور انکی آنکھیں داروغہ جی کی طرف اس طرح سے دیکھ رہی تھیں گویا وہ داروغہ جی کے دل میں چھپی ہوئی شرافت اور رحم کو تلاش کر رہی ہوں۔ داروغہ جی نے پوچھا "منشی جی کیا تم اپنا بکرا بیچو گے؟"

منشی جی گھبرا کر بول اٹھے "حضور! رحم! رحم!"

داروغہ جی نے حیرت سے منشی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کے کیا معنی؟"

منشی جی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "حضور میں ایک مصیبت زدہ آدمی ہوں آٹھ بچے ہوئے اور سب مر گئے، اب خدا کے فضل سے صرف ایک بچہ زندہ ہے جو بوڑھے کی باقی زندگی کا سہارا ہے۔ میرے اس اکلوتے بچہ کا وہ بکرا پیارا کھلونہ ہے وہ اس بکرے کو بہت پیار کرتا ہے زیادہ کیا کہوں۔ اس نے اپنے منہ کا نوالہ کھلا کر اس بکرے کو پالا ہے۔ میری آپ سے یہی عرض ہے۔ کہ آپ میری اس بچہ پر رحم کریں اس کا کھلونہ نہ چھینیں ورنہ وہ رو رو کر اپنی جان دیدے گا" منشی جی کے آنکھوں سے آنسوؤں کی چند لڑیاں نکلیں جو اسکی کھچڑی ڈاڑھی کو چومتی ہوئیں پتھر کے فرش پر گر کر بکھر گئیں لیکن داروغہ جی "ہا ہا ہا" کر ہنس پڑے اور بولے "واہ منشی جی واہ! تم بھی خوب مسخرے ہو میں تم سے کوئی مفت تو لیتا نہیں پھر بھی تم اس کار ثواب کے لئے انکار کرتے ہو"

منشی جی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا "حضور! کار ثواب کے لئے تو میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں لیکن اپنے نادان بچے کا دل کیسے توڑوں وہ میرے گھر کا چراغ ہے۔ حضور بھی بال بچے والے ہیں۔ میرے غریب بچے کے صدمے کا خیال کر کے اس پر رحم کریں" لیکن داروغہ جی بھلا کب ماننے والے تھے وہ بگڑ گئے "تم آدمی ہو یا احمق! بچے تو مٹی کے کھلونے کے لئے بھی روتے ہیں لیکن جب وہ کھلونے انہیں کے ہاتھ سے ٹوٹ جاتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر رو کر اسکی یاد بھول جاتے ہیں۔ بچوں کا رونا دھونا ہی کیا۔ جب تمہارا احمد بکرے کیلئے روئے تو تھوڑی سی مٹھائی دیکر سمجھا دینا اس پر بھی نہ مانے تو دو چپت رسید کر دینا بکرے کا نام بھی نہ لے گا۔ سمجھے کہ نہیں۔ اب تم جاکر فوراً بکرا لاؤ میں تمہاری ایک بھی نہ سنونگا۔ رحمت تم بھی ان کیساتھ چلے جاؤ۔ انکو یا ان کے گھر میں کسی کو بکرا دینے میں کچھ عذر ہو تو تم خود اسے پکڑ لانا!"

راہ میں رحمت نے کہا۔ "دیکھا منشی جی آپنے سالا کتنا ظالم ہے رحم تو اس میں برائے نام بھی نہیں ہے آپ نے کتنی خوشامدیں کیں۔ اس کا دل نہ پسیجا۔"

منشی جی کا دل بھرا ہوا تھا صرف آہ بھر کر رہ گئے

(۲)

پولیس لائن کے سامنے والے کھلے میدان میں ہیرا بڑی آزادی سے ہری ہری دوب چر رہا تھا۔ منشی جی کو سامنے سے آتا دیکھ کر وہ ٹھمکتا ہوا۔ انکی طرف دوڑا اور منشی کے قدموں اور ہاتھوں سے سر رگڑ رگڑ کر وہ بےزبان بے دل کی پوشیدہ محبت کا اظہار کرنے لگا۔ اس کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اور منشی جی اسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے گھر میں چلے جاتے تھے۔ لیکن آج بکرے کی اس حرکت نے ان کے کلیجہ کو مسل ڈالا۔ آج انہوں نے بکرے کو پیار نہ کیا "آہ ہیرا! تو میرے یہاں کیوں پیدا ہوا تھا تجھ کو کیا معلوم کہ آج تیری زندگی کا آخری دن ہے۔ بیٹا! تو اپنی یہ محبت اپ اپنے ساتھ ہی لئے جا۔ اچھا رحمت! تم اسکو لے جاؤ لیکن دیکھنا میرے احمد کو یہ حال نہ معلوم ہونے پائے ۔"

منشی جی کا وہ اترا ہوا چہرہ۔ ڈبڈبائی آنکھیں۔ بھرا ہوا گلا سب۔ نے سنگدل رحمت کے دلکو بھی تڑپا دیا۔ اس نے بکرے کے کان پکڑے اور داروغہ جی کے بنگلے کی طرف چلا لیکن اب اسکی آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی۔ نہ چہرہ پر مسکراہٹ تھی اور نہ اب وہ چال میں تیزی۔ وہ اب ایسا جا رہا تھا۔ گویا کچھ سوچ رہا تھا۔

رحمت ابھی داروغہ جی کے بنگلے سے کچھ فاصلہ پر ہی تھا کہ اسے سامنے سے بغل میں چھوٹا سا بستہ دبائے ہوئے احمد آتا دکھائی دیا اسکو دیکھتے ہی بکرا یکبارگی "میں میں" چیخ اٹھا اور چھوٹنے کے لئے تڑپنے لگا بالکل اسی طرح جس طرح چھوٹا سا بچہ "ماں! ماں!" کہہ کر اپنی ماں کی طرف دوڑتا ہے۔ احمد نے دوڑ کر بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور رحمت سے کہا۔ "میرے ہیرا کو کہاں لئے جاتے ہو چھوڑ دو ۔ میں اسکول سے آگیا ہوں۔ اب اسکے ساتھ کھیلوں گا"

رحمت نے جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا ننھا سا "چچا! میرے ہیرا کو چھوڑ دو — چچا! میرے ہیرا کو چھوڑ دو" کہتا ہوا اسکے پیچھے پیچھے چلا۔ پہلے اسکی آواز میں نرمی تھی پھر سختی آئی اور آخیر میں خوشامد آگئی۔ لیکن رحمت چپ چاپ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔

داروغہ جی نے ہیرا کو دیکھا۔ بڑا تنومند، لمبے لمبے سینگ۔ بھری ہوئی گردن۔ خوب چمکتا ہوا گہرا کالا رنگ داروغہ جی کا دل خوش ہو گیا کہنے لگے "رحمت! واقعی بڑا لاجواب مال لائے ہو کوئی پرواہ نہیں اگر چار چھ روپئے خرچ ہو جائیں گے۔ اچھا اسے اصطبل میں لے جا کر باندھ دو"

رحمت نے داروغہ جی کے حکم کی تعمیل کی۔

"میرا ہیرا، میرا ہیرا" احمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور داروغہ جی کے سامنے جا کر کہنے لگا "چچا میرے ہیرا کو چھوڑ دو"

داروغہ جی نے جیب سے چار پیسے نکال کر احمد کے ہاتھ پر رکھے اور کہا — "یہ پیسے لیجاؤ مٹھائی کھانا۔ میں نے ہیرا کو تمہارے ابا سے خرید لیا ہے اب وہ تم کو واپس نہ ملے گا"

احمد نے پیسے پھینک دیئے وہ داروغہ جی کے پاؤں سے لپٹ گیا "نہیں داروغہ جی۔ میرے اچھے چچا جی! میں پیسے نہ لوں گا میرا ہیرا مجھے دیدو"

داروغہ جی کو غصہ آگیا۔ انہوں نے زور سے احمد کا کان مل دیا۔ ننھا بچہ تلملا اٹھا بھاگ کر برآمدہ سے باہر نکل آیا اب وہ کبھی اصطبل کے سامنے جا کر کھڑا ہوتا اور کبھی برآمدہ کے پاس ہچکی بھر کر چلاتا۔ "میرا ہیرا، میرا ہیرا" ادھر اصطبل میں

منہ بکرا بھی شاید بچہ کے حال زار پر تڑپ رہا تھا اور بار بار میں میں کہہ کر احمد کو پکارتا تھا۔

داروغہ جی اس کہرام سے پریشان ہو گئے انہوں نے گرج کر اپنے نوکر چھوٹے کو حکم دیا: "ابے او کے پیچھے جاکر اس منشی سے کہہ دے کہ اپنے باپ کو یہاں سے لیجائے ورنہ مارے ہنٹروں کے میں اسکی کھال اُدھیڑ دونگا"

بیچارے منشی گھبرائے ہوئے آئے انکو دیکھ کر احمد چلا اٹھا: "ابا میرا پیرا! ابا میرا پیرا" منشی جی نے دلکو سنبھال کر کہا۔ بیٹا گھر چلو پیرا کی امید ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو"

احمد مچل گیا اور پیرا پیرا کہہ کر وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ منشی جی نے بڑی مشکل سے اسکو گود میں اٹھایا اور گھر کا راستہ لیا۔ انکی آنکھوں سے آنسو گرتے جاتے تھے اور احمد برابر چلا رہا تھا: "میرا پیرا میرا پیرا"

گھر پہنچکر اس کا اور بھی برا حال ہوگیا۔ ماں باپ اسے سمجھاتے تھے پیار کرتے گود میں اٹھاتے تھے لیکن وہ ایک ہی صدا لگا رہا تھا "میرا پیرا میرا پیرا"

ماں احمد کو گود میں لے کر کہتی تھی: "میرے لال مت رو میں تم کو پیرا سے بھی اچھا بکرا منگا دونگی"

لیکن احمد کسی کی کچھ نہیں سنتا تھا وہ یہی کہے جاتا تھا — "میرا پیرا میرا پیرا دلا دو" وہ گھنٹوں روتا رہا نہ تو اس نے کچھ کھایا اور نہ پیا اسکی یہ حالت دیکھ کر ماں باپ بھی کچھ نہ کھا سکے۔ آخر کار احمد روتے روتے تھک کر سوگیا وہ شاید خواب میں بھی پیرا کو دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ کبھی کبھی پیرا، پیرا کہہ کر چونک اٹھتا تھا۔ ماں باپ رات بھر چپ چاپ آنسو بہاتے رہے۔

پچھلی رات کو احمد کا بدن کچھ گرم معلوم ہوا اور صبح ہوتے ہوتے خوب زوروں کا بخار چڑھ آیا۔ جب احمد کی آنکھ کھلی تو اس نے پوچھا۔ اماں میرا پیرا کہاں ہے؟ ماں بیچاری کیا جواب دیتی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ دیکھ کر احمد نے کہا —— اماں مت روؤ مجھے یاد آگئی، میرے پیرا کو اس داروغہ نے پکڑ لیا ہے اب میں اسکے لئے نہیں روؤں گا تم بھی نہ روؤ اماں! اتنا کہہ کر بچہ بیہوش گیا

منشی جی سے انکی بیوی نے کہا: "ذرا ایک مرتبہ پھر اس ظالم کے پاس چلے جاؤ۔ اور کہو کہ خدا کے لئے میری بچہ کی جان بچالیں"

منشی جی نے کہا —— احمد کی اماں! اس ظالم سے کچھ امید نہ رکھو پھر بھی تمہارے کہنے سے میں اسکے پاس جاؤنگا روؤنگا۔ گڑگڑاونگا شاید اسکو ہمارے حال پر رحم آجائے"

منشی جی داروغہ کے پاس گئے اور ان کے پیروں پر سر رکھ دیا اور رو کر کہا: "حضور میرے بچے کے حال پر رحم کیجئے میں جھوٹ نہیں کہتا آپ خود چل کر دیکھ سکتے ہیں آپ کی مہربانی سے میرا بچہ اب بھی بچ سکتا ہے"

لیکن پتھر پر جونک نہیں لگتی داروغہ جی کے دل پر منشی جی کی آہ وزاری کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور وہ مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ آئے۔

(۳)

بقرعید کا دن تھا تمام مسلمانوں کے گھروں میں خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ لیکن منشی کے گھر پر رنج وغم کے بادل چھائے ہوئے تھے نہ وہ نہائے نہ کپڑے بدلے اور نہ عیدگاہ ہی تک جاسکے گھر میں چپ چاپ بیٹھے رہے انکی بیوی کا حال اور بھی قابل رحم تھا۔ احمد کی حالت بگڑتی جارہی تھی یکایک اس نے آنکھیں کھولیں اور ماں سے پوچھا ——

اماں داروغہ جی نے میرے پیرا کو کیوں پکڑ لیا۔ اس نے ان کا تو کچھ نقصان نہیں کیا تھا" غریب ماں بچہ کو کس طرح سے سمجھاتی اسکی زبان سے نکل گیا۔ "بیٹا آج بقرعید ہے داروغہ جی تمہارے پیرا کی قربانی کرینگے"

"اچھا تو میرا پیرا مارا جائیگا۔ آہ تب تو بیچارے کو بڑی تکلیف ہوگی۔ اماں لوگوں کو ایسا کرنے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ لوگ قربانی کیوں کرتے ہیں" کہتے کہتے احمد کی آنکھیں بھر آئیں"

"بیٹا قربانی کرنے سے اللہ میاں خوش ہوتے ہیں"

اماں؛ جان مارنے سے اللہ میاں کیوں خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم مجھ کو مار ڈالو تب تو اللہ میاں اور بھی خوش ہونگے۔ کیوں اماں؛ ٹھیک ہے نہ؟"

ماں نے بیٹے کو کلیجہ سے لگا لیا وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی بیٹا ایسا نہ کہو تم تو میری آنکھوں کے تارے ہو، میں تم کو کیوں مارونگی"

بچہ خاموش ہوگیا۔ خدا جانے اسوقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت داروغہ جی کا نوکر چھوٹا آیا۔ اس نے تھال پر سے کپڑا اٹھا کر ایک ران نکالی اسکو دیکھ منشی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن قربانی کا تبرک سمجھ کر انہوں نے گوشت لے لیا اور یوں بھی داروغہ جی کا بھیجا ہوا تبرک وہ کیسے واپس کرنے کی جرات کر سکتے تھے وہ ران کو اندر لے گئے۔ ران پر احمد کی نظر پڑی بچہ سب کچھ سمجھ گیا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "آہ میرا پیرا ختم ہو گیا اب میں اسکو کہاں پاؤں گا۔ اماں میں نے اپنا پیرا کو کھو دیا۔ اب میں اسکو کہاں پاؤں" اتنا کہہ کر وہ چلا اٹھا "پیرا، میرا پیرا، میرا پیرا" اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑبڑانے لگا "پیرا، تو اتنی دیر سے کہاں تھا کب سے میں تجھ کو ڈھونڈ رہا ہوں لے میں بھی تیرے پاس آگیا اب ہم دونوں کو کوئی جدا نہ کر سکیگا"

ماں نے گھبرا کر احمد کے بدن پر ہاتھ رکھا پھر منشی جی کو بلا کر کہا "ذرا دیکھو تو سہی میرا لال کیسا ہوا جا رہا ہے" منشی جی نے دیکھا بہت زوروں کا بخار چڑھا ہوا تھا بولے کیا ڈاکٹر کو بلا لاؤں"

"جیسی تمہاری مرضی" کہہ کر احمد کی ماں خاموش ہوگئی۔

منشی جی دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے ڈاکٹر نے بچہ کی نبض دیکھی تھرمامیٹر لگایا اور حسرت بھری نظروں سے بچہ کو دیکھتے ہوئے منشی جی سے کہا "منشی جی اب تک کیا کرتے رہے بچہ کی یہ حالت ہوگئی اور تم نے مجھ کو خبر تک نہ کی۔ خیر چلو میں تم کو دوا دیتا ہوں لا کر فوراً پلا دو"

منشی جی ڈاکٹر کے یہاں سے جلدی دوا لے آئے لیکن ابھی وہ گھر سے باہر ہی تھے کہ ان کے کانوں میں رونے کی آواز آئی "میرا لال! میرا کلیجہ! تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ——— ہائے"

منشی جی کی آنکھوں میں سارا جہاں تاریک ہوگیا۔ وہ لپک کر گھر میں گھسے انہوں نے دیکھا کہ پرندا اڑ گیا صرف خالی پنجرا پڑا ہے اور بچہ کی ماں سر دھن رہی ہے انکے ہاتھ سے دوا کی شیشی گر پڑی اور ایک آہ کھینچ کر وہ بھی زمین پر گر پڑے۔

بنو نظمہ کرلوی

مرگِ حیات آفریں

از حضرت نوح ناروی

ساقیِ بزمِ دوستاں دیر کرے تو کیوں کرے
بدلے زمانہ کروٹیں اور سے رنگ اور ہو
جلوۂ رخ دکھائے بھی آئے بھی جلد آئے بھی
مست و خراب کر چکا کیفِ شرابِ زندگی
کوئی گھڑی ہی کو اگر غنچہ و گل کھلے تو کیا
حسنِ چمن کے واسطے باعثِ صد خلل خزاں
قابلِ اعتبار کب صورتِ غرب و شرق ہے
دن کو تمام ہو گئی مہر کی دوڑ دھوپ بھی
شیب میں سرگزشت کیا ولولۂ شباب کی
زیست کو جھیلنے پڑے رنج و الم ممات کے

لطف و نشاط پھر کہاں دیر کرے تو کیوں کرے
سیکڑوں دور ہو چکے اور اب ایک دور ہو
ساغرِ دُخم اٹھائے بھی خود بھی پیئے پلائے بھی
ٹوٹ گیا تڑاق سے جامِ شرابِ زندگی
چند نفس ہی کو بہم دو دل اگر ملے تو کیا
آج بحال کل نڈھال آج بہار کل خزاں
شام و سحر ہیں مختلف شام و سحر میں فرق ہے
رات ہی بھر کو تھا فقط ماہ کا رنگ روپ بھی
روز تغیرات کا شورشِ انقلاب کی
کتنے ورق الٹ گئے دفترِ کائنات کے

عشق و وفا کا اجرا محو ہو یہ محال ہے
لیلیِ شوخ و شنگ نے قہر و ستم کی ٹھان لی
کوہِ شکوہ بہ داں خاک کے ڈھیر ہو گئے
ذوق کا دلنشیں کلام آج بھی ہے زبان پر
حالیِ نیک ذات کو لوگ بھلائیں کس طرح
کیوں نہ کمالِ آغ کا دل کو لٹائے بار بار
گذرے ہوؤں کی جا بجا خاص نشانیاں تو ہیں
دشمنِ وصل جانِ تن گردشِ روزگار ہے
مرنے کو یوں تو ہر بشر وقت پر اپنے مر گیا
نازِ فنائے زندگی اہلِ خرد سے کہہ گئے

قصۂ ادا و حسن کا محو ہو یہ محال ہے
کثرتِ ظلم و جور نے قیسِ حزیں کی جان لی
پیش نہ ایک بھی چلی موت سے زیر ہو گئے
غالبِ نکتہ داں کا نام آج بھی ہے زبان پر
شبلیِ خوش صفات کو لوگ بھلائیں کس طرح
کیوں نہ ہنر امیر کا سامنے آئے بار بار
کہنے کو اور سننے کو اُن کی کہانیاں تو ہیں
ہستی نیستی طلب مٹنے کو بے قرار ہے
خلق کرے گی یاد اُسے کام جو نیک کر گیا
خسرو و جم کی داستاں رہ گئی وہ نہ رہ گئے

ہے یہی ذکرِ رفتگاں فکرِ ثبات آفریں
آفریں آفریں ہے مرگِ حیات آفریں

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

از جناب مولانا نصر اللہ خانصاحب عزیز بی اے رئیس التحریر اخبار مدینہ بجنور

تصویر کا ایک رُخ

ضمیر نے چوری کی، اور پولیس نے اسے گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔ عدالت نے اسکو دو برس کی سزا دی اور اُسے لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک مفلوک الحال مزدور کی زندگی تباہ ہو گئی۔ اس کے بال بچے پریشان ہو کر وطن سے بے وطن ہو گئے، اس کی بیوی جب بچوں کی پرورش کا سازوسامان مہیا نہ کر سکی تو اس نے آوارگی اختیار کی، عصمت بڑی پیاری شے ہے لیکن مامتا سب پر غالب ہے۔ جب ضمیر جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس نے دیکھا کہ اسکا گھر تباہ ہو چکا ہے، اس کی عزت برباد ہو چکی ہے اور دنیا میں وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ کوئی شخص ایک سزا یافتہ مجرم کو اپنے گھر میں ملازم نہیں رکھ سکتا۔ چور کا اعتبار کون کریگا۔ کیا معلوم وہ کس روز گھر کے برتن اٹھا کر بھاگ جائے۔ وہ اپنے گزشتہ جرم کی سزا بھگت چکا تھا۔ لیکن سوسائٹی اسے اب بھی مجرم سمجھ رہی تھی، یہ دیکھ کر ضمیر کا دل زندگی سے بیزار ہو گیا اور اس نے سزا دینے والے جج کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے وہ چور تھا، اب وہ ڈاکو ہو گیا۔ شہر کے بدمعاشوں کا جتھا تیار کر کے، جنگلوں میں روپوش ہو گیا۔ اور ایک روز اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے اس نے جج کی کوٹھی پر ڈاکہ ڈالا۔ سنتری بیدار ہو گئے اور گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ اور ضمیر ایک سنتری کی گولی سے ٹھنڈا ہو گیا۔ انتقام کی آگ کے شعلے بھی سرد ہو گئے۔

خدا بخش ایک مشہور جواری ہے۔ اس کی زندگی جوئے کی آمدنی پر بسر ہوتی ہے۔ جس زمانے میں اس کی تقدیر یاور ہوتی ہے، روپیہ اس پر گھنا گھن برستا ہے۔ اور وہ اپنے بچوں کے لئے نئے نئے کپڑے بنواتا ہے۔ بیوی کے کڑوں کی جوڑی بھی بدل کر نئی ہو جاتی ہے، بازار سے روزانہ مٹھائی آتی ہے تمام گھر شاہ جارج کے گھر سے بھی زیادہ خوش و خرم ہوتا ہے، لیکن جب قسمت پلٹا کھا جاتی اور وہ تمام نقدی ہار جاتا ہے تو بچوں کے بدن بھی ننگے ہو جاتے ہیں۔ بیوی کی کلائیاں بھی کنگنوں سے خالی ہو جاتی ہیں۔ جہاں پہلے مٹھائی کھلائی جاتی تھی اب بیوی بچے گالیاں اور مار کھاتے

ہیں۔ سارا محلہ اس شقی القلب اور بیوقوف آدمی سے نفرت کرتا ہے، لوگ کہتے ہیں بخشو جواری ہے، اس کے سائے سے بھی دور بھاگو۔ یہ بڑا موذی ہے۔ بچوں اور بیوی کو اس بیدردی سے مارتا ہے کہ ان کے بدن لہو لہان ہو جاتے ہیں خدا بخش کے پاس صرف جواری آتے ہیں، کوئی شریف آدمی اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ سوسائٹی جوئے کو قابل نفرت جرم سمجھتی ہے۔ مولوی صاحب نے اگلے روز جمعے کی نماز کے بعد وعظ میں صاف صاف فرمایا تھا کہ جوا حرام ہے۔ اسکی کمائی بھی حرام ہے، جواری کے ساتھ ملنا جلنا بھی منع ہے۔ پھر کون مسلمان ہے جو اپنی عاقبت خراب کرے۔

رلیارام ایک کائستھ ہے پہلے دفتر میں ملازم تھا۔ لیکن شراب کی عادت نے نوکری بھی چھڑوائی اور وطن بھی عزت سے بھی محروم کیا اور مال سے بھی۔ اب رلیارام کا کام یہ ہے کہ شراب کی دکان کے سامنے بیٹھا رہتا ہے۔ اور جب شرابی شراب پینے کے لئے آتے ہیں۔ تو ان سے دو دو گھونٹ مانگ کر اپنا پیالہ بھر لیتا ہے۔ اور دل کی پیاس بجھا لیتا ہے۔ شرابی اسے رند بدمست سمجھ کر دو چار پیسے بھی دیدیتے ہیں لیکن شہر کا کوئی مہذب اور شریف آدمی اس سے بات نہیں کرتا، اس کے منہ سے ایسی بدبو آتی ہے کہ پاس کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ شراب تمام مذہبوں میں حرام ہے، اسلام نے اسکو شیطانی فعل سے تعبیر کیا ہے، کوئی مسلمان شرابی کے قریب نہیں جا سکتا۔ ہندو مذہب میں اسے ناپاک اور ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کوئی ہندو شراب خوار سے بات نہیں کر سکتا۔ نہیں تو اسکی مکتی محال ہو جاتی ہے۔

دیکھو رلیارام کتنا برا آدمی ہے۔ اس نے اپنی عزت بھی گنوائی، مال بھی تباہ کیا۔ بیوی بچوں کو بھی ہلاک کیا۔ اور اب کتوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے، افسوس اس نے انسانیت کے شرف کو برباد کردیا۔ اس سے تو جانور بھی بہتر ہو گئے۔ آہ کتنا بیوقوف آدمی ہے، شیطان نے اسکی عقل سلب کردی ہے۔ خدا ہر شخص کو ایسے آدمیوں کی صحبت سے محفوظ رکھے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

منشی منظور علی ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں ہیڈ محرر ہیں۔ بڑے پابند صوم و صلوۃ ہیں۔ ٹخنوں سے پاجامہ ہمیشہ اونچا رکھتے ہیں۔ ان کے بستے میں ایک مسواک ایک تسبیح اور ایک مصلی ہمیشہ رہتا ہے۔ سفر ہو یا حضر نماز ترک کرنا تو درکنار قضا بھی نہیں ہونے دیتے۔ ریل گاڑی میں بھی چلتی گاڑی جماعت کا اہتمام رہتا ہے۔ داڑھی بھی استرے کی دستبرد سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ صرف قینچی سے خط بنوا لیتے ہیں۔ محلے میں سب لوگ ان کو بڑے منشی صاحب کے نام سے جانتے ہیں۔ بڑے دیندار آدمی ہیں۔ انکی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار ہے، لیکن خدا کے فضل سے اوپر کی آمدنی کافی ہے، ڈپٹی کمشنر صاحب ان کا بڑا احترام کرتے ہیں، اس لئے تمام اہل معاملہ ان کی مٹھی گرم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور تو اور وکیل اور بیرسٹر بھی ان کی "خدمت" سے دریغ نہیں کرتے۔ منشی صاحب بڑے خداترس آدمی ہیں۔ اپنا "حق" وصول کرنے میں سختی نہیں کرتے۔ لوگوں میں ان کا اسقدر اعتبار ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں وہ رشوت لیتے بھی ہیں یا نہیں۔ تمام افسران سے خوش ہیں۔ ابھی اگلے روز جب کچہری کے مسلمان ملازموں اور اہل معاملہ کے لئے مسجد تعمیر

کرنے کا فیصلہ ہوا۔ تو منشی صاحب نے پانچ سو روپے عنایت کئے، تمام شہر میں ان کی سخاوت کی دھوم ہو گئی پنشن ملنے کے بعد انہوں نے قومی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، شہر کی انجمن اسلامیہ کے وہ صدر ہو گئے اور مرنے سے ایک سال پہلے ان کو خان بہادری کا خطاب بھی مل گیا۔

سیٹھ گھنشام داس شہر کے سب سے بڑے ساہوکار ہیں لچھمی ان کے گھر کی کنیز ہے۔ جب انہوں نے کاروبار شروع کیا تھا تو نہایت مفلوک الحال تھے۔ لیکن پرماتما نے ان کو ایسی بدھی عطا کی ہے کہ سٹہ لڑانے میں جواب نہیں رکھتے لاکھوں کا سودا فصل کے کٹنے سے پہلے ہی کر لیتے ہیں پھر کیا مجال ہے کہ اندازہ غلط بیٹھے۔ چند ہی برس میں وہ لکھ پتی ہو گئے، اور اب تو کروڑپتی بتاتے جاتے ہیں سیٹھ جی جتنے دولت مند ہیں اتنے ہی دانی ہیں تمام لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہندو مسلمان انکو رستے میں ملتے وقت سیٹھ جی سلام کہتے ہیں۔ سیٹھ جی بڑے رحمدل ہیں۔ ایک روز وہ گودام گئے تو دیکھا کہ ایک نوکر ایک چوہیا کو مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا سیٹھ جی چوہوں نے ناک میں دم کر دیا۔ بوریوں کو کتر کتر کر چھلنی کر دیا، سینکڑوں کا نقصان ہو گیا۔ ان کو مار رہا ہوں۔ سیٹھ جی نے کہا۔ سنو منگو آج سے تم برخاست کر دیئے گئے، ہم اپنے گودام میں ایسا اتیاچار نہیں دیکھ سکتے، سینکڑوں نہیں اگر ہزاروں کا بھی نقصان ہو جائے تو ہمیں پرواہ نہیں لیکن ہم جیو ہتیا کو پسند نہیں کرتے۔ تمام شہر میں سیٹھ جی کی رحم دلی کا چرچا ہو گیا۔ سیٹھ جی معاملہ کے بھی نہایت پابند ہیں وہ کہا کہتے ہیں کہ: ان لاکھوں کا اور حساب کوڑی کوڑی کا۔

اسی روز ایک کسان آیا جو سیٹھ جی کا مقروض تھا۔ اس نے پانسو کی تھیلی سیٹھ جی کے سامنے رکھی اور کہا سیٹھ جی یہ رقم وصول کیجئے اور مجھے رسید لکھ دیجئے۔ سیٹھ جی نے جواب دیا جب پورا قرضہ ادا ہو جائیگا اسوقت رسید لکھ دی جائیگی۔ کسان مایوس ہو کر چلا گیا۔ بد قسمتی سے اس سال کی فصل خراب ہو گئی۔ سیٹھ جی نے اگلے پچھلے سارے قرضہ کی نالش کر کے تمام اثاث البیت قرق کرا لیا۔ کسان خانماں برباد ہو کر گاؤں سے نکل گیا۔ سیٹھ جی نے اس روپے سے ایک اناتھ آشرم کھول دیا۔ تمام شہر میں ان کی سخاوت کا چرچا ہو گیا۔ اور سرکار نے ان کو رائے بہادر کا خطاب عطا کیا۔

مسٹر رستم جی ایک پارسی وکیل ہیں۔ تمام صوبے میں ان کی شہرت اور قابلیت کا کوئی وکیل نہیں۔ وہ مقدمہ اس صفائی سے لڑتے ہیں۔ کہ وکیل مخالف اور موکل دنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا بستہ کامیابی کا ضامن ہے۔ اہل معاملہ سب سے پہلے ان کی طرف رخ کرتے ہیں اور اگر وہ عینک آنکھوں سے ہٹا کر اور موکل کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے مقدمہ لڑنے کا وعدہ کر لیں تو بس یقین کر لو کہ تقدیر نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ وہ گواہوں کو اس خوبی سے پڑھاتے ہیں کہ مخالف وکیل انکو توڑ نہیں سکتا۔ سچ کو جھوٹ کر دکھانا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا انکے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ ایک مرتبہ ایک قتل کا مقدمہ انہوں نے لڑا۔ سارے شہر کو معلوم تھا۔ کہ ملزم قاتل ہے خود ابتدائی

عدالت میں ملزم نے بھی اقبالِ جرم کر لیا تھا لیکن رستم جی نے مقدمے کو ہاتھ میں لیتے ہی اس خوبی اور عمدگی سے تمام معاملے کو ترتیب دیا کہ ملزم صاف بری ہو گیا۔ اور نہ صرف وہ بری ہوا بلکہ اس کا ایک دشمن جس نے اس کے خلاف سچی شہادت دی تھی تین برس کے لئے حلف دروغی کی نذر ہو گیا۔ سب انسپکٹر جس نے مقدمہ کو مرتب کیا تھا معطل ہو گیا۔ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع سے تبدیل کر دیا گیا۔ رستم جی صوبہ بھر کی بار کے صدر بنائے گئے۔ ان سے زیادہ قابل اور ہر دلعزیز کوئی وکیل نہ تھا۔ جب وہ کونسل کے لئے کھڑے ہوئے تو کسی شخص نے انکے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرات بھی نہ کی۔

تصویر کا تیسرا رُخ

داورِ حشر تخت عدل و انتقام پر جلوہ افروز ہے۔ مجرم ایک ایک کر کے پیش ہو رہے ہیں۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ بڑے بڑے زاہدان مرتاض لرزہ براندام ہیں۔ دیکھئے انجام کیا ہو۔ اتنے میں ضمیر ڈاکو کو پیش کیا گیا۔ وہ آتشین بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ تمام بدن سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ لوگوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ عدالت نے پوچھا تم ڈاکو ہو۔ تم نے چوریاں کیں، سزائیں پائیں۔ تم نے لوگوں کو لوٹا۔ ان کو قتل کیا۔ بتاؤ تمہاری کیا سزا تجویز کی جائے۔ ضمیر یہ سنکر زار زار رونے لگا اور فرشتوں کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس نے سر کو زمین پر رکھ دیا اور کہا۔ میں گناہگار ہوں۔ میں نے زندگی گناہوں میں گذاری۔ میں نے لوگوں کے حقوق غصب کئے۔ انکی جان مال اور آرام کو برباد کیا۔ میری سزا یہ ہے کہ مجھ کو جہنم کے سب سے نچلے حصے میں جگہ دی جائے، لیکن میں رحم کا امیدوار ہوں۔ خدا کی رحمت وسیع ہے۔ میں سچے دل سے تائب ہوں۔ عدالت نے خشمگین ہو کر کہا رحم اور توبہ کا وقت گذر چکا۔ آج تو صرف جزا اور سزا کا دن ہے۔ ضمیر نے آنسوؤں کو اپنے رخساروں پر بہاتے ہوئے کہا۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے لیکن میں اس خدا سے رحم کا طالب ہوں جو تمام وقتوں کا خدا ہے۔

یکایک ندا آئی کہ میرے گناہگار بندے کو چھوڑ دو اس نے میری حقیقت کو پہچان لیا۔ میں ہر وقت کا مالک ہوں تمام اوقات میری مٹھی میں ہیں۔ میں اسوقت بھی اس کی توبہ قبول کرتا ہوں

اس کے بعد خدا بخش جواری اور رلیا رام شرابی آئے۔ عدالت نے کہا خدا بخش تو نے ساری عمر جوئے میں ضائع کی، اور خدا کے احکام کی پرواہ نہ کی، بتا تیری کیا سزا ہو۔ خدا بخش یہ سنکر ہنسا۔ اس نے کہا میری سزا ایک گناہگار کی سزا ہی کیا ہے۔ اس کی سزا صرف یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے، عدالت نے کہا لیکن معاف اسوقت کیا جا سکتا ہے، جب گناہگار نادم ہو۔ خدا بخش نے کہا میری ساری عمر ندامت میں گذری۔ محلے والے مجھ کو ذلیل سمجھتے تھے۔ میری بیوی مجھ کو نفرت اور حقارت سے دیکھتی تھی۔ میرے بچے مجھ سے اس طرح ڈرتے تھے۔ جیسے زہریلے ناگ سے لوگ ڈرتے ہیں۔ میں اندھا نہیں تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا۔ اپنی زندگی پر لعنت بھیجتا تھا۔ لیکن کیا کرتا عادت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ حکم ہوا تم نے گناہ کا اعتراف کیا۔ جاؤ تمہیں آزاد کیا جاتا ہے،

اس کے بعد رلیا رام کا نمبر آیا۔ عدالت نے کہا اس نے شراب خواری کی اسکو سو دُرّے لگاؤ۔ وکیل سرکار

نے کہا یہ سزا بہت کم ہے۔ عدالت نے جواب دیا۔ اس نے تو دنیا میں بھی کافی سزا پائی، ساری سوسائٹی اُسے ذلیل وخوار سمجھتی تھی۔ کتوں سے بدتر اسکی زندگی تھی۔ کیا یہ کافی نہیں۔ کہو رلیا رام تمہاری کیا رائے ہے، رلیا رام نے ہاتھوں سے مکھیوں کو اڑاتے ہوئے اور بہکتے ہوئے کہا۔ حضور میری کیا رائے ہو۔ میں تو ایک ذلیل شرابی ہوں اگر جوتے بھی مار دیئے جائیں تو میری عزت ہے۔ حکم ہوا جاؤ اُسے لیجاؤ اور سو درے لگا کر رہا کر دو۔ یہ اپنے گناہوں پر نادم ہے

اتنے میں عدالت کے احاطے کے باہر ایک شور و غل بلند ہوا۔ تمام لوگوں کی نظریں اُدھر کو اٹھ گئیں، تھوڑی دیر میں فرشتے ایک مقدس انسان کو گرز مارتے ہوئے لائے منشی منظور علی لہولہان مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو گئے، عدالت نے پوچھا منظور علی کیا حال ہے، منظور علی نے کہا یہ فرشتے نہایت بے تمیز ہیں مجرم اور غیر مجرم کو نہیں دیکھتے مجھے خواہ مخواہ پکڑ لائے ہیں۔ عدالت نے کہا سچ کہتے ہو۔ ایسے مقدس انسان کے ساتھ ایسی بدسلوکی نہیں چاہیئے۔ منظور علی نے کہا حضور میں نمازی تھا۔ زکوۃ دیا کرتا تھا۔ ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا مسجدیں آباد کرتا تھا۔ نماز پڑھاتا تھا۔ حج بھی کیا تھا۔ قومی کاموں میں چندہ بھی دیا تھا۔ حضور مجھے تو حساب کتاب کے بغیر ہی جنت میں بھیجنے کا حکم صادر ہونا چاہیئے۔

عدالت نے وکیل سرکار کی طرف اشارہ کیا۔

وکیل سرکار نے مثل اٹھائی اور کہا مائی لارڈ ملزم نے جو کچھ بیان کیا صحیح ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسکی زندگی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے یہ شخص رشوت لیتا تھا۔ یتیموں کا مال قانونی داؤ پیچ سے کھا جاتا تھا۔ بھلا جو شخص رشوت لیتا ہو وہ یاد الٰہی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس شخص کی یہ حالت تھی کہ صاحب بہادر سے چھپا کر رشوت لیتا تھا۔ لیکن خدا سے نہیں ڈرتا تھا۔ عدالت نے کہا منظور علی تم کیا کہتے ہو۔ منظور علی نے کہا حضور رشوت تو میرا حق تھا میں--- لوگوں کے کام کرتا تھا اور ان سے حق وصول کرتا تھا۔ عدالت نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں تنخواہ کس بات کی ملتی تھی؟ فرشتو اسے دوزخ میں لے جاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بھاری بھرکم دوش کو لوگ کندھوں پر اٹھاتے ہوئے لائے، معلوم ہوا یہ سیٹھ گھنشام داس ہیں جو دہشت کے مارے بیہوش ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے دوا سنگھائی لالہ جی ہوش میں آ گئے عدالت نے کہا۔ گھنشام داس تم بڑے دانی تھے۔ عرض کیا، حضور۔ تم بڑے رحمدل تھے۔ تم نے چوہوں کو مارنا گوارہ نہ کیا۔ لالہ جی نے کہا مائی باپ! عدالت نے کہا تم نے یتیم خانے بنائے۔ سرائیں تعمیر کرائیں بڑے پن کے کام کئے، سیٹھ جی نے کہا، جی حضور۔ عدالت نے کہا تو تمہیں تو بیکنٹھ میں جگہ ملنی چاہیئے لالہ جی نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا جی ہاں یکایک عدالت کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار ہویدا ہو گئے اور اس نے گرج کر کہا۔ لیکن تم نے سینکڑوں بندگان خدا کو سود کی ایک ایک کوڑی کے لئے ہلاک کر دیا۔ تم نے چوہوں کو بچایا اور آدمیوں کو پامال کیا۔ یہ ہے تمہاری رحمدلی اور یہ ہے تمہاری سخاوت، فرشتو لے جاؤ اس مردود کو اور دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دو۔

اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ رستم جی گاؤن پہنے استدلال کے پلندے لئے چلے آ رہے ہیں، فرشتے ان کے پیچھے ہیں۔ اور وہ سب سے لڑتے جھگڑتے اور بحث کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ انہوں نے آتے ہی عدالت سے کہا مائی لارڈ آپ کی پولیس نہایت بیوقوف ہے۔ معزز شہریوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتی ہے۔ عدالت نے کہا تمہارا کیا مطلب ہے، رستم جی نے کہا مائی لارڈ میں ہائیکورٹ کا ایک معزز وکیل ہوں۔ انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں کرسی نشین ہوں۔ وائسرائے کی خوشنودی مزاج کا پروانہ حاصل کر چکا ہوں جو شاہی مثل پڑا ہے۔ عدالت نے کہا یہ سب صحیح ہے لیکن تم جھوٹ کو فروغ بھی تو دیتے رہے ہو۔ گناہگاروں کو چھڑاتے اور بے گناہوں کو پھنسواتے بھی رہے ہو۔ بیسیوں بیگناہ خاندان تم نے اپنے استدلال کے فریب سے تباہ کر دیئے۔ محض اس لئے کہ تم نے ایک فریق سے فیس وصول کر لی تھی۔ رستم جی نے کہا۔ مائی لارڈ یہ تو وکیل کا پیشہ ہی ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو پریکٹس کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عدالت نے کہا لیکن جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے ظلم تو ظلم ہی ہے گناہ تو گناہ ہی ہے خواہ کسی کی پریکٹس کامیاب ہو یا ناکامیاب۔ تم کوئی اور عذر پیش کر سکتے ہو رستم جی نے کہا میں کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقدمہ اس عدالت سے ہٹا کر کسی انگریزی عدالت میں منتقل کر دیا جائے، عدالت نے جواب دیا۔ اس عدالت کے سوا اب کوئی اور عدالت نہیں انگریزی عدالت بھی اسی عدالت کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑی ہے رستم جی نے کہا تو میں اس عدالت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں عدالت نے حکم دیا۔ اس مردود کو زمین پر گراؤ اور اس کی زبان گدی سے کھینچ لو۔ اور اس کے دماغ کو گرزوں سے پاش پاش کر دو۔ کہ یہی دو چیزیں اس کی تباہی کا باعث تھیں اور اسے ڈاکوؤں اور چوروں کے جہنم میں ڈال دو

(عزیز)

غزل

اب شکایت کچھ مقدر کی نہیں اے دل مجھے — مل گیا مایوسیوں میں عشق کا حاصل مجھے

جینے اپنی موت کی مانگی تھی کب تم سے مراد — کشتگانِ عشق میں کرتے ہو کیوں شامل مجھے

توڑ دیتا میں نیازِ عشق کی پابندیاں — راس آ جاتی اگر یہ قیدِ آب و گِل مجھے

وہ میرے ان آنسوؤں کی قدر کیوں کرنے لگا — دے رہا ہے اُف! پیامِ یاس میرا دل مجھے

ہے اِدھر شوقِ شہادت اور اُدھر ذوقِ ستم — ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں قاتل کو اور قاتل مجھے

تو بھی خوش ہو جا کہ یہ ہے عین فطرت عشق کی — اور ناموسِ محبت پر مٹا دے دل مجھے

مبتلائے حزن رہتا ہے مآلِ آرزو — آرزوؤں سے رہائی پانا ہے مشکل مجھے

ڈوبنے سے دی ہے دریا نے مجھے قیسی پناہ
درسِ غرقابی مگر دیتا رہا ساحل مجھے

قیسی رامپوری

چڑیا

از جناب مولانا منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا

میں شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اور اب ایک باغ کی روش سے گزر رہا تھا۔ میرا کتا میرے آگے آگے دوڑ رہا تھا یکایک اسکی رفتار سست ہوگئی، اور اس نے دبے پاؤں یوں چلنا شروع کیا۔ جیسے وہ کسی شکار کو پکڑنا چاہتا ہے۔

میں نے باغ کی روش پر نگاہ ڈالی تو مجھے ایک چڑیا کا بچہ نظر آیا جس کی چونچ کے ارد گرد زرد رنگ کی ایک دھاری تھی اور جس کے سر پر نرم نرم بال تھے۔ باغ کے اس کنج میں ہوا درختوں کو زور زور سے ہلا رہی تھی اور یہ اپنے گھونسلے میں سے گر کر بیچارگی کی حالت میں اپنے ننھے ننھے پر پھڑپھڑا رہا تھا اور اڑ نہ سکتا تھا۔

میرا کتا آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ رہا تھا کہ یکایک قریب کے درخت سے ایک چڑیا جھپٹ کر اس کے منہ کے سامنے ایک پتھر کی طرح گری۔ پریشان ڈری ہوئی مایوسانہ اور رحم انگیز آواز میں چلاتے ہوئے اس نے دو مرتبہ اپنے آپ کو کتے کے چمکدار دانتوں والے کھلے ہوئے منہ کے آگے ڈال دیا۔

وہ اپنے بچے کو بچانے کیلئے آئی تھی اور اس کے درمیان حائل ہوگئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کا ننھا سا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سی تیزی تھی۔ پھر غش کھا کر وہ کتے کے سامنے آ پڑی۔

کتا اسے عظیم الہیت دیو نظر آیا ہوگا! لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بلند آشیانے کی پناہ نہ لے سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک قوت جو اس کے ارادے سے زبردست تھی اسے نیچے کھینچ لائی۔

میرا کتا پیچھے ہٹ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے بھی صاف طور پر اس قوت کو پہچان لیا تھا۔

میں نے اپنے ہیبت خوردہ کتے کو بلا لیا، اور اپنے دل میں ایک احساس احترام لئے ہوئے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ہاں! آپ ہنسیں نہیں۔ میں نے اس ننھے سے بہادر پرندے کے جذبہ محبت کے لئے دل کے اندر احترام محسوس کیا۔

میں نے خیال کیا، محبت موت سے یا موت کے خوف سے زیادہ طاقت ور ہے۔ صرف اس کے بل پر، ہاں محبت کے بل پر زندگی قائم ہے۔ اور ترقی کرتی ہے۔

(ترجنیف)



غزل

ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی الافغانی

بھلا کیونکر نہ ہو راتوں کو نیندیں بے قرار اُسکی
کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اُسکی

اُمیدِ وصل پر دل کو فریبِ صبر کیا دیجیے
نظر وحشی ادا اُس کی - ادا بیگانہ وار اُسکی

جفائے ناز کی میں نے شکایت ہائے کیوں کی تھی
مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اُسکی

تجھے تو عشق پیچاں ایسے بل کھانے نہ آتے تھے
بتا کیا تجھ پہ لہرائی ہے زلفِ مشکبار اُسکی

محبت تھی مگر یہ بے قراری تو نہ تھی پہلے
الٰہی آج کیوں یاد آتی ہے بے اختیار اُسکی

ہمیں عرضِ تمنا کی جسارت ہو تو کیونکر ہو
نگاہیں فتنہ ریز اسکی ادائیں حشر بار اُسکی

کوئی کیونکر بھلا دے ہائے ایسے کی محبت کو
وفائیں دل نواز اسکی - جفائیں خوشگوار اُسکی

یہاں کیا دیکھتے ہو ناصحو - گھر میں دھرا کیا ہے
میرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈو یادگار اُسکی



وٹلس (روم کا بادشاہ ۲ جنوری تا ۲۲ دسمبر ۶۹) کو کمبخت سے عداوت تھی - غم غلط کرنے کیلئے ہر وقت نشہ شراب میں مخمور رہتا تھا - اسی جرم میں رومیوں ایک محلہ سے باہر نکال کر مار ڈالا گیا - یہ تصویر اسی موقع کی ہے - اسکے آخری الفاظ تھے

"پھر بھی میں تمہارا شہنشاہ ہوں"

مرسلہ دیوانہ مصطفے آبادی

اردو اور شمالی ہند

از جناب میر نذر علی صاحب درد کاکوروی

سب سے پہلے. شمالی ہند میں اردو کی ابتدا ہوئی۔ امیر خسروؒ ہی کو اردو زبان کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے، عالیجناب سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ خلجی عہد میں حضرت خسرو نے بھاشا میں عربی فارسی الفاظ ملانے شروع کیے جب خلجی زمانے سے عربی الفاظ کا اختلاط شروع ہوا ہے تو اردو زبان کی ابتدا دکن سے کیسے ہو سکتی ہے؟ دکن میں تو محمد تغلق کے وقت سے مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اگر دکن میں ۱۳۱۷ء مطابق ۱۳۱۷ء سے عربی فارسی الفاظ کا اختلاط مان لیا جائے تو بھی شمالی ہند کی تقدیم ہر طرح ثابت ہے۔ دکن سے چھ سو ستر سال پہلے شمالی ہند میں عربی فارسی الفاظ پھیلے اور حضرت امیر خسرو نے اپنے مبارک ہاتھوں سے شمالی ہند میں اردو کا سنگ بنیاد رکھا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اردو کو اردو کہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اردو لشکر کو کہتے ہیں۔ اور یہ لشکری زبان ہے۔ جس طرح لشکر اس جمعیت کو کہتے ہیں جس میں ہر ملک کا آدمی ہو اسی طرح لشکری زبان (اردو) اس مجموعہ الفاظ کو کہتے ہیں جس میں ہر زبان کے الفاظ ہوں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ سب سے پہلے اسلامی لشکر کس سمت آیا اور کون اس کا باعث ہوا۔ تاریخیں شاہد ہیں کہ سب سے پہلے اسلامی لشکر دکن پہ حملہ آور نہیں ہوا۔ بلکہ شمالی ہند پر۔ اور اس ابتدائی حملہ کا باعث محمد ابن قاسم ہیں جنہوں نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد محمود غزنوی وہ بادشاہ ہے جس نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کئے۔

عہد غزنوی میں جب مسلمانوں کا لشکر ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اور جب اس نے فتح حاصل کی ہوگی تو ہر بار کے حملے اور ہر وقت کے رہنے سہنے سے آپس کی گفتگو نے جدید رنگ اختیار کر لیا ہوگا۔ جب ہندیوں اور غزنویوں سے گفتگو ہوتی ہوگی تو اس میں ایک دوسرا فریق اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کیلئے ایک دوسرے کے الفاظ کو اول اول تامل سے پھر بے تامل بولنے لگا ہوگا۔

غرض مسلمانوں نے سب سے پہلے دکن پر حملہ نہیں کیا بلکہ شمالی ہند پر۔ یہی وجہ ہے کہ دکن والے نہیں بلکہ شمالی ہند والے پہلے پہل عربی الفاظ سے آشنا ہوئے۔ شمالی ہند والوں نے مفتوح ہونے کی وجہ سے ہماری فارسی زبان سے کافی دلچسپی لی۔ مسلمانوں کی اس مستقل بود و باش سے رفتہ رفتہ یہ نتیجہ ہوا کہ ہندی زبان میں فارسی زبان کے سیکڑوں الفاظ اور محاورے گھل مل گئے۔

اب وہ ہندی لوگ جن کا سرکاری ملازمت سے تعلق ہوتا ہوگا: وہ فارسی الفاظ بولنے کی کوشش کرتے ہونگے یا وہ لوگ جو اپنے مقدموں کی پیروی کیلئے عدالتوں میں آتے جاتے ہونگے انکو اپنے معاملات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کافی طور پر فارسی الفاظ بولنا پڑتے ہونگے اس طرح ایک جدید زبان کی بنیاد آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جاتی ہوگی۔

بہت سے ہندو جو مسلمان ہوئے ہونگے وہ کچھ تو اپنی "پرائیویٹ" زندگی اور کچھ اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اور ہر وقت کے ارتباط اور میل جول سے فارسی الفاظ اپنی زبان میں بولنے لگے ہونگے۔

اسلامی لشکریوں نے اگر کسی ہندی عورت سے شادی کی ہوگی تو اسوقت بھی میاں بیوی کے تعلقات اس امر پر مجبور کرتے ہونگے کہ ہندی ملی ہوئی فارسی بولی جائے یا فارسی ملی ہوئی ہندی۔

سلطان محمود کو تعمیرات سے خاص دلچسپی تھی اس لئے ممکن اور بہت ممکن ہے کہ اس کے ساتھ اس فن کے ماہر بھی ہندوستان میں آئے ہوں اور اس نے اپنے ملک کی صنعت کو ہندوستان میں رواج دینے کا ارادہ کیا ہو۔ ہندوستانیوں کو مفتوح ہونے کی حیثیت سے ہر طرح ہر موقع پر فاتح قوم کی پیروی کرنا پڑتی ہوگی۔

شمالی ہند کے ہندو فقیروں نے اپنی صداؤں میں بھیک ملنے کی خاطر عربی فارسی الفاظ استعمال کئے ہونگے، جو ان کی دلکش صداؤں سے رفتہ رفتہ سننے والوں کو یاد رہ گئے ہونگے

مسلمان جہاں اور علوم اپنے ساتھ لائے یقیناً طب بھی ساتھ لائے ہونگے اور اس سے علاج معالجہ کے وقت مریض اپنا حال بیان کرنے کے لئے اپنی زبان میں کچھ نہ کچھ ٹوٹے پھوٹے فارسی الفاظ ضرور ملاتا ہوگا ادھر طبیب مریض کو استعمال ادویہ کے لئے اپنی فارسی زبان میں ہندی ملاکر ضرور بولتا ہوگا۔

شمالی ہند میں صوفیوں نے جب تصوف کی تعلیم دی ہوگی واعظوں نے جب وعظ کہا ہوگا تو دوران وعظ میں فارسی عربی الفاظ کا نہ آنا غیر ممکن ہوگا۔

غرض اسی طرح فارسی کے تمام الفاظ ہندی بولی کے آغوش میں پرورش پاکر خودبخود زبان پر جاری ہو گئے ہونگے۔ اسی چیز نے رفتہ رفتہ ایک نئی زبان کی بنیاد خودبخود قائم کردی ہوگی۔ قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ جہاں سب سے پہلے فارسی زبان آئی ہوگی۔ جہاں برج بھاشا کی زمین میں فارسی بیج بویا گیا ہوگا وہیں کی فضا کی موافقت نے شاعری کا جامہ پہن لیا ہوگا۔ نہ یہ کہ اسلامی لشکر تو شمالی ہند میں آئے مگر لشکری زبان اور اسکی شاعری جنوبی ہند سے شروع ہو۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

۹۲ھ / ۷۱۲ء میں عربوں نے شمالی ہند پر حملہ کیا۔ چونکہ یہ بالکل ابتدائی موقع تھا۔ اس لئے شمالی ہند کے لوگ حروف کا تلفظ بھی اسوقت اچھی طرح ادا نہ کرسکتے ہوں گے۔

پھر ۳۹۱ھ / ۱۰۰۱ء سے ۴۱۷ھ / ۱۰۲۶ء تک سلطان محمود غزنوی شمالی ہند میں حکمران رہا۔ (تاریخ ہاشمی صفحہ ۸۵)

یہ مدت کچھ کم نہیں مقامی باشندے عربی فارسی الفاظ سے نہ صرف واقف ہوگئے ہونگے بلکہ ان کا لب ولہجہ

بھی بدل گیا ہوگا۔ اور زبان خوب منجھ گئی ہوگی۔ رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری بسلسلہ استفسارات زبان اردو کی ابتدا کے متعلق نگار ستمبر ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۴۸ میں تحریر فرماتے ہیں

"اگر اردو زبان یا اردو شاعری سے اسکا ترقی یافتہ دور مراد ہے تو اس کی ابتدا زیادہ سے زیادہ شاہجہاں کے عہد سے شمار کی جاسکتی ہے لیکن اگر اس سے مقصود وہ ابتدائی تغیر ہے جسے ہندوستان کی پراکرت نے فارسی کی امتزاج سے قبول کیا تو اس کا زمانہ یقیناً غزنوی عہد قرار دیا جائیگا جب ہندو مسلمانوں میں کافی ارتباط ہوگیا تھا اور جس کا نہایت قوی ثبوت مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ کا وہ ہندی کلام ہے جس کا ذکر عوفی نے کیا ہے۔ یہ دونوں پانچویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ارتباط کی زیادتی کے ساتھ زبان میں بدلتی گئی یہانتک کہ ساتویں آٹھویں صدی میں عام طور پر اس کا رواج ہوگیا اور مشائخ و علما بھی اس میں گفتگو کرنے لگے۔"

۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک تمام ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ اسوقت بھی دکن میں اسلامی حکومت کا پتہ نہیں مگر شمالی ہند میں اسلامی حکومت موجود ہے۔ اور ایک بزرگ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ پیدا ہوچکے ہیں چھٹی صدی ہجری میں آپ کا نام بحیثیت زبان اردو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ جنکی اردو گفتگو اور کلام آگے آتا ہے، یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر تحقیقات بڑھتی جائیگی۔ یہی ثابت ہوتا چلا جائیگا کہ حضرات صوفیہ نے قدیم اردو زبان کی اشاعت میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں سلطان التمش دہلی کے تاج و تخت کا مالک ہوتا ہے ان پے در پے اسلامی حکومتوں کی وجہ عربی فارسی الفاظ کا دلوں پر سکہ بیٹھ چکا ہے۔ جناب شمس اللہ صاحب قادری اردوئے قدیم کے صفحہ ۱۷ میں لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ونیٹرنز (جس نے ادبیات ہندوستان پر ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے۔) اس کا بیان ہے کہ بارہویں صدی عیسوی (یعنی چھٹی صدی ہجری میں) جب مسلمانوں نے ہندوستان پر تسلط کیا تو عربی فارسی الفاظ برج بھاشا میں ملنے لگے۔

۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء سے ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء تک سلطان رضیہ حکمران رہی۔ اس کے بعد ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں ناصر الدین شمالی ہند کا بادشاہ ہوتا ہے اسوقت بھی دکن میں اسلامی حکومت کا پتہ نہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ شمالی ہند میں عربی فارسی کا مسکن تھا۔ ناصر الدین اور اس کے بیٹے کیقباد میں صلح ہوئی ایک بہاری شاعر نے اسکو نظم کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

من کی نگری کو تب کریں آباداں
ناصرالدین سو جب ملیں موجدین کبادا (معزالدین کیقباد)

پھر ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں سلطان غیاث الدین بلبن حکمران ہوتا ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت خسروؒ پیدا ہوچکے ہیں۔ (مولانا حالی نے حیات سعدی میں لکھا ہے کہ حضرت خسرو ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے اس حساب سے حضرت خسرو کو پیدا ہوئے ۱۴ سال ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو دکن نے ۲۲ میں لکھا ہے کہ حضرت خسرو ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے اس حساب سے اسوقت حضرت خسرو کو پیدا ہوئے ۱۴ سال ہوچکے تھے) اس مدت میں حضرت خسرو نے اردو

کی کیا کچھ خدمت نہ کی ہوگی۔ بلکہ حضرت خسرو کی خالق باری سے اردو اس قدر عام ہوگئی تھی کہ حضرت صدرالدین المتوکل کی جو ۷۰۰ھ میں ہوئے اور ۲۰ سال حضرت خسرو کے ہمعصر رہے۔ جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ تو انہوں نے شمس الدین عرف بڈھن اس کا نام رکھا اسی طرح ایک بزرگ جو اسی زمانے کے تھے انہوں نے شیخ ٹاھن اپنے بیٹے کا نام رکھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ سلطان رضیہ اور سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں اردو زبان کس قدر عام ہو چکی تھی۔ دکن میں اسوقت بھی اسلامی حکومت نہ تھی۔ سلطان قطب قلی شاہ کا کیا تذکرہ جو ۹۱۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور دراصل دکن میں اسلامی حکومت علاؤالدین حسن گانگوی بہمنی سے شروع ہوتی ہے جس کا سنہ تخت نشینی ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء ہے اور ہم غیاث الدین بلبن کے عہد کا تذکرہ کر رہے ہیں جو ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء میں بعمر (۶۰) سال دکن کی اسلامی حکومت سے (۸۴) سال پہلے شمالی ہند میں تخت نشین ہوا۔ اسی اسلامی بادشاہ کے عہد سے حضرت خسرو اور اردو کا تعلق ہے۔

یہ خیال کہ خالق باری حضرت خسرو کی تصنیف نہیں بالکل غلط ہے۔ کیونکہ جناب مولوی مسعود حسن صاحب ایم اے نے عرصہ ہوا ۱۹۲۲ء میں اردو کے منظوم لغت پر ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں ثابت کیا ہے کہ خالق باری اردو کا لغت ہے اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اگرچہ حضرت خسرو کا اردو کلام اسوقت کافی تعداد میں موجود نہیں لیکن جو کچھ ملتا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سنسکرت اور بھاشا کے کتنے الفاظ استعمال کئے ہیں جناب افتخار عالم صاحب کا ایک مضمون اسی بحث پر عرصہ ہوا شائع بھی ہو چکا ہے۔ غرض حضرت خسرو کے عہد میں شمالی ہند میں اردو شاعری ہو چکی۔

دکن سے اردو کے متعلق محمود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں احمد دکنی کی سرخی سے محمد قلی قطب شاہ کو بہت سراہا ہے اور جناب مولوی عبدالحق صاحب کے تبصرے کا بھی بڑے زور میں تذکرہ کیا ہے۔ اور اسی کتاب کے صفحہ ۲۰ سطر آخر میں میر حسن کا قول لکھا ہے کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکن رواج یافتہ" حالانکہ اس کی صحت دور از قیاس ہے بلکہ پایہ ثبوت سے بالکل ساقط ہے۔ اس لئے کہ ریختہ مسلمانوں کی حکومت کا نتیجہ ہے۔ دکن میں مسلمانوں کی حکومت علاؤالدین حسن گانگوی بہمنی سے شروع ہوئی ہے جس کا سنہ تخت نشینی ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء ہے۔ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کی ایک گفتگو جو آگے آتی ہے۔ اس سے شمالی ہند میں ریختہ کی قدامت ثابت ہے۔

حضرت فریدالدین گنج شکرؒ ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہم جس گفتگو کا حوالہ دے رہے ہیں وہ دکن کی اسلامی حکومت سے پیشتر کی ہے۔ ایسی صورت میں ریختہ کی ابتدا دکن سے کس طرح مانی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مادر مومناں جمال الدین ہانسوی کی بیوی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے برہان الدین کی بابت شیخ فریدالدین گنج شکر سے کہا۔ خوجا برہان الدین بالا ہے۔ شیخ نے جواب میں فرمایا۔ پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے؟ یہ گفتگو ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء سے پہلے کی ہے اور بمقام دکن اسلامی حکومت ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں قائم ہوئی جس سے شمالی ہند میں ریختہ کی قدامت بخوبی ثابت ہے

اگر خلجیوں کا زمانہ لیجئے تو اس سے پہلے بھی کسی طرح دکن میں اردو کی قدامت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں خلجیوں نے دکن پر حملہ کیا ہے اور ہم اس سے تیس سال پہلے کی یعنی ۶۶۳ھ (۱۲۶۵ء) کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

جواہر فریدی کے صفحہ (۲۰۸) میں ہے کہ [illegible] گنج شکرؒ اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دیکھ رہے تھے اتنے میں ان کے چہرے پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ بابا فرید آنکھ پر پٹی کیوں باندھی ہے بابا فرید نے ہندی (اردو) زبان میں جواب دیا کہ "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا "اگر آئی ہے چرا بستہ اند"

چھٹی صدی ہجری کا اُردو شاعر

نفحات العنبریہ میں ہے کہ گنج شکرؒ ۵۶۹ھ یا ۵۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۳ھ (۱۲۶۵ء) یا ۶۶۸ھ (۱۲۶۹ء) میں وفات پائی۔ محمود شیرانی صاحب نے "پنجاب میں اردو" میں ان کو متوفی ۶۶۴ھ لکھا ہے۔ ان کی ایک اردو غزل جو اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۲ میں درج ہے اسکو ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ دکن سے پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری موجود تھی کیونکہ یہ نظم چھٹی صدی کی ہے اور دکن میں ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) سے اسلامی حکومت شروع ہوئی ہے

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با دم خود ہمدم و ہشیار باش — صحبت اغیار بری بات ہے
با تن تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی ساتھ ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

"چاند بالا ہوتا ہے" اور "آنکھ آئی ہے" دو [illegible] آپ کے اردو فقرے ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اب ۳ فقرے اور سن لیجئے۔ اردوئے قدیم کے صفحہ ۱۸ میں ہے کہ حضرت شکر گنج شکر کے خلیفہ بدر الدین اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کو بھیا کہا کرتے تھے (بھیا اردو ہے) ایک بار آپ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا کونسا مقام ہے آپ نے فرمایا "بیچ سر کے" یہ بھی اردو ہے آپ کی صوفیانہ تعلیم کا ایک عمل ہے۔ فرید اچلے پنج کو خواجہ قطب سنا یا سانپا چورا ناصرا تینوں دانت بندھا ملے

حضرت فرید گنج شکرؒ نے ۶۶۸ھ (۱۲۶۹ء) میں وصال فرمایا اس اعتبار سے حسب ذیل امور ذہن نشین رکھئے۔

(۱) ابراہیم عادل شاہ دکنی ۹۱۶ھ (۱۵۰۹ء) میں تخت نشین ہوئے ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) میں انتقال کر گئے اسی طرح اس بادشاہ کی تخت نشینی سے (۲۴۸) سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعر موجود تھا۔

(۲) سلطان قطب قلی شاہ ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں تخت نشین ہوئے ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں انتقال کر گئے ان کی تخت نشینی سے (۲۵۰) سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری کا وجود ثابت ہے

(۳) ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں تخت نشین ہوئے ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں مر گئے۔ ان کی تخت نشینی سے (۳۲۰) سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری موجود تھی

(۴) ولی دکنی ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں پیدا ہوئے ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں انتقال کر گئے۔ ان کی پیدائش سے (۴۱۱) سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری پائی جاتی ہے۔

جناب محمود شیرانی صاحب نے خالق باری خسرو کے متعلق مفصل بحث کی ہے ممکن ہے صاحب موصوف

اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہوں۔ پہلا اعتراض لفظ چھنیل کے متعلق ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے جواہر خسروی میں لفظ چھنیل کے متعلق اگر یہ لکھ دیا ہے کہ اس عہد کے بعد یہ لفظ نہیں ملتا اور جناب محمود شیرانی صاحب کو مل رہا ہے تو اس سے نفس مضمون پر کیا اثر پڑتا ہے اگر لفظ چھنیل بعد کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے تو اس سے۔ تو ہماری نگاہوں میں خالق باری کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

خالق باری کا اصل شعر ہے ؎

مولوی صاحب سرن پناہ   گدا بھکاری خسرو شاہ

جناب شیرانی صاحب نے سرن کو میرن لکھ دیا ہے حالانکہ صحیح لفظ یہاں سرن ہے۔ میرن نہیں ہے۔ سرن کے معنی ہیں پناہ۔ دیکھئے نور اللغات۔ اور جناب محمود شیرانی صاحب کو اعتراض یہ ہے۔ کہ مولوی کا لفظ اس زمانے میں نہ تھا اور لفظ شاہ کی بابت چڑیا کوٹی صاحب کا استدلال شاعرانہ ہے اور یہ کہ شاہ کے لفظ سے حضرت خسرو کو سادات سے خواہ مخواہ التباس کی کیا ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا جواب سنیئے غور کیا جائے تو شاہ کا لفظ لگا دینے سے ہرگز سادات سے التباس کیا جانا لازم نہیں آتا۔

(۱) شاہ مینا قلندر لاہر پوری عباسی ہیں مگر لفظ شاہ کے ساتھ مشہور ہیں

(۲) شاہ قطب قلندر جونپوری فاروقی ہیں مگر لفظ شاہ کے ساتھ مشہور ہیں۔

(۳) محبوب الحق شاہ فصیح الدین جونپوری صدیقی ہیں مگر لفظ شاہ کے ساتھ مشہور ہیں

(۴) شاہ عبدالرزاق لکھنوی انصاری ہیں مگر لفظ شاہ کے ساتھ مشہور ہیں۔

(۵) شاہ ولی اللہ دہلوی فاروقی ہیں مگر لفظ شاہ کے ساتھ مشہور ہیں۔

اس سے زیادہ مثالیں موجود ہیں۔ بخوف طوالت اسی پر اکتفا کی گئی غرض لفظ شاہ کے استعمال سے کوئی بعید نہیں ہو جاتا۔

اب رہا فخریہ کسی لفظ کا استعمال تو مولانا جلال الدین رومی صاحب مثنوی شریف نے اپنی غزلوں میں اکثر فخریہ الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً ملا کا لفظ ؎

بروح پاک شمس الدین تبریز   کہ ملا برسر بازار رقصد ست،

اس میں مولانا روم نے ملا کا لفظ اپنے لئے استعمال کیا ہے،

ایک اور شعر ہے ؎

بیا شاہا عنایت کن تو مولانائے رومی را
غلام شمس تبریزم قلندر وار می گردم

اس میں مولانا روم نے اپنے لئے مولانا کا لفظ استعمال کیا ہے پھر اگر خسرو نے اپنے لئے اگر شاہ کا لفظ استعمال کیا تو کیا بیجا کیا۔ اس کے علاوہ جب اس زمانے میں ملا اور مولانا کا لفظ استعمال ہوتا تھا تو پھر مولوی کے استعمال کی بابت شبہ کرنا خلاف قیاس ہے:

مولانا شبلی نے سوانح مولانا روم میں شاہ بوعلی قلندر کو مولانا روم کا ہمعصر لکھا ہے اور حالات شاہ بوعلی قلندر (مرتبہ صوفی پنڈی بہاؤ الدین) سے ظاہر ہے کہ حضرت خسرو کو حضرت محبوب الٰہی نے شاہ بوعلی قلندر کے پاس بھیجا تھا۔ نتیجہ یہ کہ حضرت خسرو اور مولانا روم کا زمانہ ایک ہی تھا پھر اگر حضرت خسرو نے مولوی کا لفظ استعمال کیا تو قابل تعجب نہیں۔ کیونکہ مولانا روم کا شعر ہے ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزے نہ شد

اس کے علاوہ شاہ کا لفظ از روے لغت استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ لفظ گدا فارسی ہے اسکی اردو بھکاری ہے اسی طرح لفظ خسرو فارسی ہے اسکی اردو شاہ ہے۔ فقرہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں اردو شاعر

خسرو (سیف الدین) بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۷۲۵ھ میں وفات پائی۔ جناب مولوی مسعود حسن صاحب ادیب ایم اے نے عرصہ ہوا ۱۹۲۰ء میں اردو کے منظوم لغت پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ثابت کیا ہے کہ خالق باری اردو کا لغت (حضرت امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے) ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کا اردو کلام بہت تھا۔ مگر ضائع ہوگیا مطبوعہ خالق باری میں ۱۹۲ شعر ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ اول کی تخت نشینی ۹۱۶ھ میں ہوئی اس سے (۱۱۵) سال پہلے۔ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی ۹۸۸ھ سے (۲۸۳) سال پہلے پھر حضرت ولی دکنی ۱۰۷۹ھ کی پیدائش سے (۴۲۸) سال پہلے شمالی ہند میں حضرت خسرو اردو شاعر ہوئے ہیں۔

سب کوئی اسکو جانے ہے ہر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دوہڑی میں لیکھا ہے فکر کیا ان دیکھا ہے

خالق باری سرجن ہار واحد ایک بدا کرتار
اسم اللہ خدا کا ناؤں گرما ہے دھوپ سایہ چھاؤں
آتش آگ آب ہے پانی خاک دھول جو باد اڑانی
چھلنی غربال، چکی آسیا دیگداں چولہا وکھدو کوشیا

(ملا پرچہ ترقی اردو ۱۹۲۳ء)

گوشوارہ در ہندی برنوں کرن پھول کان
گوہر لو موتی کہئے مونگا ہے مرجان
مولوی صاحب سرن پناہ گدا بھکاری خسرو شاہ

خوار شدم زار شدم لٹ گیا درغم ہجر تو کر ٹوٹا ہے
یار نہیں دیکھتا ہو سوئے من بے گنہ ہم سانہ جب روٹھا ہے
روئے تو رونق شکن آفتاب سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ وہ چہ کند بھاگ گرا پھوٹا ہے

خربزہ

دس ناری کا ایک ہی نر بستی باہر واکا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم منہ میٹھا تاثیر گرم

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی حضرت خسرو کے ۷۰ سال ہمعصر رہے۔ خالق باری سے اردو اسقدر ہر دل عزیز ہوگئی تھی۔ کہ شیخ وقت کو اپنے مریدین کیلئے اردو کتاب لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ کتاب ۷۵۸ھ کی یادگار ہے۔

(۱) ابراہیم عادل شاہ جس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دکن میں فارسی سے ہندی دفتر قرار دیا۔ (یہ شخص ۹۱۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور اس نے ۹۴۱ھ میں انتقال کیا) حضرت سید اشرف جہانگیر نے ۷۵۸ھ میں اردو کتاب لکھی اس حساب سے اول ابراہیم عادل شاہ دکنی سے (۲۱۶) سال پہلے شمالی ہند میں اردو کا وجود ثابت ہو رہا ہے۔

(۲) سلطان قطب قلی شاہ (جو قطب شاہی سلطنت کا بانی ہے ۹۱۸ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۵۰ھ میں انتقال کر گیا) اس سے (۲۱۰) سال پہلے شمالی ہند میں

اردو کی یہ کتاب لکھی گئی۔

(۳) ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اور اس نے ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں انتقال کیا۔ اس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ دکن میں اس کے زمانہ میں اردو کی بنیاد پڑی مذکورالصدر حساب سے شمالی ہند میں دکن سے (۲۰۸) سال پہلے اردو کی ابتدا ہو چکی تھی۔

حضرت سید اشرف جہانگیر والی مجلد ضخیم کتاب کو میں نے خود دیکھا ہے۔ مزورتاً اس پر صفحے ڈالے گئے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۰ کا ایک ٹکڑا یہ ہے

"اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے جو
تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات
کے باہر بعیتر تمام ذات ہی ذات ہے"

سلطان غیاث الدین کے بعد ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں تغلق شمالی ہند پر حکمران ہوتا ہے اور ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء تک حکومت کرتا ہے اس کے بعد ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء سے ۹۵۵ھ / ۱۴۵۱ء تک لودھی خاندان شمالی ہند پر حکمران ہوتا ہے۔ جس میں سکندر لودی ایک بادشاہ ہے جو ملکی مصلحتوں کی بنا پر ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی طرف خاص طور پر رغبت دلاتا ہے۔ قدرتاً شمالی ہند کی خاک سے ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء میں ایک شاعر کبیر داس نامی اٹھتا ہے اور اپنے صوفیانہ اردو کلام سے دنیا کو محو کر دیتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کا وہ شاعر جس کے کلام میں اردو عنصر غالب ہے

کبیر داس ولادت ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء وفات ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء

یہ اول ابراہیم عادل شاہ سے (۱۱۵) سال پہلے اور ابراہیم عادل شاہ ثانی سے (۱۸۷) سال پہلے۔ ولی دکنی سے (۲۶۸) سال پہلے پیدا ہو چکے تھے۔

مالا کہو جا کہ [illegible] بہہ پانی مرا کر شا مر گئے دیکھے چار وچ کہانی
پیر پیغمبر مر گئے۔ مر گئے جنگم جوگی، راجہ کر شا مر گئے مر گئی بید لا وگی
رلا مر گئے کر شا مر گئے مر گئی لکھو بائی۔ ہنکو سادھو کبیر نہیں جن کا موت آئی

پوتھی سب تھو تھی بھئی پنڈت بھیا نہ کوے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوے

بھیلا بترا جھونپڑا، گل گیش کے پاس
جو کرے گے سو بھریں گے، تو کیوں بھیا داس

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے، دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئی
پتھر پوجے ہری ملے تو ہم پوجیں پہاڑ، اس سے چکی بھلی کہ پیس کھائے سنسار

انمیجہ جل ہاتھی لکھا، اپنے اپنے گیان
اپنی اپنی کہیں سب، کس کو کیجے کان
ہندو اور مسلمان، ہم دونوں کی مان
کدو کاٹ مردنگ بنایا، نیبو کاٹ مجیرا
پانستریا منگل گاوے، ناچے بالم کبیرا
جوگی دگمبر سیو بنا کپڑے رنگے لال سی، واقف نہیں اس رنگ سے کپڑے کے رنگے کا کیا
رنگی کو نارنگی کہیں، بنے دودھ کو کھویا
[illegible] کہیں، دیکھ کبیرا رویا
[illegible]

اگر کبیر داس کا کلام بنظر غائر دیکھا جائے تو ایسا بہت سا کلام ملتا ہے جس کو اردو کہہ سکتے ہیں۔ اول تو اس شاعری کو اردو زبان کی شاعری کہنا زیبا تھی ہے اور اگر بفرض محال اردو زبان کی شاعری کا اس پر اطلاق نہیں اور اس میں ہندی عنصر زیادہ ہے تو ولی دکنی کا کلام بھی خالص اردو زبان کا کلام

ہنیں کیونکہ اس میں بھی اسی طرح دکھنی زبان کا عنصر غالب ہے
لودھی خاندان کے بعد ظہیر الدین بابر بادشاہ ہوتا
ہے جو ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء سے ۹۳۶ھ/۱۵۳۰ء تک حکومت کرتا ہے، اس کے
عہد میں بھی ایک زبردست شاعر تلسی داس ہوتا ہے۔
اس کے کلام میں بھی اُردو عنصر غالب ہے۔

نویں صدی ہجری کے شاعر جنکے کلام میں اردو عنصر غالب ہے

تلسی (باباتلسی داس گسائیں) برہمن۔ آتمارام
باپ کا نام تھا سمت ۱۵۸۳ مطابق ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء میں پیدا ہوئے بھاشا
میں ان کا کلام بہت ہے مگر ایسا کلام بھی زیادہ پایا جاتا ہے جس
میں اردو عنصر غالب ہے اور جس پر اردو کا اطلاق ہو سکتا ہے
انہوں نے سمت ۱۶۷۴ مطابق ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں انتقال کیا ۹۱ سال
کی عمر پائی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تلسی آہ گریب کی ہری سوں سہی نہ جائے
مرے چام کی سانس سوں لوہا بھسم ہو جائے
جو ملینا تا کہے بلیٹھی سشکر کھائے
جو بکری میں میں کرے سیج ماری جائے
مایاسے مایا ملے کر کے لمبے ہات
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات
تن اُجلا من کالا بگلے کا سا بھیکھ،
تو سے تو کاگا بھلا باہر بہتر ایک،
کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس
لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھیو راکھ
میں برھن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ
پاس کہوں تو پاس ہے اور دور کہوں تو دور
جان اجان جہاں میں سب میں ہے بھرپور
دور کہوں تو دور ہے اور پاس کہوں تو پاس
رُوم رُوم میں رم رہے جو پھلن مابا س
آسن مارے کیا ہوئے جو گئی نہ من کی آس
جوں تیلی کے بیل کو گھر گھر کوس پچاس
مالا پھیرے جگ گیو اور گیا نہ من کا پھیر
کر کا من کا چھوڑ کے۔ من کا منکا پھیر
ماٹی کہے کمہار سے تو مت روندے موئے
اک دن ایسا آویگا میں روندنگی توئے
(کبیر تنم ساکھی وخم خانہ وید)

حکیم شمس اللہ صاحب اردوئے قدیم کے صفحہ ۴
کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ بابر کے ایک سکہ پر جو
۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء میں مضروب ہوا ہے "ضرب اردو" مسکوک ہے
(فہرست سکہ جات سلاطین مغلیہ پنجاب میوزیم لاہور مرتبہ
مسٹر واہٹ ہیڈ)

شاہ عبدالسلام قلندر جو ۸۶۱ھ مطابق ۱۴۵۶ء
میں پیدا ہوئے اور ۹۷۶ھ مطابق ۱۵۶۸ء میں انتقال
کر گئے۔ انہوں نے اپنی دوسری شادی کے متعلق ایک
سید صاحب ساکن جوگیاپور (جو۔ جو نپور اور علن پور کے
درمیان واقع ہے) کے یہاں پیام دیا انہوں نے محض
اس خیال سے کہ میری لڑکی فقیر کے پاس آرام سے کب
رہ سکتی ہے۔ انکار کر دیا۔ اس پر شاہ عبدالسلام قلندر جونپوری
نے اردو میں ارشاد فرمایا۔ "تجب اینے ہوئی ہیں تب دی ہیں"
(نفحات العنبریہ صفحہ ۱۰۹)
شاہ کدن شطاری آٹھویں صدی ہجری میں ایک بزرگ
گزرے ہیں ان کے سات بیٹے تھے مگر ان پر نظر عنایت نہ تھی

آپ کے خلفا بھی بہت ہوئے ان میں سے شاہ علی قوام عاشقاں[۱] متوفی سنہ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء زیادہ منظور نظر تھے۔ ایک روز آپ ان کے منتظر تھے جب یہ پہنچے تو بہت خوش ہوئے اور نعمت فقر عطا فرمائی۔ (اپنے سات لڑکوں کو خلیفہ نہیں کیا بلکہ) اردو زبان میں یہ فقرہ ارشاد فرمایا۔

"سات پوت کدن نپتے نعمت فقر علی عاشقاں گئے"

ان دونوں واقعوں سے بھی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی اردو پر کافی روشنی پڑتی ہے (نفحات النعبیہ صفحہ ۱۴۸)

حقیقت یہ ہے کہ کبیر داس وغیرہ کی شاعری کو اردو زبان کی شاعری نہ کہنا ناانصافی ہے اگر آپ کے خیال میں اس پر اردو زبان کی شاعری کا اطلاق نہیں ہوتا تو جواب یہ ہے کہ ولی دکھنی کا کلام بھی خالص اردو زبان کا کلام نہیں کیونکہ اس میں اسی طرح دکھنی زبان کا عنصر زیادہ غالب ہے۔

اگر ہم کو قدیم شاعری کے ایک ہی دو شعر ملیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اسکو بالکل کالعدم سمجھ لیں کسی خاندان میں اگر ایک بھائی کے صرف دو لڑکے ہیں اور دوسرے بھائی کے دس تو تقسیم ترکہ کے وقت دو لڑکے والے شخص کو کیا شمار ہی میں نہ لایا جائیگا۔ اور کیا اسکو ترکہ سے بالکل محروم رکھا جائیگا۔

قرآن پاک میں علم غیب نہ جاننے کی بابت بہت سی آیتیں ہیں لیکن جاننے کی بابت صرف دو آیتیں ہیں۔ کیا صرف دو آیتیں ہونے کی وجہ سے انکو قرآن کی آیت نہ سمجھا جائیگا یا ان سے استدلال ناموزون قرار دیا جائیگا۔ حال میں سیرت النبی کی جو جلد شائع ہوئی ہے اس میں مولانا سلیمان ندوی نے صرف انہیں دو آیتوں سے علم غیب نبوی کو ثابت کیا ہے۔

اسی طرح اگر ہم کو قدیم اردو شاعری کے نمونے کے لئے صرف دو ہی شعر ملیں تو وہ ہمارے لئے دو دیوان کا حکم رکھتے ہیں۔ دراں حالیکہ حضرت خسرو اور کبیر داس کے ایسے اشعار ملا کر کئی ہزار تک تعداد پہنچتی ہے جو ایک دیوان کے مساوی ہے۔ اگر قدیم اردو زبان میں ہندی زبان کا عنصر غالب ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اس زمانے میں خالص اردو زبان میں اشعار ہی نہیں کہے جاتے تھے

آج جبکہ اردو بہت صاف ہو گئی ہے۔ آج بھی بہت سے کہنے والے ایسے ہیں۔ جن کے بہت سے اشعار میں فارسی عنصر زیادہ ہوتا ہے مگر کیا ان کو اردو شاعری سے متعلق نہیں سمجھا جاتا؟ برابر سمجھا جاتا ہے۔ جب سمجھا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے اشعار جن میں بجائے فارسی کے ہندی عنصر زیادہ غالب ہے ان کو اردو نہ سمجھا جائے۔

فرض کیجئے کہ حضرت غالب قدیم اردو شاعر ہوتے اور اردو کے قدیم تذکروں میں ان کے یہ دو شعر نظر پڑتے

نقش نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب — رقص طاؤس پئے خامہ معنی مانگے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

تو آپ یہی کہہ دیتے کہ شعر نمبر ۱ تو ضرور اس زمانہ کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اردو کا ابتدائی دور فارسی سے کافی متاثر تھا۔ لیکن شعر نمبر ۲ ہرگز قدیم اردو کا نمونہ نہیں ہو سکتا اس زمانے میں ایسی صاف اردو کہاں۔

اس سے یہ امر صاف طور پر روشن ہو گیا کہ اگر قدیم اردو کے متعلق صاف اور غیر صاف دونوں طرح کے اشعار پائے جائیں تو صاف اشعار کی قدامت سے انکار کر دینا غلطی ہے شاعر اپنی طبیعت حالات اور واردات قلبی کے لحاظ سے کبھی آسان شعر موزون کرتا ہے۔ اور کبھی مشکل۔ کبھی ایسا شعر

۱ انہوں نے سنہ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں انتقال کیا

لکھتا ہے، جس میں بالکل اردو ہوتی ہے کبھی دقت پسند طبیعت سے ایسا شعر لکھتا ہے جس میں اردو کا ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح حضرت امیر خسروؒ اور کبیر داس وغیرہ کے جتنے اشعار ہیں ان میں اگر فارسی ہندی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قدیم یا دوسرے شعرا نے بالکل صاف اردو لکھی ہی نہیں۔ ورنہ یوں تو دکن کی قدیم شاعری بھی تمام تر دکھنی ہے جس پر صاف اردو کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں ہمایوں تخت نشین ہوا ہے۔ بعض جگہ ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء سے ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء تک لودھی خاندان بھی حکمران رہتا ہے اس کے بعد اکبری عہد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں اہل فارس بھی فارسی عبارتوں میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جھروکہ، درشن، پھول کٹارہ کھیوہ مرصع، جم دہر، کٹارا، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، نالکی جھالر کہار، ڈاک، چوکی، دیسمکہ، دیس پانڈیہ، پٹیل پٹواری، رائے راؤ، راجہ، مہاراجہ، چودہری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیال، ڈال گھاٹ، گھرواڑہ، بیوپاری، (گل رعنا)۔

میر امن دہلوی مولف باغ و بہار اردو کی ابتدا اکبر بادشاہ کے زمانے سے بتاتے ہیں ان کی عبارت یہ ہے

"اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب، قوم قدر دانی اور فیض رسانی۔ اس خاندان لاثانی کی سن کر حضوری میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی"

اب ولی دکھنی سے اردو کی ابتدا بتانا کہاں تک قرین انصاف ہے جو عالمگیر کے آخری عہد میں ہوئے۔ حکیم شمس اللہ صاحب قادری کتاب اردوئے قدیم کے صفحہ ۲ میں لکھتے ہیں "شہنشاہ اکبر نے اجمیر ۹۸۳ھ اور پنجاب ۹۸۵ھ کے سفر میں جو سکے مضروب کرائے تھے۔ ان پر دارالضرب کا نام "اردوئے ظفر قرین" ثبت ہے" (فہرست سکہ جات سلاطین مغلیہ پنجاب میوزیم جلد سوم) یہی حکیم صاحب اردوئے قدیم کے صفحہ ۱۰۲ میں فرماتے ہیں۔

"کہ بارہویں کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود تھی" مگر اس میں کہاں تک اصلیت ہے ناظرین پر خود ظاہر ہو جائیگا۔ اور ہو گیا ہوگا

حضرت سعدی کاکوروی

آپ کا اصل نام کمال الدین ہے مگر مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کے نام سے مشہور ہیں قاضی شیخ محمد بندگی منن اللہ آپ کے والد کا نام تھا۔ حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کا مزار کاکوری میں آج تک زیارت گاہ خلائق ہے

"تذکرہ مشاہیر کاکوری میں لکھا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذیقعد ۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء انتقال کیا۔ قدیم زمانے میں بڑی بڑی عمریں ہوتی تھیں اگر آپ کی عمر سو سال کی بھی قرار دیجائے تو ۸۵۱ھ / ۱۴۴۷ء سال پیدائش قرار پاتا ہے۔ آپ نے شہنشاہ اکبر کا زمانہ پایا ہے کیونکہ شہنشاہ اکبر ۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا جس کا سنہ جلوس ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء ہے حضرت سعدی کی وفات کے ۱۲ سال بعد شہنشاہ اکبر نے ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء میں انتقال کیا۔ شہنشاہ اکبر باعتبار تبحر علمی آپ کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے کچھ زمین بطور معافی نذر کی تھی جو اب تک موجود ہے،

محمود شیرانی اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" کے صفحہ ۱۴۱

میں لکھتے ہیں۔

"شیخ سعدی دور اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو
غلطی سے عوام سعدی شیرازی مانتے ہیں انکا ریختہ
اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے میں صرف مقطع
پر اکتفا کرتا ہوں"

ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی منتخب التواریخ میں آپ کا حال لکھا ہے۔ جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری کتاب اردوئے قدیم کے صفحہ ۱۱۳ میں لکھتے ہیں

"حقیقت یہ ہے کہ سعدی ریختہ گو نہ تو سعدی شیرازی
ہیں اور نہ انہیں دکن سے تعلق ہے بلکہ یہ شمالی
ہندوستان کے باشندے ہیں شہنشاہ اکبر ۹۶۳ھ
سنہ ۱۰۱۴ھ کے معاصر تھے ۱۰۲۰ھ میں انکا انتقال ہوا
ہے طبقات اکبری میں ملا نظام الدین احمد کا بیان
ہو کہ کاکوری کے رہنے والے تھے بختاور خاں نے
لکھا ہے کہ طبع موزون داشتے و بزبان فارسی و
ہندی شعر نیکو گفتے"

یہاں اس زمانے کی اردو زبان کی گفتگو کے متعلق مجھے ایک قصہ یاد آگیا اس قصہ کو میں نے اپنے والد سے بارہا سنا ہے کہ حضرت نظام الدین بھکاری اور حضرت سعدی کاکوروی ہمعصر تھے۔ ایک بار حضرت سعدی کاکوروی نے کسی سے برسبیل تذکرہ "اردو زبان" میں فرمایا "باسی بچے نہ کتا کھائے" جب مولانا قاری نظام الدین (عرف شاہ بھکاری کاکوروی) نے سنا تو فرمایا "باسی بچے اور کتا کھائے" حضرت سعدی کاکوروی کے ریختہ اشعار یہ ہیں۔

قطعہ
چہ دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ خدا اے باورے اس ملک کی یہ ریت ہو

اے مرد ماں شہر شما کتنی بری یہ دیت ہے
ہے ہو نمی پرسد کسے پردیسیا ماریت ہے
ہمنا تمہن کو دل دیا۔ تم جو لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
دو نین کے گھر میں پھروں روزی بجوں دلکو بھروں
پیش سگ کوبت دھروں پیا سانجا ہے میت ہے
سعدی بگفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہو ہم گیت ہو

محمد افضل میرٹھی

جو میرٹھ کے ایک قدیم قصبہ جھنجھانہ کے رہنے والے تھے بعض نے ان کو پانی پتی بھی لکھا ہے۔ قائم چاندپوری کے تذکرہ سے ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۱۱۲۰ھ سے پہلے ہوئے ہیں۔ ان کو ایک عورت سے عشق تھا اور سچا عشق تھا۔ . . . .
جس کے عشق میں گوپال نام رکھ کر ایک مندر کے پجاری بھی بنے آخر وہ عورت مسلمان ہو گئی اور انہوں نے اس سے نکاح کر لیا۔

انہوں نے اپنے عشقیہ قصے کو نظم بھی کیا ہے یہ نظم دکھنی شاعری سے بالکل الگ ہے جس سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا ولی کی آمد سے پہلے کافی ثبوت ملتا ہے۔

چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں — مری گھر ناریاں سب آوتی ہیں
الٰہا کر گھر منے دھوش میاتی — متاع صبر و تسکین دل لٹائی
جنون در ملک جان جھنڈا گڑایا — سمجھ اور بوجھ کا تھانا اٹھایا
چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں — جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں
چو شد مدت پیا کے سنگ رہتی — مرم با یگدگر سنتے و کہتے
اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا — سیانا دیکھ اس کو دور بھاگا
اری یہ عشق ہو یا کیا بلا ہے — کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

کہ جس کے بیچ یہ آتش بھری رے | وہی دن رین سلگت ہی سرے
وہی جانے کہ جسکے تن لگی ہے | برہ ہونکی آگ تن من میں دگی ہے
نہیں اکدم مجھے دن رین میں چین | اندھیری ہو چلی رو دو سری نین
کیا مجھ دستگیر آں شاہ بیداد | چہ سازم چوں کنم فریاد فریاد
پیا نے کر پکڑ کر سوں لگا ہی | تمامی آگ تن من کی بجھائی
پیا رحسن کی مے کا پلایا | کیا بیخود مجھے مجھ سوں چھلایا
مرا سکھ دیکھ اسکوں حیرت آہی | نہادہ بر دلم داغ جدائی

بارہ ماسہ کا انتخاب یہ ہے۔

ساون

چڑا ساون بجا مارو دگارا | سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
پپیہا پیہ پیہ نس دن پکارا | پکارت دادر و جھینگر جیکارا
اری جب کوک کویل نے سنا ہی | تمامی تن بدن میں آگ لا ہی
اندھیری رین جگنو جگ مکاتا | اری جلتی او پر تیں کیا جلاتا
سنی جب مور کی آواز بن سوں | شکیب از دل شدہ آرام تن سوں
پھٹی جل تھل بھیا سرسبز عالم | نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم
چلا ساون وگر ساجن نہ آہی | ارے کن سوکنی تو نے چلا ہی

بھادوں

سکھی بھادوں تپت پھوٹی پرے پر | تمامی تن بدن میرا جبر کی رے
بھورن پرنے لگی اور راعدگر جا | تمامی تن بدن جیوں جان کسجا
گھٹا کاری کے اندر بیچ تپکی | جری جھیورا کن سوں دہا لرجی
اکیلی دیکھ بس کاری دراوے | تمامی رین دن برہوں ستاوے
پیا پردیس جا ہم کوں بسارا | نجانوں کیا گنہ دیکھا ہمارا -
کہو پیہ کی خبر پوچھوں کسی جانے | لکھوں پتیاں کسی یوں ملے گوری ہائے -
وصل رحلت کا بھادوں نے بابا | اچھوں لگ سا ورا پردیس چھایا

ملا دوپیازہ

یہ صرف ظریف نہ تھے۔ بلکہ اکبری عہد کے شاعر بھی تھے ان کے اردو کے اشعار ملاحظہ ہوں، اس سے ثابت ہے کہ اکبری عہد میں ولی دکھنی سے پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری موجود تھی۔ انتخاب کلام دیکھئے۔

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا
شوخی نپٹ کرت ہے تک چکنی ہاتھ مل کر
تیں تاک شیخ کیتی ایسی طرح ملونا
تالی بجی ہے کیا کیا کل شیخ جی کے پیچھے
رم رب بغل میں بھاگا لے اوڑھنا بچھونا
دوپیازہ از دل و جان قربان چرا نہ باشم
جوبن لے مدھ کا ماتا وہ سانولا سلونا

پیالہ پیم رس کا چاکھ بیٹھے | ملت ہیں تن بدن میں راکھ مٹھو
نہ دوپیازہ کی دلداری کرتے ہے | مگر صد گونہ باخواری کرتے ہے

دوپیازہ اب نکس ہنڈیا میں آبیٹھے | مکھی کی ہاتھ پھنس گئے جالے میں نیچے

(تذکرہ خندہ گل)

جہانگیر ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء سے ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تک حکمران رہتا ہے اس نے رام رنگی شراب کا نام رکھا تھا۔ باپ کو شاہ بھائی۔ دادا کو شاہ بابا۔ بھائی کو، بھائی جیو کہتا تھا (گل رعنا)

عہد شاہجہاں میں۔ جو ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء سے ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء تک رہا اس عہد میں اللہ خدائی تصنیف ہوئی جو ولی دکھنی سے ۱۹ سال پہلے لکھی گئی ہے۔ اب اندازہ کرنا چاہئے کہ جب کتاب اللہ خدائی لکھتے وقت ۱۰۶۰ھ / ۱۶۴۹ء تھے تو مصنف کی عمر کم از کم ۳۰ ر ۴۰ کی تو ہوگی اگر شمالی ہند میں اردو شاعری تھی ہی نہیں۔ تو کیا یہ کتاب ویسے ہی مرتب ہو گئی۔

اسی عہد کا ایک شاعر ملا محمد علیم تحقیق کہتا ہے ؎

جگیا بانہ کرول سو ملے جا سلونو سانوری ای دھرکو آجا

ظہیر دہلوی شاگرد ذوق لکھتے ہیں۔

"بادشاہ شاہجہاں نے۔ شاہ جہاں آباد کو آباد کیا جامع مسجد اور لال قلعہ تعمیر کر کے قلعۂ معلیٰ میں جلوس فرمایا دار الخلافت ٹھیرایا اور بیرون قلعہ اہل لشکر کو سکونت کے لئے حکم دیا اور بازار آباد کیا وہ بازار اردو بازار کے نام سے موسوم ہوا۔ اس بازار کے باشندے چونکہ اہل لشکر تھے اور مختلف اللسان کرنا باہم اتفاق ہوا۔ اس کا نام اردو معلیٰ قرار دیا"

اسی زمانہ میں علامہ ناصر افضلی الہ آبادی ایک بزرگ تھے۔ جو اردو شاعری میں صاحب دیوان گذری ہیں (یہ حضرت خوب الہ آبادی کے جانشیں تھے) انہیں کا اردو دیوان مولانا نذیر احمد صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کو دیدیا ہے (اردو پرچہ جلد ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء صفحہ ۴۸۶)

اب تو ولی دکھنی سے پہلے رنگ تغزل اور دیوان کا وجود پایا جا رہا ہے۔

برہمن (پنڈت چندربھان)

ان کا اکبرآباد اصلی وطن تھا مگر دہلی میں جا بسے اپنی قابلیت سے شاہزادہ دارا شکوہ کے میر منشی ہو گئے تھے دارا شکوہ کے قتل کے بعد تارک الدنیا ہو کر بنارس چلے گئے اور یاد خدا میں مشغول رہ کر ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا (خم خانہ)

قدیم زمانے میں عمریں بڑی بڑی ہوتی تھیں اگر ان کی عمر صرف ۹۰ سال ہی کی قرار دی جائے تو ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء میں پیدائش قرار پائی ہے۔ اور اگر ۱۵ سال تعلیم کے رکھ لئے جائیں اور شاعری کی ابتدا ۹۹۸ھ سے سمجھی جائے تب بھی ان کا وجود شمالی ہند میں ہر طرح ولی دکھنی سے پہلے ثابت ہے کیونکہ ولی دکھنی ۱۰۶۸ھ میں پیدا ہوئے اس طرح گویا ولی دکھنی سے ۷۰ سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعر پیدا ہو چکا تھا۔ اب شمالی ہند کی قدیم اردو شاعری کا رنگ تغزل ملاحظہ ہو۔

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے

نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

جناں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
(خوباں)

نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالہ ہے

پیا کے ناوں کی سمرن کیا چاہو کروں کیسیں
(نام) (کیسے)

نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
(تسبیح)

پیا کے ناوں عاشق کوں قتل باعجب دیکھے ہوں
(نام) (کو)

نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاسیں
(باغیچہ)

نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالہ ہے

دسویں صدی ہجری کے اُردو شاعر

بیدل (مرزا عبدالقادر)

اصل وطن توران۔ بخارا میں پیدا ہوئے صغرسنی میں ہندوستان آئے یہیں نشو و نما پائی۔ شاہزادہ محمد اعظم (خلف عالمگیر) کی رفاقت میں رہے آقا کی وفات کے بعد گوشہ نشین ہو گئے۔

آصف جاہ دکن نے باصرار طلب کیا تب بھی نہ گئے فارسی میں ضخیم کلیات ہے کبھی کبھی ریختہ (اردو) بھی کہتے تھے، انہوں نے نادر شاہ زمانہ (۱۱۳۳ھ ۱۷۲۰ء) میں انتقال کیا (خم خانہ جاوید) اگر سو سال ان کی عمر قرار دی جائے تو ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۰ء سال پیدائش قرار پاتا ہے ولی دکھنی ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء میں پیدا ہوئے اس طرح ولی دکھنی سے ۳۵ سال پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری پیدا تھا

ہو چکی تھی۔ جس کا ثبوت بیدل کے یہ اشعار ہیں۔ جس سے زبان کی صفائی کا اندازہ کافی ہو سکتا ہے۔ (خم خانہ)

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشان کا حاصل کہاں ہو ہم ہیں
جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہو ہم ہیں

امانی (خواجہ امامی)

شاہجہاں آبادی خلف خواجہ اثمی۔ شاگرد دیپ وطن چھوڑ کر مرشد آباد جا رہے تھے۔ مرثیہ خوانی کو کسب معاش ٹھیرایا اور وہیں شدت گریہ سے ۱۱۴۴ھ ۱۷۳۱ء میں انتقال کیا۔ شیفتہ اور لطف نے ان کا امانی تخلص لکھا ہے اور بعض تذکرہ نویسوں نے امامی لکھا ہے۔ لطف کے قول کے مطابق ۱۱۴۴ھ ۱۷۳۲ء سال وفات ہے پرانے زمانے میں عمریں بہت بڑی ہوتی تھیں اس لئے اگر ۱۰۰ سال کی عمر قرار دی جائے تو ۱۰۴۴ھ اور دوسرے قول کے مطابق ۱۰۴۴ھ ۱۶۳۴ء سال پیدائش قرار پاتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے میرا
اے نالۂ دل وقت ہے فریاد رسی کا
سینے میں جدھر رو ہو ترا پھونکدی اے آہ
ٹک دل سے خبردار کہ یہ گھر ہے کسی کا

کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں
جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں

اس کے کوچے سے تنی غبار اٹھا   کون سا داں سے خاکسار اٹھا

رہ تکتے تکتے آخر جی سے آیا تنگ دل
آنکھیں پتھرا گئیں پردہ نہ آیا سنگ دل
ہو چکا ہے غم سے خوں اب چلنے جانے کہیں
خوف ہے یارب نہ بدلے وہ بھی کچھ رنگ دل

میر جعفر علی نام زٹلی تخلص

۱۰۶۹ھ ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ کلام میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ابو اسحاق اطعمہ سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، طبیعت میں شوخی تھی چند نظمیں ایسی لکھیں جن میں استاد پر بھی چوٹ تھی۔ انہوں نے مکتب سے نکلوا دیا۔ پھر کھچوی نامہ لکھا۔ اس سے بہت شہرت حاصل کی کچھ دن بعد شہزادے کام بخش کے یہاں مرچھل بردار ہو گئے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شاعر بھی ہیں تو اس نے غزل کی فرمائش کی انہوں نے تعمیل ارشاد میں جو غزل لکھی اس کے دو شعر یہ ہیں۔

از عاشق بیچارہ مکن نخرہ دگھونگٹ، تاکے بود ایں گری بانا رجوبی تو
تا چند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی، یہ رنگ پتنگے کا نونہ ہار جوبی تو

ان فارسی ترکیبوں سے کوئی شبہ نہ کیجئے کیونکہ جب اردو شباب پر تھی اور ذوق۔ شاہ نصیر شہیدی وغیرہ موجود تھے۔ اسوقت غالب نے فارسی ترکیبوں کو استعمال کیا ہے تو ابتدائے زمانہ میں ایسا رنگ قابل شبہ کیسے ہو سکتا ہے،

شہزادے نے یہ غزل بہت پسند کی جس سے ان کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے مگر نقد جنس کچھ ہاتھ نہ آئی مورچھل کی خدمت بار ہو گئی۔ تو آپ نے مورچھل برداری کی ہجو میں کچھ اشعار لکھے جس میں کا ایک شعر یہ ہے

جعفرا زیں کوچہ دریں مورچھل، شرم حضوری بکن ولوٹ چل۔

اس نوکری سے بیزار تھے سفر اختیار کیا۔ بیکاری
اور سفر سے تنگ آکر یہ شعر لکھے۔

تنہا شدی اندر سفر کہہ جعفراب کیسے بنے
افتادی اندر بحر و بر کہہ جعفراب کیسے بنی
در بیکسی تابودہٗ با درد و غم آلودہٗ
مفلس شدتی و در بدر کہہ جعفراب کیسے بنی
از ہجو آں سلطان خود کردی پریشاں جان خود
درماندۂ بے بال و پر کہہ جعفراب کیسے بنی
اسباب غم برداشتی تخم فلاکت کاشتی
اکنوں کجا آں سیم و زر کہہ جعفراب کیسے بنے

اس زمانہ میں نواب کوکلتاش خاں ستارہ کی مہم پر جانا تھا فوراً درخواست دی۔ انہوں نے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ مگر صرف کھانا ملتا تھا۔ تو آپ نے منظوم عرضداشت لکھی جس کے بعض بعض شعر یہ ہیں

جُوان پڑگئیں در قباؤ آزار - نئی آئی مشکل یہ دتی دیار
رکت کی جویں میری پیاسی پڑیں - کہ حیران و ہلکان مجھ کو کریں
لہو میرا پی پی کے موٹی ہوئیں - بغل بیچ دشمن مری ہو رہیں

نوکری کی بُرائی پر ایک نظم ہے جس کے یہ شعر یہ ہیں
جبتلو بیان نوکری جب لگا ٹھہرو گھو کری
تب بھول جاوی چوکڑی، یہ نوکری کا خبط ہی
ہر روز مجرا اٹھ کریں کارکیسو گر پڑیں
بے شرم ایسے لڑ مریں۔ یہ نوکری کا خبط ہی
دس بیس بھرے میں گئے۔ دس بیس کشتی تھی گئی
دس بیس میں جھگڑے کئے، یہ نوکری کا خبط ہی

اورنگ زیب کے انتقال پر۔

اورنگ زیب سر گئے شیکی جگت میں کر گئے
تخت اور چھپر کھٹ دھر گئے آخر فنا آخر فنا
سُوَا خدا کی یاد میں۔ رکھا اورنگ آباد میں
خبریں گئیں بغداد میں۔ آخر فنا آخر فنا

تذکرہ خندہ گل صفحہ ۶۲ میں ہے کہ آپ کا کلیات نثر و نظم کے مختلف اقسام پر مشتمل ہے۔ نثر کے اقسام۔

(۱) گفتگو نامہ جس میں اردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا محل صرف نہایت خوبی سے بتایا گیا ہے۔

(۲) رقعات نثر جس میں تلازمے۔ اور طرح کی شوخیوں کا وہ وہ عالم ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

(۳) عدالتی تحریریں نثر اپنے خاص الخاص رنگ میں جس میں تلازمے ظرافت شوخیاں اپنے اپنے رنگ میں سبھی کچھ ہے۔

(۴) شرارت نامہ جسکو شاہی یادداشتوں اور تزک کے طور پر مرتب کیا ہے اور اس میں ضرب الامثال کو اس صورت سے صرف کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۵) مصطلحات زمانہ۔ یہ لغت کے طور پر ہے۔ زمانے کی رسم و رواج اور ضرورت کے موافق اس میں الفاظ کے معانی بیان کئے ہیں۔ اگر اردو زمانہ عالمگیر سے پہلے موجود نہ تھی تو اس کے قواعد۔ رقعات۔ ضرب الامثال۔ اور لغت وغیرہ مدون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

نظم کی قسمیں

واقعات، ہجویات۔ رقعات۔ دستور العمل، پند و نصائح رجز، نسخہ جات۔ مثلے، غزلیات، مورچھل نامہ، کچھوے نامہ مسدس، ظفر نامہ میراثی، سیس نامہ، تضمین قطعات۔

اچھا کچھ شعر اور سنئے۔

جو نار نکلے چال میں سسکی بھرے ہر حال میں
کالا تو ہے کچھ دال میں از قرب او زنہار بہ

گھوڑا جو اسر لوی نہ دے صاحب طلب سازی نہ دے
بیٹا جو وہ یاری نہ دے ایں ہر سہ تن فی النار بہ

سسرا جو ہو دل تنگ جی مسکت خفیش سنگ جی
داماد سے بیرنگ جی اس سے سگ مردار بہ

جو تجھ کو برا من میں چیتا کرے
غیاغپ شپاشپ کے پلے پڑے

ایک بار قمر النسا بیگم نے میر جعفر کو اپنے دیوان کی معرفت تیس روپے انعام دلوائے اس نے صرف پانچ دئیے باقی خورد برد کر دئیے انہوں نے ہجو کہی جس کا یہ اثر ہوا کہ قمر النسا بیگم نے اپنے دیوان فتح علی خاں کو بہت ڈانٹا میر صاحب کو پورا انعام دلوا دیا۔ ہجو کا ایک شعر یہ ہے

دلائے تیس لیکن پانچ نکلے
فتح خاں کی الہی کانچ نکلے
(کیا صاف اردو نہیں؟)

جوانی جانے کا غم ۔ ۰ دریغا کہ جوبن چپا اردس کر
اُلٹے تلے کا گھر موس کر
جوانی و جوبن پڑو بھاڑ میں
کہ آخر ٹھکانا اسی غار میں

جعفر زٹلی نے ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء میں انتقال کیا۔ ۵۵ سال کی عمر پائی۔

اُلُل

۱۱۲۷ھ / ۱۷۱۴ء میں پیدا ہوئے جعفر زٹلی کے شاگرد تھے۔ دہلی کے رنگیلے اور بانکے نوجوانوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ نمونہ کے طور پر کچھ کلام ملاحظہ ہو۔

رجپوت بچہ نازنیں زلفیں رکھیں جوں مار کج
زلفاں کج و ابرو کج و مژگان خنجر دار کج

ایں طرۂ خوش رنگ او نیرنگ کاری برد دل
گا ہے کج و طرہ کج و اس طرہ پہ ہر تار کج

سید اُلُل مقبول ہو تجھے راجہ پان پھول ہو
ہنسنے کرے گفتار کج جانے اچھی رفتار کج

دیکھ سجن کے حسن کو جھوم رہا ہو مگن سبھی
روز نظارہ ایسے کا مارے اُلُل اچک اچک کر

جوبن کے دھ دھکے آنے پگ دھر لچک چلے ہے
نازک کمر دہ لچکے ہر ہر قدم چلن میں

محمد عطا ایک شخص تھے۔ اُن سے اور اُلل سے بہت نوک جھوک ہوا کرتی تھی اتفاق سے محمد عطا گوشہ نشیں ہو گئے تو اُلل نے منہ پر کہا ؎

جب سُنا دھوم دھام یاروں کا
جھونپڑی میں رہا دبک بڑ چود

اُلل نے ۱۰۷۵ھ / ۱۶۶۴ء میں انتقال کیا (پرانے تھاپے کا تذکرہ شعرا۔ از کتب خانہ انوریہ کاکوری) ۔۔۔

اگر دکن سے اردو کی ابتدا ہوئی ہو تو یا زمانہ قدیم میں اگر دکن کے کسی فرد نے اردو زبان میں صفائی پیدا کی ہو تو آج دکن خود اس کی تردید کرتا ہے اور واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے جس کا ثبوت آگے آتا ہے۔

اردو شاعری ہر جگہ جب زور شاہ صاحب کے قلم سے جب کوئی مضمون

نکلتا ہے تو ملکی غیر ملکی تعصب چھپے ہوئے جس میں بذو ریہ امور ضرور پیش نظر رہتے ہیں۔

عـ۱ جس طرح ممکن ہو کھینچ تان کر اُلٹا سیدھا یہ ثابت کردیا جائے کہ شمالی ہند میں ولی سے پہلے کوئی شاعری نہیں ہوا یعنی دکن ہی سے اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی۔

عـ۲ اُردو شاعری کے جو قدیم نمونے شمالی ہند میں موجود ہیں انکے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ ان پر اُردو شاعری کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ تاکہ ہر طرح دکن سے اردو شاعری کی اولیت قائم رہے

عـ۳ شمالی ہند کی قدیم شاعری پر جب تبصرہ کیا جاتا ہے تو یہ ضرور بیان کیا جاتا ہے کہ دکن کے فلاں فلاں شعرا۔ یا ان کا کلام شمالی ہند میں پہنچ چکا تھا۔ تاکہ شمالی ہند کے شعرا کا دکن سے مستفید ہونا ثابت ہوجائے۔

شمالی ہند کی اُردو زبان میں برجستگی، صفائی، دلکشی، اور دلآویزی پائی جاتی ہے اسکا جنوبی ہند کی اُردو میں پتہ نہیں اس سے خودبخود ظاہر ہے کہ اُردو زبان نے ارتقائی منازل کہاں طے کئے اور قدیم زمانہ میں صحیح معنوں میں دکن نے اُردو زبان کی خدمت کی یا شمالی ہند نے اس امر پر تو تفصیل سے پھر کسی فرصت میں روشنی ڈالیں گے سردست دکن کی اُردو کے مختلف نمونے پیش کرتے ہیں۔ دکن کے بڑے بڑے قابل اور پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے کہ تحریر و تقریر میں بے تکلف اس طرح گفتگو کرتے ہیں

دکھنی اُردو بول چال کے چند نمونے

اب جاتا ہوں	کی جگہ	"حاضر ہوتا ہوں"
ہاں	کی جگہ	"ہَو"
معلوم آتا نہیں	کی جگہ	"معلوم سچ نہیں"
معلوم نہیں	کی جگہ	"کیا ہے کو"
کتاب میں لایا	کی جگہ	"کتاب میں نے لایا"
میں نے خط لکھا ہے	کی جگہ	"میں خط لکھا ہوں"
جواب دیجئے	کی جگہ	"جواب ادا کیجئے"
انہوں نے کہا چلے جاؤ	کی جگہ	"وہ چلے جاؤ کرکے بولے ہیں"
شکر لے آؤ	کی جگہ	"شکر لالیئو"
آپ بھی چلیں	کی جگہ	"آپ بھی چلو"
چوٹ لگی ہے	کی جگہ	"مار لگا ہے"

اب دکن کی دفتری اور ادبی اُردو ملاحظہ ہو

نام کتاب	صفحہ	صرف نمونہ اور کیفیت۔
دیباچہ سرکاری رپورٹ دارالجذامین ۱۹۳۲ء سرکار نظام	۱	"۱۴۴ (جذامی) ازخود چلا گئے" (ہونا چاہئے چلے گئے۔)
درس فارسی	۷	"طلبا غلط تلفظ نکالنے کے عادی ہوجائیں گے" (یہ تلفظ نکالنا کون سا محاورہ ہے تلفظ نکالا نہیں جاتا بلکہ کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ابوالحسن صاحب فاضل مدرسہ عثمانیہ کی لکھی ہوئی ہے جو داخل درس ہے)
درس فارسی	۸	"قواعد علیحدہ نہ پڑھائی جائے" (ہونا چاہئے۔ پڑھائے جائیں ورنہ لفظ قواعد سے پہلے کتاب ہونا چاہئے تب پڑھائی جائے ٹھیک ہوسکتا ہے)

نام کتاب	صفحہ	حرف منونہ اور کیفیت
رسالہ اتالیق جلد ۱۶ عـ۸	صفحہ ۹ سطر ۳	"لونگ زیادہ تر اچار چٹنیوں مربوں اور قسم قسم کی مٹھائیوں اور کھانے کی دوسری چیزوں میں استعمال کئے جاتے ہیں" حالانکہ "استعمال کی جاتی ہے" ہونا چاہئے۔
رسالہ اتالیق جلد ۱۶ عـ۸	صفحہ ۱۱ سطر ۶	"اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ بجے کرنا شروع کیا" (حالانکہ اس طرح ہونا چاہئے "بجے کرنا شروع کئے")
رسالہ اتالیق جلد ۱۶ عـ۹	صفحہ ۴ سطر ۱۳	"خدا مجھکو سنبھال لیا" (حالانکہ فقرہ اسطرح ہونا چاہئے کہ خدا نے مجھکو سنبھال لیا۔)
التقدیر	۴ سطر ۹	"اس قول کا صحیح معنی یہ ہے" یہ جملہ اس طرح ہونا چاہئے ۔ اس قول کے صحیح معنی یہ ہیں تب اُردو صحیح ہو سکتی ہے۔
التقدیر	صفحہ ۴ سطر ۸	"آپ تو ضرور ایمانا و اعتقادا مجسٹریٹ کے پاس استغاثہ کروگے" لفظ آپ کے ساتھ کروگے نہیں ہونا چاہئے کریں گے ہونا چاہئے۔
التقدیر	صفحہ ۷ سطر ۱۴	"مشیت کی لفظ" (مشیت کا لفظ ہونا چاہئے) لفظ مذکر ہے دیکھو نور اللغات۔
التقدیر	صفحہ ۱۲۹ سطر ۹	"محسوس کرلے سکتا ہے" (کر سکتا ہے کافی ہے۔ لفظ لے زائد ہے)
التقدیر	صفحہ ۲۷ سطر ۱۳	درختوں کا بیان کرتے کرتے لکھا ہے "ٹھکرا کر کونڈے توڑ دیتے" دکن میں گملے کو۔ کونڈے کہا جاتا ہے حالانکہ گملے محاورے میں داخل ہے حضرت اکبر الہ آبادی ؎ گملے دیکھے پارک کے گملے
التقدیر	صفحہ سطر ۵-۶	"تم تمہارے گھوڑے کو" (تم اپنے گھوڑے کو۔ ہونا چاہئے)
ظہور کعبہ اسلام	صفحہ ۳ سطر ۱۴	"تشفی کر لی جا سکتی ہے" (کی جا سکتی ہے۔ ہونا چاہئے)
ظہور کعبہ اسلام	ج سطر ۱۴	"اسلام کے تین شق ہیں" یہ فقرہ محاورے کے خلاف ہے شق مونث ہے اور اُردو میں شقیں اسکی جمع آتی ہے اس لحاظ سے صحیح فقرہ یہ ہوگا "اسلام کی تین شقیں ہیں" (شق مونث ہے دیکھو نور اللغات)
ظہور کعبہ اسلام	صفحہ ۲	"رسول مقبولؐ نے کیا تعلیم دیا ہے" (لفظ تعلیم مونث ہے اس لئے تعلیم دی ہونا چاہئے۔) تعلیم مونث ہے دیکھو نور اللغات۔
ظہور کعبہ اسلام	صفحہ ۷	"فریضہ سمجھ کر رکھا ہے" (سمجھ رکھا ہے۔ ہونا چاہئے۔)
ظہور کعبہ اسلام	صفحہ ۵	"سرگرم علاج ہوئے" (سرگرم علاج ہو رہے ہیں ہونا چاہئے)
ظہور کعبہ اسلام	صفحہ ۴	"معمولی ورق گردانی کرکر" (یہاں کرکے ہونا چاہئے)

نام کتاب	صفحہ	صرف نمونہ اور کیفیت
ظہور کعبہ اسلام	سطر ۱۶	"خانہ کعبہ کے اندر دعا کیا" خانہ کعبہ کیا معنی خانہ خدا ہونا چاہئے یا صرف کعبہ اور دوسرا نقص ہے اس لئے دعا کی ہونا چاہئے۔
اُردوئے قدیم	۱۰۲ سطر ۹	اگرچیکہ - صرف - اگرچہ ہونا چاہئے۔
″	۱۱۰ سطر ۳	پہلا قسم - پہلی قسم ہونا چاہئے۔
″	۱۱۰ سطر ۱۴	دوسرا قسم - دوسری قسم ہونا چاہئے۔
″	۱۱۱ سطر ۱	تیسرا قسم - تیسری قسم ہونا چاہئے۔
″	۱۱۱ سطر ۴	چوتھا قسم - چوتھی قسم ہونا چاہئے۔
رسالہ عالمگیر اکتوبر ۱۹۳۱ء	صفحہ ۵	مضمون جناب ناکارہ حیدرآبادی "جیسا کو تیسا" حالانکہ "جیسے کو تیسا" ہونا چاہئے۔ زمانہ حال کا محاورہ یہی ہے۔
رسالہ عالمگیر اکتوبر ۱۹۳۱ء	صفحہ ۵	"اسکو مرغی کہتے ہیں انڈے دیتی ہے سینکتی ہے تو بچے نکل آتے ہیں" حالانکہ سینکتی محاورہ نہیں ہے، بلکہ سیتی محاورہ ہے انشا۔ عقبیٰ کی بھی کچھ فکر ہے انسان کو لازم نہ مرغی کی طرح بیٹھ کے انڈے ہی سیتو
رسالہ عالمگیر اکتوبر ۱۹۳۱ء	صفحہ ۵	"میں نے کہا آج ورنہ کل ورنہ پرسوں" خلاف محاورہ ہے دو جگہ ورنہ کی کیا ضرورت ہے۔ فقرہ اس طرح ہونا چاہئے۔ آج یا کل ورنہ پرسوں۔
دیوان مائل صاحب دکھنی (جنہوں نے شمالی ہند کے مشہور	صفحہ ۱۵ سطر آخر	مائل کہاں تھے رات کو بیڑے کہاں چکھے ٭ ہونٹوں پہ آپ کے ہے جو لاکھا جما ہوا! "بیڑے چکھنا" غلط محاورہ ہے۔
شعرا میر ذوق داغ مومن خصوصاً غالب علی کل غالب کی بھی غزلوں کا جواب لکھا ہے۔)	صفحہ ۴ سطر ۳	میں تری چال کے فدا چل کے مجھے بتا کریوں۔ چال بتائی نہیں جاتی دکھائی جاتی ہے۔ بتانا شطرنج کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔
″	صفحہ ۶۱ سطر ۱	"بوسے کا نشان تو نہیں پھر منہ پہ یہ کیا ہے۔ دیکھو آئینے میں شرم سے۔ خود عکس گڑا ہے" عکس پڑتا ہے۔ گڑتا نہیں۔ نشان اور چیز ہے عکس اور چیز پھر بوسہ کے لئے عکس کیا معنی؟
″	صفحہ ۸۰ سطر ۵	"دلِ حزیں توڑتا ہے پہلو پلنگ پر سے گرا گرا کر" "پہلو توڑنا" بھی کیا محاورہ ہے؟ "پلنگ سے" کہنا کافی تھا "پر" کی ضرورت نہ تھی۔ نور اللغات میں پہلو توڑنا کوئی محاورہ نہیں ہے
″	صفحہ ۱۱۷ سطر ۵	عجب پازیب زرگر نے گھڑی ہے۔ فصیح محاورہ گڑھنا ہے۔ دیکھئے مضمون حضرت سیماب اکبرآبادی (رسالہ شاعر)

یہ بعض مختصے نمونہ از خروارے ہے اگر ہم گہری نظر ڈالیں تو اسی قسم کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ چونکہ دکن نے زبان کی طرف عرصہ کے بعد توجہ کی ہے اس لئے جب دکن ترقی کے لئے قدم اُٹھائے گا تو شمالی ہند ہمیشہ چار قدم آگے ہی نظر آئیگا۔

اگر دکن سے اُردو کی ابتدا ہوئی ہوتی تو کیا اتنا عرصہ گذر جانے پر دکن کی زبان منج نہ گئی ہوتی۔ ہمارے دکنی بھائیوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ان کو خدا نے ایسا علم دوست حکمراں عطا فرمایا ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ درحقیقت یہ اعلیٰحضرت حضور پرنور میر عثمان علی خاں بہادر کا بڑا احسان، انصاف پسندی، دریادلی اور قدردانی ہے کہ انہوں نے شمالی ہند کے چنے ہوئے استادوں کو زبان وغیرہ کی درستی کے لئے دکن بلایا اور ترقی اُردو میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا خدا ہمارے اسلامی بادشاہ کی عمر اور اقبال میں روز افزوں ترقی دے ہمارا مشورہ ہے کہ ہمارے دکنی بھائی اس بہترین زمانے سے کافی طور پر فائدہ اُٹھائیں اور اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

ناچیز:-
(دَرد کاکوروی)

نگاہِ مایوس

جناب مرزا ابراہیم بیگ صاحب ثمر رحمانی

نہیں کہ مجھ پہ کرم نہیں ہے اگرچہ ٹھہری ہے امتحاں کی
یہ التفاتِ ستم نما ہے یہ مہربانی ہے مہرباں کی

نگاہیں کرتی ہیں برق پاشی جفائیں کیا کیا ہیں باغباں کی
مثالِ خرمن ہو اپنی ہستی نہیں ہے اب خیر آشیاں کی

یہ رازِ غم ہے کہ شوخیاں ہیں ہماری مژگانِ خونچکاں کی
جگر کا قصہ سنا رہی ہیں کہ داستاں قلبِ ناتواں کی

عجب یہ اپنی بھی گردشیں ہیں بشکل پرکار کاوشیں ہیں
تلاشِ منزل میں کیا بتائیں کہ خاک چھانی کہاں کہاں کی

وہاں ہے تاکید دمبدم یہ کہ صبر سے کام لیتے جاؤ
یہاں یہ ناطاقتی ہے اپنی سکت ہی باقی نہیں فغاں کی

کیا ہے برباد جس نے یارب رہے سلامت وہ تاقیامت
ہزار جانیں نثار اس پر کہ جانِ جاں ہے وہ دو جہاں کی

تلاش کرتے ہو جس کو تم اب وہ مٹنے والا تو مٹ چکا ہے
تمہاری غفلت نے جس کو کھویا وہی نشانی ہے بے نشاں کی

بتائیں کیا ہمنشیں حقیقت کہ رات گذری ہے کیا مصیبت
کشاکشِ غم کا تھا یہ عالم کہ تھی اک مرگِ ناگہاں کی

وفورِ غم سے ہے اب یہ عالم کہ ہوش پہروں نہیں ہے تا کہ
ملی بھی فرصت جو بیخودی سے تو غمزدہ نے وہیں فغاں کی

بس اب نہ پوچھو مری حقیقت یہ اشک ریزی ہے شرحِ اُلفت
نگاہِ مایوس کہہ رہی ہے کہ داستاں ہوں میں بے زباں کی

ثمر کی حالت نہ پوچھئے کچھ کہ کس مپرسی ہے اور وہ ہے
زمین دشمن، زمانہ بدظن، یہ مہربانی ہے آسماں کی

{ ثمر رحمانی دھنگوی

رباعی

حضرت آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

وحدت ہی میں تنہا نہیں شاہی تیری
کثرت میں بھی ہے نیم نگاہی تیری
ذرّے نہیں اُڑتے ہیں سُوئے مہر مُبیں
انگشتِ غُبار ہے گواہی تیری

۲

باطن میں تو ہر سانس کا دمساز ہے تو
کُھلتا نہیں ظاہر میں عجب راز ہے تو
اے کاش دمِ جرم کوئی پہچانے
جو دِل سے نکلتی ہے وہ آواز ہے تو

ڈاکٹر

از جناب مولانا شبیر حسین صاحب مارہروی

ایک ڈاکٹر کے لئے جو سرجری اور طب میں خاص شغف رکھتا ہو، عشق و محبت ایک بے معنی بات ہے کیونکہ محبت ایک مجنونانہ لیکن عارضی جذبہ ہے، حسن اس پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ اس کے آلات نشگاف و سرجری خوبرو و بدرو دونوں کے جسم پر یکساں چلتے ہیں۔ آنسو اسے موم بنانے کے لئے کوئی کارگر آلہ نہیں۔ موت اس کے لئے کوئی خصوصیت نہیں رکھتی کہ اس نیلی بوتل کی ایک تیز خوراک ہمہ وقت قریب رہتی ہے۔ ہر بات کے لئے اس کے پاس مجربات موجود ہیں۔ اس کی جیبیں گولیوں سے بھری ہوتی ہیں اور وہ اتنے آپریشن کرتا ہے کہ گویا وہ ابھی میدانِ جنگ سے لوٹنے والا مردِ میدان سپاہی ہے۔ غرض وہ ہمہ اوقات معروفِ عمل رہتا ہے اور اسے اتنا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس میں محبت کا مجنونانہ جذبہ پیدا ہو سکے۔

پچھلے دنوں ایک روز میرا پڑوسی چند پیسوں پر ایک قلی سے جھگڑ جھگڑ کر شور مچا رہا تھا میں نے اسے اندر بلایا اور اسے بیمار بنا کر اس کا علاج شروع کیا۔ اس علاج سے اسے خاطر خواہ نفع ہوا کیونکہ آج ایسا ہی واقعہ ہوا تو اس نے قلی کو ۱۰ روپے دے کر کہا "یہ بہت کافی ہے" اور گھر میں چلا گیا۔

ایک دن میرے ایک کانگرسی دوست نے سیاسیات کی ایک ناخوشگوار خوراک مجھے پلانی چاہی۔ اس کے جواب میں میں نے عرض کیا آپ اور آپ جیسے اور لوگ میرے کونین مکسچر کی ایک ایک خوراک پی لیں تو آئندہ آپ یہ سب کچھ بھول جائینگے جو اسی وقت آپ الاپتے پھرتے ہیں۔"

انہوں نے کہا "ایسے بے حسوں سے مجھے اب مزید گفتگو کی ضرورت نہیں" غرض ایسے مواقع پر میری میٹر یا میڈیکا اکثر کامیاب نشتر کا کام دیتی ہے۔

اپنے شناساؤں میں میں بدشکل نہ سمجھا جاتا تھا لیکن مجھے اس پر غور کرنے کی کبھی مہلت ہی نہ ملی تاوقتیکہ اسی کی بدولت میں ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ گو یہ مصیبت میرے سر پر پڑ چکی ہے لیکن اب بھی حیرت میں ہوں کہ صوبہ متحدہ کا ایک گندمی رنگ کا فیشن سے کوسوں دور انسان ہندوستان کے سب سے زیادہ حسین گھرانے کی ایک فیشن ایبل خاتون کو اپنی جانب کیوں کر متوجہ کر سکا۔ مگر واقعات کو کیا کیا جائے میری اسی روکھی پھیکی صورت نے ایک خاتون کو میری محبت کے دام میں گرفتار کر دیا اور وہ مجھے میری معصوم بیوی سے چھین لینا چاہتی تھی۔

میری عمر تیس سال کی تھی اور میری شادی ہوئے کئی

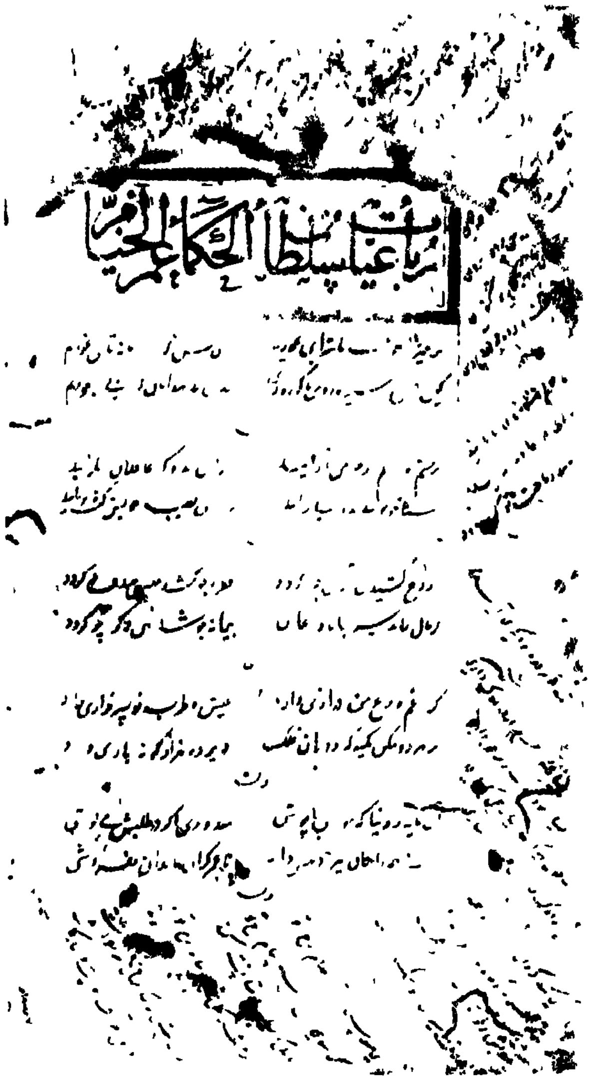
سال ہو چکے تھے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر میں آرام کرسی پر لیٹا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں چند دلچسپ راز ہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی اپنے پورے زور کے ساتھ بجی۔ ایک صاحب فرما رہے تھے۔ "میری لڑکی یکایک سخت علیل ہو گئی ہے۔ وہ آپ کا علاج کرانا چاہتی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو خود اپنا موٹر لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں"۔ میں نے اجازت دیدی اور تھوڑی دیر میں ایک اعلیٰ درجہ کی موٹر آگئی جس میں ایک ادھیڑ عمر کے فیشن ایبل جنٹلمین تشریف لائے۔

کہا جاتا ہے کہ چیل کے بازو میں ایک آئینہ لگا ہوتا ہے جس سے وہ زمین پر پڑے ہوئے مردہ جانوروں کو دیکھ سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستانی خواتین کے بھی کسی نہ کسی جگہ آئینہ لگا ہوتا ہے جس میں وہ اپنے محبوب خاوندوں پر آنے والی مصیبت قبل از وقت دیکھ لیتی ہیں یا یوں کہئے کہ ان کی حس غیر معلوم طریقہ پر اسے آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیتی ہے۔ میں اپنی شیروانی پہن رہا تھا کہ کسی نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا میں نے چونک کر دیکھا تو میری بیوی تھی۔ میری نشست کا ایک دروازہ زنانخانہ میں بھی تھا لیکن میری بیوی کبھی یہاں آنے کی عادی نہ تھی اس لئے میں نے متعجب ہو کر یہاں آنے کا سبب پوچھا۔ جواب ملا "دیکھنے آئی تھی کہ سب خیریت تو ہے"۔ مجھے اور زیادہ تعجب ہوا۔ میری بیوی کوئی آئیڈیل خاتون نہیں جن کا ڈراموں اور ناولوں میں ذکر آتا رہتا ہے۔ یعنی وہ خواتین جو کبھی اپنے خاوندوں سے ناراض نہیں ہوتیں برخلاف اس کے میرے اور میری بیوی کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکر رنجی ہو جاتی ہے۔ میرا تو مقولہ ہے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی شکر رنجیوں نے مجھے اور میری بیوی کو ناقابل فہم طریقہ پر کچھ زیادہ ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس کی خانگی زندگی میں یہ شکر رنجیاں نہ ہوں وہ یا تو مقدس دیوتاؤں کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے دماغ میں کوئی خرابی یقینی ہوتی ہے۔ میری رائے میں گھر کی چار دیواری کے اندر اٹھنے والے یہ چھوٹے چھوٹے طوفان انسانی زندگی میں ایک ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔ کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ بہرحال طوفان آتا ہے اور اپنی حدود کے اندر اپنی پوری قوت کے ساتھ آتا ہے لیکن جب میں آہستگی کے ساتھ اس کے پاس جا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اور اپنا منہ اس کے اتنے قریب لے جا کر کہ میرا سانس اس کے رخساروں سے جا کر اٹھکھیلیاں کر سکے اس کے کان میں محبت کا ایک کلمہ پھونکتا ہوں تو طوفان کا تمام زور و شور ختم ہو جاتا ہے۔

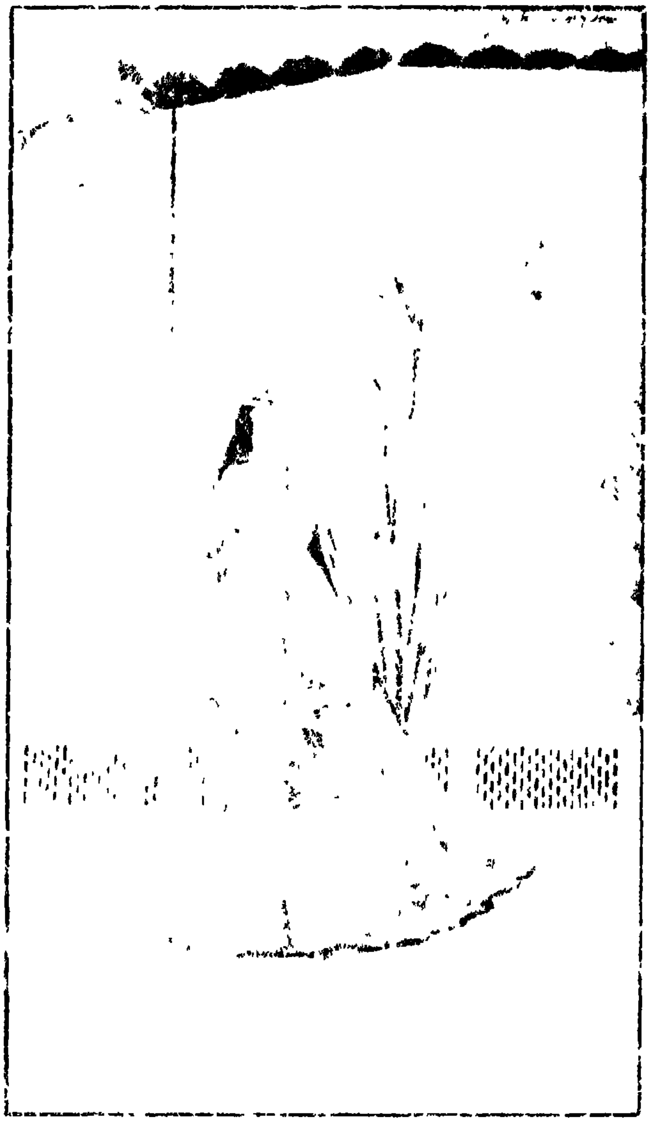
قصہ مختصر اسکا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس نے کانپتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا "میں نے ایک خواب دیکھا ہے آج تم کہیں نہ جاؤ"۔

میں:۔ "خدا کی پناہ! یہ عورتیں بھی خواب دیکھنے سے کبھی نہیں تھکتیں۔ اچھا ٹھہرو ...... تمہیں کچھ بدہضمی کی شکایت معلوم ہوتی ہے ......"

میں نے ایک بوتل سے چند گولیاں نکال کر اس کے منہ میں ڈالنا چاہیں لیکن اس نے قطعاً انکار کر دیا۔ مجبوراً میں نے اسکا سر اپنے سینہ سے لگا کر اسکے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں کیوں نہ جاؤں؟ میں سسرال کے وطن کو نہیں جا رہا ہوں نہ میں اوڈائر سا ایمن یا ونسٹن کے جنم بھوم میں قدم رکھنا چاہتا ہوں اور نہ افریقہ کا قصد کر رہا ہوں۔ ایک صاحب اپنا موٹر لے کر آئے ہیں۔ ان کی لڑکی بہت بیمار ہے۔ جسے میری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر نہ جاؤں تو یہ اپنے پیشہ کے لئے نہایت بدنما بات ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہیں عمل کے


رباعیات سلطان الحکما عمر الخیام

رباعیات عمر خیام [illegible] نسخے کا ایک ورق



بعد مریض کے پاس آنا بند کر دیں اور میرا نام ہی طبی دنیا سے بالکل خارج ہو جائے۔ اچھا دیکھو میں پونے نو بجے یا اس سے پیشتر ہی واپس آجاؤں گا"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور میں نے دوبارہ اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——

"ہمت والی بیوی بنو اور مجھے جانے دو"

اس نے مجھے چھوڑ دیا اور میں تیزی سے باہر نکل گیا

راستہ میں میں نے ان مرد بزرگ سے ان کی لڑکی کی علالت کے متعلق کچھ سوالات کئے لیکن انہوں نے کوئی شافی جواب نہ دیا۔

موٹر گلی در گلی ہوتی ہوئی ایک پختہ مکان کے سامنے جاکر رکی جو بظاہر بہت پرانا اور مرمت طلب معلوم ہوتا تھا اس کے چاروں جانب اینٹ اور پتھر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مکان اندر سے کافی وسیع تھا لیکن سنسان نظر آتا تھا۔ بیشتر کمرے بند پڑے ہوئے تھے

مجھے خیال ہوا کہ شاید شوفر نے غلطی سے ایسے مقام پر لے آیا ہے۔ بمشکل یقین آتا تھا کہ ایسی قیمتی کار کا مالک ایسے اجڑے دیار میں رہنا پسند کرتا ہوگا لیکن ایک طبیب کو ان ظاہری معاملات سے کیا سروکار؟ میں تیسری منزل پر ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں بہت قسم کا سامانِ آرائش تھا ایک چھوٹی سی الماری میں، جو میز پر رکھی ہوئی تھی چند درجن کتابیں رکھی تھیں میز کے دونوں جانب ٹیلیفون نظر آتے تھے تیل سے چلنے والا ایک پنکھا بھی رکھا ہوا تھا۔

ضعیف العمر نے ایک تنومند نوجوان کو میری معیت میں چھوڑ کر مجھ سے کہا "چند منٹ کے لئے معافی چاہتا ہوں،" اور چلا گیا۔ میں نے اس نوجوان کو ایک طالب علم سمجھا جو غالباً تعطیلات میں یہاں آیا ہوا تھا موجودہ مکان، کمرے کی سادہ آرائش، نوجوان کی طالب علمانہ مشابہت اور قیمتی کار نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ لوگ محض یہاں تبدیل آب و ہوا کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے نوجوان سے لڑکی کی علالت کے متعلق کچھ سوالات کئے جس کے جواب میں اس نے کہا یہ ایک معمّا ہو کر رہ گیا ہے اور اب تک کوئی ڈاکٹر مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر سکا"

میں:۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد اچھے اطبا نے بھی مریضہ کو دیکھا ہے۔ غالباً مرض نے ناگوار صورت اختیار کرلی ہے"

نوجوان:۔" بالکل درست لیکن میرا خیال ہے کہ ہم نے ایک ایسا طبیب پالیا ہے جس سے اس کی تمام مشکلات رفع ہو سکیں گی"

میں:۔ جناب یہ آپ کا حسن ظن ہے جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں"

نوجوان:۔" اب مریضہ بھی آتی ہوگی"

یہ کہتے ہوئے اس نے میز کی دراز سے کوئی چیز نکالی اور قبل اس کے کہ میں شبہ کر سکوں وہ دروازہ میں تالا لگا کر باہر چلا گیا

میں اس طرز عمل سے کچھ سراسیمہ سا ہو گیا۔ میرا اسٹیتھس کوپ میرے گلے میں لٹک رہا تھا اور میں اس غیر متوقع عمل پر ایک عجب کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید میں دیوانوں کے کسی گروہ میں پھنس گیا ہوں۔

تھوڑی دیر میں کسی نے دروازہ کھولا اور وہی ضعیف العمر نے آکر مجھ سے اس تاخیر کی معافی چاہی اور میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی تہذیب اور خوش اخلاقی نے میرے تمام شکوک رفع کر دیے۔ طبیب اکثر نہایت پیچیدہ اور

تحقیف وہ حالات میں سے گزرتا ہے اور میں اسے کوئی غیر معمولی واقعہ نہ سمجھا۔

میں نے پوچھا "مریضہ کہاں ہے؟"

ضعیف العمر "وہ جلد یا بدیر آہی جائے گی"

مجھے یہ جواب ایک گونہ ناگوار معلوم ہوا لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اس نے کہا "اسی سلسلہ میں یہ دریافت کرنا عجیب نہ ہوگا کہ آج کل تو آپ خوب دولت کما رہے ہیں"

یہ کہہ کر اس نے اپنی سیدھی جیب سے ایک رومال اور الٹی جیب سے ایک روالور نکالا اور اسے رومال سے صاف کرنے لگا پھر اس نے اسے کھولا غالبًا یہ دکھلانے کے لئے کہ وہ بھرا ہوا تھا۔ مجھے فورًا شبہ ہوا کہ وہ میری طبی امداد کا نہیں بلکہ میری دولت کا ضرورت مند ہے۔ میں نے کہا "ہاں میں اتنی دولت جمع کر رہا ہوں جو آپ کے قیاس میں بھی نہیں آسکتی"

اس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کہا "اگر ایسا ہے تو براہِ کرم میری مالی امداد کیجئے۔ صرف پانچ ہزار..... لیکن نہیں اتنے معقول مجھے نہیں معلوم ہوتے۔ اچھا ۵۵۵۵ سہی"

اس نے ایک فاؤنٹین پن اور کاغذ ہاتھ میں لے کر کہا "یہ رقم زیادہ نہیں ہے اور میرے لئے مہینوں کو کافی ہوگی۔ اب میں آپ سے کچھ املا لکھوانا چاہتا ہوں"

تیق نے کچھ توقف کے بعد ہنس کر کہا "معلوم نہیں آپ کے پاس اسلحہ کا لائسنس ہے یا نہیں"

اس نے روالور کا منہ میری جانب کر کے کہا "اچھا لکھو"

مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا جب ہمارا استاد ہم سے املا لکھواتا اور ہر غلطی پر دو بید رسید کرتا تھا میں نے بے چون وچرا اس کے ہاتھ سے کاغذ وقلم لے کر اس کے حسب ہدایت یہ عبارت لکھ دی

"میں خطرہ میں ہوں فورًا ۵۵۵۵ روپیہ بھیجدو"

اس نے کہا "شاباش! اب باقی کام میں خود کروں گا۔ فون پر آوازیں تو ایک سی ہی معلوم ہوتی ہیں" یہ کہہ کر اس نے فون پر کہنا شروع کیا "میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ ایک آدمی ابھی تمہارے یہاں آئے گا۔ اس کے ہاتھ ۵۵۵۵ روپیہ بھیجدو...... خدا کے لئے دیر نہ کرنا..... ہاں..... حماقت مت کرو..... روپیہ فورًا بھیجو......"

اس نے غصہ سے فون پٹک دیا اور "کھیل ختم ہونے سے قبل اس کمبخت عورت کو دیکھ لیا جائے گا"

خدا معلوم اس میں واقعیت تھی یا میں خواب دیکھ رہا تھا میں نے جو کچھ جمع کیا تھا وہ میری دن رات کی محنت کا انعام تھا۔ اور یہ ظالم مجھے لوٹنے کی فکر میں تھا ہی نہیں بلکہ میری زندگی کی آخری راحت کے بھی پیچھے پڑا ہوا تھا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی بدنصیبی ہوسکتی ہے؟ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اٹھا اور اس بدمعاش کی گردن پکڑ کر میں نے روالور اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا لیکن اس کے پاؤں آزاد تھے۔ اس نے پاؤں فورًا اوپر اٹھا کر دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ گھنٹی کی آواز ہوئی۔ میں ابھی اس کا مطلب بھی نہ سمجھ پایا تھا کہ دو آدمی اور کمرہ میں گھس آئے۔ میں نے مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان تینوں نے مل کر مجھے ایک آرام کرسی پر ڈال کر لنگی سے میرے ہاتھ پاؤں کس دئیے اور ایک کشمیری شال ڈال دیا۔ اب میں تپ لرزہ کے مریض کی طرح کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ میرا صرف چہرہ کھلا ہوا تھا۔ بوڑھے نے میری جانب دیکھ کر کہا "اگر میرا بس چلتا تو میں ابھی تمہارا خاتمہ کر دیتا۔ بہرحال اب تمہیں محض اس لئے زندہ رہنا ہے کہ تم اپنی شریر بیوی کا بھی حشر دیکھ لو"

تینوں بدمعاش باہر چلے گئے اور تنہائی میں مختلف قسم کے خیالات
پے در پے میرے دماغ میں آنے لگے۔ میری بیوی نے خطرہ سے
مجھے آگاہ کیا تھا۔ کاش میں اس کا کہنا مان لیتا۔ بڑھے نے
غالباً فون پر میری بیوی سے بات چیت کی تھی نہیں معلوم اس نے
کیا جواب دیا تھا۔ غالباً وہ روپیہ دینے پر رضامند نہ تھی۔ ممکن
ہے کہ اس نے اس واقع کی اطلاع پولیس کو بھی کر دی ہو اور جب
کوئی روپیہ لینے جاتے تو اس کی خاطر خواہ تواضع ہو لیکن عورتوں
کی سرشت بھی عجیب وغریب ہوتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا کر گئی
میں ایسے ہی خیالات میں منہمک تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک
نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی نہایت حسین بست سالہ خاتون
کمرے میں داخل ہوئی کاش اس کا باطن بھی اس کے ظاہر کے
مطابق حسین ہوتا۔ یہ غالباً اس بدمعاش کی لڑکی تھی جس کے
علاج کے لئے میں یہاں لایا گیا تھا لیکن اس کے چہرہ سے
بجز اضمحلال کے اور کوئی علامت نہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ میرے
قریب آئی میرے اوپر سے شال اٹھایا اور میری بندشوں
کو دیکھ کر خدا معلوم کیوں ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی
میں نے بدقت اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھ سکا اور پڑے
پڑے اس کا حسین چہرہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش
آیا اور میز پر سے چاقو اٹھا کر میری تمام بندشیں کاٹ ڈالیں
میں نے آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے فون پر اپنی بیوی سے کچھ
بات کرنی چاہی لیکن معلوم ہوا کہ اس کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔
بہرحال میں مایوس ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دنیا کی یہ حسین
ترین مخلوق بھی میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔
"آپ کے والد اور بھائیوں نے جس شاندار طریقہ پر میری مہمانداری
کی اس کا شکریہ قبول فرمائیے"
اس نے کہا "کاش میرا باپ اس موقع پر میرے قدموں کے سکون
دینے کے لئے زندہ ہوتا" اور میری کرسی کے بازو پر اپنا سر رکھ کر
بے اختیار رونے لگی۔ مجھے اس کی اس بے تکلفی اور بے ساختگی پر
ایک گونہ تعجب ہوا تاہم خود کو قابو میں رکھ کر میں نے پوچھا "پھر وہ
کون ہے؟"
خاتون:۔ "ایک بدمعاش"
میں:۔ "اور دوسرے"
خاتون:۔ وہ بھی میرے بھائی نہیں بلکہ اس گروہ کے دوسرے
بدمعاش ہیں"
میں:۔ پھر میں ان کے ہاتھ کیسے لگا۔
خاتون:۔ میں بیمار تھی اور کسی نہ کسی کو آپ کے پاس بھیجنا ضروری تھا"
میں:۔ تو کیا آپ واقعی بیمار ہیں؟"
خاتون:۔ نہیں ...... مجھے دل کی بیماری ہے ہاں میں بیمار
...... ہوں"
اس عمر کی حسین لڑکی کیا بیمار ہو سکتی ہے؟ میں کچھ سمجھا۔ اگر وہ بیمار
تھی تو ایسی عورت یقیناً بے ضرر چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے کستیلہ
المئینان کے لہجہ میں کہا "عشق و محبت دماغی بیماری ہے۔ میں آپ
کو نسخہ دونگا۔ یہ شکایت جاتی رہے گی"
اس نے کہا "مذاق نہ کیجئے"
میں:۔ "نہیں، مذاق نہیں کرتا۔ اس نسخہ سے آپ کو یقیناً
نفع ہوگا"
وہ:۔ "آپ بڑے بے رحم ہیں۔ میں نے انتظار کی گھڑیاں بڑی
بے چینی سے گذاری ہیں۔ اور اب مزید انتظار ناقابل برداشت ہے"
میں:۔ "انتظار، کس کا انتظار؟"
وہ:۔ "میں تمہیں بتاؤں گی۔ میں اقبال کرتی ہوں کہ میں .....
ہوں۔ زمانہ قدیم سے تو اکی اولاد حسن کا تعاقب کرتی آئی ہے"
وہ:۔ "حسن کو اکثر اپنی خبر نہیں ہوتی"

اب میں سمجھا کہ وہ مجھ سے اپنی محبت جتانا چاہتی تھی لیکن صاف الفاظ میں اسکا اظہار نہ کر سکتی تھی میں نے کہا "اور وہ پانچ ہزار غالباً رسوم شادی کے لئے طلب کئے جا رہے ہیں"

وہ :- "میں آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں"

میں :- "آپ اسکا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن آپ کے والد بزرگوار یا وہ جو کوئی بھی ہوں اسکا مطلب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ جب پولیس کے آدھی درجن آدمی آکر ایک امن پسند شہری کو اپنی حفاظت میں لے کر اسے خطرہ سے بچائیں گے۔ کیوں کہ اس امن پسند شہری نے اپنی دولت لاٹری یا ریس سے نہیں بلکہ اپنی قوت بازو سے پیدا کی ہے"

وہ :- "اچھا تو یہ واقعہ تھا۔ لیکن انہیں تو اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔ ان کی خدمات ڈاکٹر کے یہاں آتے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ بہرحال اسکا تدارک کیا جا سکتا ہے (اپنی پوشاک کے اندر سے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے) پانچ ہزار کی بجائے دس ہزار کی رقم لیجئے۔ کاش اس قیمت پر مجھے میری مسرتیں واپس مل سکیں"

میں ایک گونہ سراسیمہ ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ میں اپنے دل میں یہ روپیہ لینے یا نہ لینے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ مجھے مفت کے روپیہ کی ضرورت نہ تھی۔ ابھی میری عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ ابھی ترقی کا وسیع میدان میرے سامنے ہے اور میں اس سے دس گنی دولت کما سکتا ہوں۔ مجھے تعجب اس پر تھا کہ اس عجیب و غریب حسین مخلوق کے لئے روپیہ بچوں کا کھیل معلوم ہو رہا تھا۔ اور مجھے افسوس محسوس ہونے لگا تھا کہ جو بدمعاشی میرے ساتھ کی گئی تھی اسکا غالباً اس خاتون سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے نوٹوں کی گڈی میرے سامنے ڈال کر کہا "میں کئی سال سے اس مصیبت میں گرفتار ہوں ..... بہرحال اب مجھے اپنا راز ظاہر ہی کرنا پڑے گا میں نے تمہارے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ میڈیکل کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد میں تم نے میرے معمول کو مسل ڈالا اور میں اتنی مدت تک بے شمار توقعات کے ساتھ خوش آیند خواب دیکھتی رہی ..... کاش میں نے اس روز تمہیں نہ دیکھا ہوتا ....."

اس کی آواز میں پھر لرزش پیدا ہوئی اور قریب تھا کہ وہ پھر بے ہوش ہو جاتی۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ جلد بے قابو ہو کر میرے ساتھ کرسی پر گر پڑی اسکا سر میرے سینے سے لگا ہوا تھا اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیوں کر اسے ہوش میں لاؤں۔ میں نے اسکے رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور اپنا رومال نکال کر اس کے چہرے کو ہوا دینے لگا۔ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آیا اور بے اختیارانہ جوش کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ میری گردن میں حمائل کر کے اس نے والہانہ انداز سے کہا "وعدہ کرو کہ ...."

"کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے علیحدہ کرتے ہوئے کہا — "تیر کمان سے نکل چکا۔ اب میں بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔ اور میں نواب یا مہاراجہ بننے کی جرأت نہیں کر سکتا"

وہ :- "ایسا نہ کہو"

میں :- "دروازہ کھلا ہوا ہے دیکھو یہاں کوئی آنہ جائے"

سچ ہے ایک بیمار محبت خاتون بھی اپنی بدنامی سے خائف رہتی ہے۔ وہ فوراً کواڑ بند کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ میں نے کہا۔ "اب مجھے جانے دو۔ مریض میرے منتظر ہونگے"

مجھے خیال آیا کہ میری بیوی اسوقت خطرہ میں تھی اور مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہئے لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

وہ :- "اچھا وعدہ کرو کہ تم پھر مجھ سے ملوگے"

میں ۔ میں کیسے وعدہ کرلوں ۔ دنیا سطح کو دیکھ کر رائے قائم کرتی ہے اور میں بدنامی سے ڈرتا ہوں"

اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر مجھے دیا جو غالباً اسکا نام و نشان ہوگا لیکن میں نے بغیر دیکھے اُسے اپنی جیب میں رکھ لیا ۔ اس نے کہا ۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو ۔ میں تمہاری منتظر رہونگی"

میں نے اس ملعون عمارت سے باہر آکر اطمینان کا سانس لیا ۔ سامنے کرایہ کا ایک موٹر آیا جس پر بیٹھ کر میں اپنے گھر پہنچا ۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا منتظر پایا ۔ میں نے اسے اپنے آغوش میں لے کر پوچھا "کہو کیسی گذری ؟"

اس نے کہا "تمہارے جانے کے کچھ عرصہ بعد فون پر تم نے مجھ سے روپیہ کی بابت کہا ۔ میں نے اپنے اطمینان کے لئے تم سے اپنا نام پوچھا لیکن جب مجھے میرا نام نہ بتایا جا سکا تو میں نے اسے دھوکہ سمجھ کر فوراً پولیس کو اطلاع کی ۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص موٹر میں تمہارا رقعہ لے کر آیا جسے پولیس نے فوراً گرفتار کرلیا اور اب پولیس تمہارے اور دوسرے بدمعاشوں کی فکر میں ہے"

دوسرے روز میں اس خاتون کے تحریری پتہ پر اس سے ملنے گیا ۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں نے اپنا کارڈ اندر بھیجا ۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آکر مجھے اندر لے گیا وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی بظاہر کچھ پڑھ رہی تھی ۔ میں اس کے پیچھے کرسی سے مل کر کھڑا ہوگیا لیکن اس نے میری جانب کچھ توجہ نہ کی لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی ۔ میں اس نظارہ سے بے حد متاثر ہو کر بے اختیار ہوگیا جس طرح نپولین نے جوزفائن کو طلاق دیتے وقت ایک نعرہ لگایا تھا میرے منہ سے بھی بے ساختہ ایک آہ نکل گئی اور اسی لمحہ میں وہ حسین خاتون میری گود میں تھی ۔

کوئی مجھے بار بار بلا رہا تھا ۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو میری بیوی*

* مجھے آغوش میں لئے ہوئے پوچھ رہی تھی "کیوں کیا بات ہے ؟"

یتیمی اور بیچارگی

(جناب سید محمد امیر حیدر صاحب کمال امروہی)

میں وہ بدبخت ہوں داغِ یتیمی ہے مرے دل پر
ہر اک رگ میں تنِ مجروح کی پیوست ہیں نشتر
بپا ہے حشر کا ہنگامہ فرطِ رنج و حرماں سے
نمودِ صبحِ محشر ہے مرے چاکِ گریباں سے
خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے اُف رے بیتابی
رگِ جاں میں ہے ہر برقِ تپش اندازِ سیمابی
مرے ہمسن مگن پھرتے ہیں عالم شاد ہوتا ہے
مگر میرا سکوں ناآشنا دل خون روتا ہے
مرا افلاس عریانی کو میری ڈھک نہیں سکتا
غبارِ راہ بچ جائے تو بنجائے لباس اپنا
غضب ہے آشنائے دردِ دل ملتا نہیں کوئی
یہ رونا ہے کہ آنسو پونچھنے والا نہیں کوئی

یتیمی اور پھر بیچارگی دہری اذیت ہے
قیامت پر قیامت ہے مصیبت پر مصیبت ہے

منوہر گیت

از جناب مقبول حسین صاحب احمد پوری بی۔اے

تن بیاکل من بھولا بسرا[1] بھری نین کی گاگریا[2]
شیام برن نے من موہن نے کیسی بجائی بانسریا[3]
جب سے آئی صدا سہانی
آدھی دنیا ہے دیوانی
پورب پچھم چھائے رہی ہے کاری کاری بادریا[4]
شیام برن نے من موہن نے کیسی بجائی بانسریا
بہتے بہتے گنگا رانی
بھولی اپنی چال پرانی
سج دھج ہے کیسی مستانی آج ہوئی کیوں باوریا[5]
شیام برن نے من موہن نے کیسی بجائی بانسریا
شیام کی مرلی دھن پہچانی
پھر سے پائی نئی جوانی
روپ یہ دھارن جن کے کارن کیا وہ آئے ناگریا[6]
شیام برن نے من موہن نے کیسی بجائی بانسریا

[1] بھولا بسرا یعنی نسیا منسیا بسرا معنی۔ Oblivious [2] گاگریا معنی گجلیا [3] بانسری [4] بدلی۔ گھٹا
[5] تمثیل Bawaria یعنی دیوانی [6] نگری۔ دلیش۔ وطن۔ (مقبول احمد پوری)

عید کا چاند

محترمہ سیّدہ اصغری بیگم صاحبہ

آ، اے ہلالِ عید آ ——— دُنیائے تاریک پر، نیرۂ فنا، اُفقِ عالم پر چمک، اور اسی شان سے، جس طرح تو کبھی اسلامی سلطنتوں کے آسمانِ عروج پر چمکا کرتا تھا ——— !

ہاں ضیا بیزی کی شان دکھا ——— کشورِ اسلام کے فدائیوں، توحید کے پرستاروں، وحدت کے جاں نثاروں کے سروں پر طلعت ریز ہو اور اسی آب و تاب سے، جیسا تو کبھی اسلامی دنیا، اسلامی فاتحین کے سروں پر ہوتا تھا —— !

ہاں جلوہ افگن ہو ——— اسی طرح، جس طرح کچھ صدیاں پیشتر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں قومی جاں بازوں، شیرانِ بیشۂ شجاعت، ننگے جسم اور برہنہ سینے پر دشمنوں کی برچھیاں کھانے والوں کے سروں پر نور کی بارشیں برسایا کرتا تھا —— !

اے عید کا پیام دینے .. والے آ جلد آ ——— لیکن اپنے قدیم دبدبہ و وقار کے ساتھ آ، دل ——— اہلِ اسلام کا دل، سوختہ و تفتیدہ اور بریاں دل ——— گذرے ہوئے وقت، مٹے ہوئے سرور، کھوئے ہوئے سکون، گئے ہوئے قرار کا ایک عرصۂ دراز سے ایک طویل مدت سے طلبگار ہے ——— آنکھیں آہ ——— سراپا انتظار آنکھیں، مسلمانوں کی مٹی ہوئی دولت و ثروت، سلطنت و حکومت، عظمت و شوکت، تہوّر و شجاعت، ہاں وہی قدیم شجاعت، جس نے قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان اور پرجلال و شکوہ سلطنتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ خاندانِ ہرقل کے آفتابِ عروج کو زوال کے گرہن میں گہنا دیا، دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں ——— !

نگاہیں، حق پرست و حقیقت آشنا نگاہیں، وہی گذری ہوئی بصارت افروزی کے جلووں، کرشموں، نظاروں کو طلب کر رہی ہیں ——— نہیں نہیں، آہ ——— نہیں! وہ ہمہ تن شوق دیدۂ دیدار طلب بن رہی ہیں ——— !

اس آرزو کو ہاں اے پیارے عید کے چاند! اس حسرتِ دیرینہ، اس تمنائے خوابیدہ کو ایک بار اور پوری کر، آہ ——— پوری کر ——— ! دیکھ تو سہی دنیا کے ——— اس ظلمت کدہ کے ناکنوں میں کسقدر کشمکش ہے، کسقدر ہیجان ہے کتنا نفاق ہے ——— !

آ اے محرابِ عبادت میں پیشانی خم کرنیوالے، آ ——— ان کے دلوں کو ——— خود غرض، نفس پرست اور مغرور دلوں کو وحدت ریز نور سے، اس نجات بیز تجلی سے پُر کر دے، آہ ——— معمور کر دے ——— ! پرستارانِ ظلمت کو، فدایانِ وحشت کو اور ہاں، باطل پرواز بے بصر کو

اپنی نور پاش شعاعوں کے طفیل، اپنی اس دل آویز و دلکش نورانی کرن کے صدقے، سیدھے راستے پر لگا دے ——— ایک بار اور، تمام عالم کو اپنے وحدت ریز نور کے حلقہ میں لے کر متحد کر دے ——— توحید کی زنجیر میں جکڑ دے ——— آہ! دکھا دے، بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم دکھا دے!!

اے اسلامی شان و شوکت کے علمبردار ———
تیرہ صدیاں گذر گئیں تو کیا ہوا، تیرہ لاکھ صدیاں بھی گذر جائیں تو تو ویسا ہی نور برسائے گا جیسا کہ عرب کے چٹیل بے آب اور خشک پہاڑوں پر لق و دق ریگستانی صحراؤں میں برساتا تھا۔ تیری نور افشاں شعاعوں میں سے گذرنے والی ہوائیں آج بھی ویسی ہی معطر و مطہر نہیں جیسی کہ اس وقت تھیں ———
اثر فوری ہاثر ——— اس قسم کی تاثیر کا جلوہ دکھا دے، جو باطن کو ——— سیہ کور اور بے حس باطن کو، زنگ آلود ملوث اور بہرہ از شیطنت ضمیر کو صیقل کر دے، پاک کر دے، بلکہ جگمگا دے!
آ اے منزل توحید کے سالک آ، اور توحید کا نعرہ لگاتا ہوا آ، ——— ! اسی شان و شوکت سے، اسی دیرینہ نازو انداز سے اہل اسلام کے کل احزان پر طلوع ہو، ان کے مردہ اور شکستہ دلوں میں ایک نئی روح پھونک دے، انہیں ماضی کی یاد دلا ——— بہادرانِ اسلام کے ہوش ربا کارنامے سنا ——— پرستارانِ توحید کی لرزہ خیز جانبازی کی داستانیں دہرا ——— سرفروشانِ راہ حق کے تحیر انگیز فتح و ظفر کے قصے بیان کر ——— طلبگارانِ حیات جاوید کے شاندار و پرہیبت واقعات کا اعادہ کر ——— ہاں، ہاں بیان کر خدا کے واسطے قصہ پارینہ بیان کر، ان کے پامال اور ڈوبتے ہوئے دلوں کو سہارا دے، ان کے دبے ہوئے جذبات میں طوفانی ہیجان پیدا کر دے کہ ان کے جسم کا سرد خون گرم ہو کر رگوں میں جلد جلد گردش کرنے لگے، ان کی روحیں تڑپ اٹھیں، اور وہ اپنے بھولے ہوئے فرض کو ادا کرنے کے لئے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جائیں!!

(سیدہ اصغری بیگم)

رباعیات

خوشبو سے مہکتا تھا جو گلشن میرا
صد حیف بنا آج وہ مدفن میرا
اُف دستِ تطاول نے نہ چھوڑا تنکا
برسوں کو سجایا تھا نشیمن میرا

بلبل ہے جدا پھولوں سے رہتے رہتے
اشجار بھی خاموش ہیں رہتے رہتے
خوش رنگی پہ مغرور نہ ہو اے گل تو
غنچے بھی ہیں مرجھا گئے کھلتے کھلتے

معصوم ہے ساقی یہ مزا دیتا ہے
بن مانگے ہی میکش کو پلا دیتا ہے
جب شیشہ و پیمانہ و خم ہو خالی
خود اپنے تئیں آپ لٹا دیتا ہے

اسلم قریشی

ویمپائر VAMPIRE

از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی

۱۰ مئی ۳۳ء

آج کا دن کس قدر خوشگوار ہے۔ میں نے صبح کی تمام لطافتیں ایک گھنے درخت کے زیر سایہ ہری گھاس پر بیٹھ کر اپنی روح میں جذب کر لیں۔ مجھ کو اس سحر انگیز گوشہ چمن سے انسیت ہے۔ جس طرح کوئی شخص اس مقام سے بہت مانوس ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کے آباؤ اجداد نے مئے حیات کا جرعۂ جانفزا نوش کیا۔ اور پھر جام فنا پی گئے مجھے اس گھر سے بھی وابستگی ہے جس کی چار دیواری میں سانس لے کر میں زمانۂ طفلی کی معصومیتوں سے گذرتا ہوا عہد شباب کی نیرنگیوں میں جا پہنچا۔ جانب شرق قلعہ معلٰے کے وہ کنگرے نظر آ جاتے ہیں۔ جن سے سطوت شاہجہانی کی شان تجمل آشکار ہے۔ اور خاص طور پر آج کی صبح غیر معمولی طور پر بہت زیادہ فرحت بخش اور روح پرور تھی۔ قلعہ کی پشت پر بہنے والے دریا کی شورشوں میں دلفریب باجہ سا بج رہا تھا۔ میرے تخیل نے پرواز کی۔ تصوّر نے ذہن پر زور ڈالا۔ اور شاہانِ مغلیہ کے عہد حکومت میں چلنے والے بادبانی سفینہ میری نظر کے سامنے سطح آب پر بہنے شروع ہو گئے۔ مسرت و انبساط کی سیماب پروردہ لہریں تمام جسم میں سرایت کر گئیں، اور طبیعت کو بشاش کر دیا۔

۱۲ مئی ۳۳ء

گذشتہ تین چار یوم میری طبیعت بہت ناساز رہی خفیف سا بخار محسوس ہوتا رہا۔ روح پر عجیب اُداسی چھائی رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انبساط و انقباض کی تعجب خیز متضاد کیفیات روح انسان پر کیوں اور کس طرح طاری ہو جاتی ہیں؟ ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ فضائے بسیط میں کوئی نہ کوئی غیر مرئی مخلوق رہتی ہے جو گاہ بگاہ ہم پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہے میں خوشگوار فضا میں سانس لیتا ہوا بیدار ہوتا ہوں، اور ہر تارِ نفس سے زندگی کا نغمۂ جانفزا سنتا ہوں۔ اس کے بعد چہل قدمی کی غرض سے ساحل دریا کی طرف چلا جاتا ہوں مگر واپسی پر محسوس کرتا ہوں کہ حزن و ملال نے میرے قلب کو محصور کر لیا ہے۔ اور میرا سر بھی وبال دوش معلوم ہونے لگتا ہے آخر یہ کیوں؟ —— کیا سرد ہوا کی خنکی میرے جذبات میں تغیر پیدا کر دیتی ہے؟۔ یا بادلوں میں ترکیب پانے والے عجیب و غریب مناظر؟ —— کون ہے جو ان متشکل

اشیا کے لطیف تاثرات کی توضیح کر سکے؟ جن کو ہم دیکھتے ہیں ـــــ مگر پوری توجہ نہیں کرتے۔ محض اس لئے کہ وہ غیر ذی روح ہیں۔

غیر مرئی چیزوں کے اسرار ہمیشہ لاینحل رہتے ہیں۔ ہمارے احساسات ضعیف ہیں۔ ہماری حیات گریز پا۔ اس لئے ہم ان کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں ہم سے زیادہ حیوانات کو ان اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کے مقابلے میں۔ کتے کی قوتِ شامہ گلہری کی قوتِ باصرہ اور چیونٹی کی قوتِ سامعہ بہت تیز ہوتی ہے۔

۱۶ رمئی ۳۳ء ـــــــــــــــ

درحقیقت میں علیل ہوں۔ گذشتہ ماہ کے دوران میں بالکل تندرست تھا۔ مگر اب شدید بخار میں مبتلا ہوں ایک ایسے بخار میں جس کا اثر جسم اور روح دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ مستقبل قریب میں کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے ـــــ ایک عذاب عظیم ـــــ شاید موت کی شکل میں ہو ـــــ،

۱۰ مئی ۳۳ء ـــــــــــــــ

صحت میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوا۔ کس قدر تعجب خیز امر ہے۔ کہ شام کے شروع ہوتے ہی میری بیقراری اور اضطراب میں اضافہ ہونے لگتا ہے، شب تار کی سیاہی مجھے خائف کر دیتی ہے۔ گویا وہ میرے مصائب و آلام کا پیش خیمہ ہے۔ میں مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر عبارت کے حروف میری نظر کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ میں کمرے میں ادہر اُدہر ٹہلنے لگتا ہوں۔ بستر پر دراز ہو جانے میں اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اعصاب کی خوفناک کیفیت کے عالم میں خواب گاہ کے اندر جاتا ہوں۔ تمام سامان آرائش کا معائنہ کر کے پلنگ کے نیچے نظر ڈالتا ہوں جب تک نیند کا خمار طاری نہ ہو۔ میرے قلب کی حرکت بہت تیز رہتی ہے۔ اور تمام جسم میں سنسنی پیدا کر دیتی ہے۔ میں اپنے تمام جسم کو سکیڑ کر خواب کی پریوں کے آغوش میں اس طرح روپوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ گویا برف کے نیچے دب جانے سے یا خنک پانی کے تالاب میں گر پڑنے سے تمام اعضا مفلوج ہو گئے ہیں۔

میں سو جاتا ہوں۔ مگر مشکل سے دو تین گھنٹے پھر عالم رویا میں جا کر ایک ہولناک خواب دیکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ اپنے ہی بستر پر پڑا ہوا سو رہا ہوں۔ تاہم مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میری طرف آ رہا ہے۔ وہ مجھے گھورتا ہے۔ پھر اچھل کر میرے سینہ پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری نازک گردن اس کی آہنی انگلیوں کی گرفت میں ہوتی ہے۔ وہ دبوچتا ہے اور اُف اُف! میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سانس رک جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کے چنگل سے آزاد ہو جاؤں۔ چیخنا چاہتا ہوں۔ چلانے کا ارادہ کرتا ہوں۔ مگر نہیں نہیں۔ میری قوتِ گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ اعضا جنبش نہیں کرتے۔ میں اس بارِ گراں کو اپنے سینہ سے اتار کر پھینک دینے کی کوشش کرتا ہوں مگر اعصاب کی نقاہت ارادوں کی تکمیل نہیں ہونے دیتی۔

اچانک بیدار ہو جاتا ہوں۔ آنکھ کھل جاتی ہے پریشان حال سراسیمگی کے عالم میں بدحواس۔ پسینہ کے اندر غرق میں اِدہر اُدہر دیکھتا ہوں۔ مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ ہاتھ بڑھا کر شمع روشن کرتا ہوں۔ تنہا اور بالکل تنہا ـــــ کسی کے وجود کا امکان تو در کنار سوائے اپنے قلب کی حرکت کے کوئی دوسری آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ تقریباً ہر رات

یہی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

۲ جون ۱۹۳۳ء

حالت زیادہ ابتر ہو رہی ہے۔ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے ــــ تمام ادویات کے اثرات زائل ہو گئے۔ ابھی میں چہل قدمی کے لئے گیا تھا۔ محض اس خیال سے کہ خنک سہانی خوشگوار بادِ صبا کسی قدر طراوت و تازگی پیدا کر دیگی۔ سایہ دار درختوں کے درمیان سرسبز روشوں پر بھی بہت دیر سے ٹہل رہا تھا کہ یکایک سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ سردی کے باعث نہیں بلکہ مستقبل کے ایک مبہم احساس سے۔ میں نے جلدی جلدی قدم اٹھائے۔ اس وقت محض تنہائی کے خیال سے خوف طاری ہونے لگا تھا۔ پھر اچانک مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں اکیلا ہی نہیں ہوں۔ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ اور شاید مجھے چھوئے گا۔ حالانکہ اطراف واکناف میں بالکل سنسان کا عالم تھا ــــ میں نے زبردستی آنکھیں بند کر لیں اور جب ان کو کھولا تو درختوں کی شاخیں میری طرف اس طرح جھکی ہوئی تھیں۔ گویا سربسجود ہیں اور کائنات کا ہر ذرہ میرے چاروں طرف گردش کر رہا تھا۔ اسوقت ــــ ہاں عین اسوقت مجھے مسلم ہوا۔ کہ میری ہستی خود فراموشی کی حدود سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

۱۴ جون ۱۹۳۳ء

گذشتہ رات انتہائی پریشانی اور اضطراب کے عالم میں گذری۔ میں نے چند ہفتہ کے لئے تبدیلی آب و ہوا کا مصمم ارادہ کر لیا ہے، اس خیال سے کہ انتقالِ مکان ضرور طمانیتِ قلب کا باعث ہوگا۔ پہاڑ کی فضا عموماً روح پرور ہوتی ہے

۵ جولائی ۱۹۳۳ء

میں واپس آ گیا۔ بفضلِ خدا تندرست ہوں۔ دفتر سے لی ہوئی تعطیل نہایت فرحت و انبساط کے ساتھ گذری۔ شملہ پر اس شعر و موسیقی کے گہوارہ میں قیام رہا۔ جہاں سے بلا مبالغہ جنت کی سماوی حدود شروع ہوتی ہے۔ اور جہاں اعجازِ صنعت کے اکمل ترین مناظر فردوس نظر بن سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں قدرت کی تمام تمنا زا کیفیات حقیقی شکل و صورت میں بے نقاب جلوہ گر ہوتی ہیں۔ خاص طور پر غروبِ آفتاب کے وقت اُفقِ مغرب کے خون آشام نظارے اور چشمہ کی شورشوں میں سنائی دینے والے غیر صنعتی نغمے روح پر ایک قسم کی خود فراموش محویت طاری کر کے دماغِ انسانی کو عرشِ اعلیٰ پر پہنچا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اور اس فضا میں جو غنچوں کے عبیر آلود تنفس اور مرغانِ سحر کے خاموش تبسم رنگین کے امتزاج باہمی سے ترکیب پاتی ہے سانس لے کر ہر شخص اپنے خاکی وجود کو سطحِ آسمان کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔

۷ جولائی ۱۹۳۳ء

رات نہایت بیکلی کے ساتھ نیند آئی۔ شاید یہ مقام مضرِ صحت ہے۔ کوچوان کو بھی بخار ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے وجہ دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ اس کو بھی تمام رات پرسکون نیند نہیں آتی۔ تاہم دوسرے ملازم تندرست ہیں۔

۹ جولائی ۱۹۳۳ء

دہ واپس آ گیا۔ گذشتہ رات ایک ہولناک خواب دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے زبردستی میرا منہ کھول دیا۔ پھر اپنی زبان میرے حلق میں ڈال دی۔ اور جسم کا تمام خون چوس لیا۔

جب وہ اپنی پیاس بجھا کر اٹھا تو میں اسقدر ہانپ رہا تھا کہ اعضا کو جنبش نہ دے سکا۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو میں ہمیشہ کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دوں گا۔

۱۲ / جولائی سنہ ۳۳ء

کیا میں دیوانہ ہوگیا۔ گذشتہ رات جو واقعہ پیش آیا۔ اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ ہر روز شام کے وقت میں اپنے دروازے کو مقفل کر دیتا ہوں۔ چنانچہ گذشتہ رات بھی ان کو بند کر دیا تھا۔ سونے سے قبل کچھ پانی پیا۔ کیونکہ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اور محض اتفاق کے طور پر میں نے دیکھا کہ صراحی لبریز تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا

نصف شب کے قریب ایک ایسی آواز سے جیسے کوئی زخمی ہو کر کراہ رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا۔ گویا ایک تیز خنجر میرے پھیپھڑوں میں اترتا چلا جا رہا ہے ــــ مجھے سانس لینا بھی دشوار تھا۔ جب کسی قدر ہوش آیا۔ تو شمع روشن کی۔ اور ہاتھ بڑھا کر صراحی کو اٹھا لیا۔ مگر وہ خالی تھی ــــ بالکل خالی ــــ فرش پر ایک بوند بھی نہیں گری تھی۔ اور کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے غش آنے لگا۔ خوف کے باعث تمام جسم کانپ رہا تھا۔ آخر صراحی کا پانی کس نے پیا؟ ــــ مقفل کمرے میں کون آیا؟ اور چلا گیا؟ میں نے اپنے دل کو تسلی دینی چاہی کہ شاید میں نیند کی غنودگی میں خود پی گیا ہوں ــــ مگر تمام صراحی ــــ اور پھر بھی سخت پیاس! ــــ نہیں یہ غلط ہے۔ میں نے نہیں پیا۔

باقی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

۱۵ / جولائی سنہ ۳۳ء

میں صاحب عقل و فہم ہونے اور عملی دنیا میں زندگی گذارنے کے باوجود اپنے حواس پر قادر نہیں۔ کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ کل رات بھی چھوٹی میز پر پانی کی صراحی دودھ کی لٹیا۔ شراب کی بوتل اور کچھ پھل وغیرہ رکھے تھے تمام پانی غائب تھا۔ اور تھوڑا دودھ بھی البتہ پھل بغیر چھوئے اسی طرح رکھے تھے کس قدر تعجب کی بات ہے کہ لٹیا کا ڈھکنا اچھی طرح بند تھا۔ صراحی میں ڈاٹ لگا رکھی تھی۔ اور یہ دونوں چیزیں سفید ململ کے ٹکڑے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ نہ ڈھکنا کھلا نہ ڈاٹ۔ کپڑا بجنسہ لپٹا ہوا تھا نہ اس پر کوئی داغ دھبہ تھا۔ پھر کس طرح دودھ اور پانی غائب ہوگیا؟ ــــ خدایا! یہ کیا اسرار ہے؟

اچھا مجھے بمبئی جانا چاہئے۔

۲۰ جولائی سنہ ۳۳ء

میں بمبئی میں ہوں۔ اور یقین ہوگیا ہے کہ میرے تخیلات مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ سر شام ساحل سمندر پر چہل قدمی کرنے اور رات کو تھیٹر ہال میں خوش گلو اداکاروں ... کے رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کے باعث میری طبیعت سنبھل گئی۔ وہمی اور متخیل لوگوں کے لئے تنہائی بہت مضرت رساں ہے۔ ان کو ضرور سوسائٹی کے ساتھ رہنا چاہئے۔ حسن و جمال کی دیویوں کو جب اپالو بندر پر مصروف خرام دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی مسرت کا اندازہ لگانا محال ہو جاتا ہے ہر نوع کی شان تجمل پھونگ میں اس مقام شعریت پر جلوہ افروز ہوتی ہے اور انسان یہ یقین کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ وہاں آنے والی ہر دیوی اگر چاہے تو صرف جنبش ابرو کے ذریعہ سمندر کو ساحل سے دور ہٹا سکتی ہے۔ کاش میں ان میں سے کسی ایک کی پرستش کرنے کا موقع حاصل کر سکوں۔

۲۹ر جولائی ۳۳ء

پھر وہی اضطراب و بے چینی۔ سینہ کے نیچے ایک نامعلوم خلش پیدا ہونے لگی ہے۔ کیا میں غیر ارادی طور پر کسی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بیشک حقیقی محبت ہمیشہ غیر ارادی طور پر ہوتی ہے۔ جان بُوجھ کر کسی سے نہیں کی جاتی۔ یہ کوئی اکتسابی فن نہیں ہے۔ بلکہ خداداد عطیہ ہے جس کسی کو نصیب ہو جائے۔ خوش قسمت ہے لیکن نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اسی غیر مرئی ہستی نے دوبارہ اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ تمام رات پریشان کرنیوالے بھیانک خواب اسی امر کے شاہد ہیں —— اگر سکونِ قلب یہاں بھی میسر نہیں آسکتا۔ توکیوں نہ واپس وطن چلا جاؤں۔

۴ر اگست ۳۳ء

میں واپس آگیا۔ پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ دل کو کیا ہوگیا۔ جی بیٹھا جاتا ہے۔ ملازم ہر وقت آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ رات کے پُرسکون لمحات میں کوئی دبے پاؤں تمام مکان میں پھرتا رہتا ہے۔ اور صاف طور پر برتنوں کے الٹ پلٹ کرنیکی آواز سنائی دیتی ہے۔ اکثر صبح کو چینی کے پیالے اور طشتریاں شکستہ حالت میں ملتی ہیں —— دروازوں کے شیشے یک ایک کر کے سب ٹوٹ گئے۔ سنگار میز کے آئینہ میں بال پڑ گیا۔ تمام ملازمین ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھیراتے ہیں۔ مگر کوئی اقبالِ جرم نہیں کرتا۔ پرسوں رات یکایک بجلی کا قمقمہ روشن ہوا۔ اور فانوس زمین پر گر گیا۔ سب نوکروں سے دریافت کیا۔ مگر معلوم نہ ہوسکا کہ سوئچ کس نے کھولا۔

۶ر اگست ۳۳ء

اب میں پاگل نہیں ہوں۔ بالکل نہیں۔ مجھے محسوس ہو گیا۔ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ اب مجھے شبہ نہیں۔ اُفوہ! کتنی عجیب بات ہے۔ تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سہ پہر کے قریب میں چمن میں گلاب کے تختے کے قریب ٹہل رہا تھا۔ جبکہ اچانک اپنے بالکل نزدیک میں نے گلاب کی ایک شاخ کو آہستہ آہستہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ اسکو دبا رہا ہے پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اوپر کو اٹھنی شروع ہوگئی۔ گویا کوئی شخص اسکو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ تاکہ پھول کی تمام نزہت و صباحت کو تنفس کے ذریعہ حاصل کرلے۔ یکایک شاخ کو جھٹکا لگا۔ اور پھول —— وہ سرخ پھول —— ٹوٹ کر میری آنکھوں کے سامنے ہوا میں معلق رہ گیا۔ یقیناً کوئی نظر نہ آنے والی ہستی اسکو اپنے ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ خوف کے باعث میں لرز رہا تھا۔ مگر پھر بھی ہمت کر کے میں نے جھپٹا مارا پھول غائب تھا۔ صرف شاخ زمین پر پڑی رہ گئی۔ بس میں سمجھ گیا کہ میری جان کے ساتھ ہر وقت کوئی دوسری ہستی لگی رہتی ہے۔ اس کی گذر اوقات دودھ اور پانی پر ہے۔ وہ چیزوں کو چھو سکتی ہے اور اصل جگہ سے ہٹا سکتی ہے۔ شاید وہ ایک ایسی مخلوق میں سے ہو جو نصف مادّی اور نصف روحانی ہے۔

۷ر اگست ۳۳ء

رات کے خاموش لمحات میں پانی کی صراحی خالی ہوگئی لیکن میں سکون و طمانیت کے ساتھ سوتا رہا۔ میں نے بہت سے دیوانے دیکھے ہیں۔ جن کا دماغ صحیح نہیں تھا اور حواس مختل ہو جانے کے باعث فاتر العقل کہلاتے

تھے۔ میرا دماغ صحیح وسالم ہے۔ اور حواس بھی درست ہیں۔ تخیلات کی پرواز نہایت آزاد ہے۔ پھر لوگ مجھے پاگل کیوں کہتے ہیں؟ شاید وہ خود پاگل ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دماغ کے ایک حصہ پر اثر ہوگا۔ کیونکہ حافظہ کسی قدر خراب ہوگیا ہے۔

ان خیالات کے اندر محو میں دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ فضا ایسی خوشگوار تھی کہ میں اپنی ذات کے علاوہ کائنات کے ہر ذرّے کو مادّہ پرستش نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ رفتہ رفتہ کسی کہربائی قوت کا اثر مجھے آگے جانے سے روکنے لگا۔ میرے پاؤں خود بخود شل ہوگئے۔ گھر واپس آنے کے لئے مجھے کوئی بلا رہا تھا۔ اور میں سمجھ رہا تھا۔ کہ وہاں ضرور کوئی حادثہ پیش آچکا ہے۔ یا دائرہ وجود میں آنے کے لئے میرا منتظر ہے۔

۱۲؍اگست ۳۳ء ——————

میری قوت ارادی سلب ہوگئی ہے۔ میری روح پر کوئی حکومت کرتا ہے۔ میرے تمام خیالات وافعال اس کے طابع فرمان ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرالیتا ہے۔ اگر میں دریا کی سیر کے لئے جانا چاہتا ہوں تو میرے اعضا مفلوج کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر مطالعہ کی غرض سے کتاب لے کر بیٹھوں تو باغ میں ٹہلنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہوں اس وقت میرے قدم خود نہیں اٹھتے۔ بلکہ کوئی اور اٹھاتا ہے —— یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے اعتقادات میں تشکیک وارتیابات کا مادّہ کیوں پیدا ہو چلا؟ مجھے صراطِ مستقیم سے کون گمراہ کر رہا ہے؟ —— رحم! رحم! اے خدائے قدوس! تیری اعانت کا طلبگار ہوں۔ کاش! میری روح آزاد ہو جائے۔

۱۶؍اگست ۳۳ء ——————

آج دو گھنٹے ہوئے میں فرار ہوگیا۔ ایک ایسے قیدی کی طرح جس کو اتفاقاً جیل کا دروازہ کھلا مل گیا ہو میں نے محسوس کیا کہ میں آزاد ہوں۔ میرا حاکم بہت دور چلا گیا ہے میں بھاگتا ہوا پبلک لائبریری میں چلا گیا۔ اور جلدی سے ڈاکٹر ہرمن کی وہ کتاب نکالی۔ جس کے اندر عہدِ قدیم وجدید کی نامعلوم ہستیوں کا حال درج ہے۔ میں بہت استغراق کے ساتھ دو گھنٹے تک مطالعہ میں مشغول رہا۔ ڈاکٹر موصوف نے بڑی تحقیق کے بعد اس راز کو منکشف کیا تھا۔ کہ دنیا میں ایک ایسی مخلوق ہے۔ جو نظر نہیں آتی۔ بلکہ انسان کو دنیائے خواب میں اور عالم بیداری میں یکساں طور پر پریشان کرتی رہتی ہے۔ تاہم ساری کتاب میں کسی ایسی ہستی کا حال درج نہیں تھا۔ جس کی کیفیت میرے واقعات سے منطبق ہو سکے۔ میں اس کتاب کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اور میز پر رکھ دیا۔ کافی دیر دماغ پر زور ڈالنے کے باعث اعضاء مضمحل ہو گئے تھے۔ اس لئے مسہری پر دراز ہو جانا ضروری تھا میں لیٹ گیا۔ اور آنکھوں کو ذرا سکون دینے کے لئے بند کر لیا۔ مگر مجھے نیند آگئی۔ حتیٰ کہ ایک بجے شب تک بے خبر سوتا رہا۔ کوئی خواب نظر نہیں آیا۔ تاہم جب آنکھ کھلی۔ تو معمولی بخار محسوس ہو رہا تھا۔ کمرہ روشن تھا کھڑکی کے باہر تاریک فضا میں جھلملاتے ہوئے ستارے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ میں خاموش لیٹا ان کو دیکھتا رہا اچانک ایک خفیف آواز جیسے کسی کے دل کی حرکت ہو مجھے سنائی دی۔ میں نے مڑ کر میز کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ہرمن کی کتاب کھلی تھی۔ حالانکہ میں نے بند کر کے رکھا تھا —— دیکھتے دیکھتے اس کا ایک ورق پلٹ گیا۔ قریب کوئی نہیں

تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ہوا بھی مدہم تھی۔ پھر آخر اس کا کیا مطلب؟ اتنے میں دوسرا ورق خود بخود پلٹ گیا، جیسے کوئی جلدی جلدی مطالعہ کر رہا ہو۔ ایک، دو، تین، چار، قلیل وقفہ سے مسلسل طور پر ورق گردانی ہوتی رہی میز کے قریب پڑی ہوئی کرسی خالی تھی۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس میں کوئی متنفس بیٹھا ہوا ہے۔ آتشِ غضب میرے سینہ کے نیچے بھڑک اٹھی۔ انتقام لینے کی قسم کھا کر مسہری سے اٹھا۔ کرسی کے ساتھ ہی میز کا توازن بھی قائم نہ رہ سکا۔ وہ دوسری طرف جا پڑی۔ اس کے اوپر رکھا ہوا بجلی کا لیمپ بھی زمین پر گرا اور گل ہوگیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی ——،

عین اس وقت کھڑکی کے دروازے زور سے بند ہوئے اور دھماکے کی آواز باہر سنائی دی۔ جیسے بلی کودتی ہے۔ افسوس وہ باہر چھلانگ مار کر فرار ہوگیا۔ ورنہ شاید میں اسے پکڑ لیتا۔ مگر آج پہلی مرتبہ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میرا آقا مجھ سے ڈرتا بھی ہے۔

۱۸ راگست ۱۹۳۳ء

سائنٹفک ریویو کے تازہ پرچہ میں ایک دلچسپ خبر شائع ہوئی ہے۔ جس سے بہت سے واقعات کا انکشاف ہوگیا۔ اقتباس حسب ذیل ہے۔

"امریکہ کے مشرقی ساحلوں پر ایک عجیب قسم کے پاگل پن کی وبا پھیل رہی ہے۔ ایک ایسی وبا جو قرونِ وسطیٰ سے آج تک کسی جگہ سننے میں نہیں آئی۔ لوگ وحشیوں کی مانند اپنے گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔ اراضیات کو خیرباد کہہ دیا۔ باپ بیٹے سے اور بیٹی ماں سے متنفر ہے بھائی کو بھائی سے محبت نہیں رہی۔ نہ خاوند کو اپنی بیوی کی پروا ہے نہ زوجہ کو اپنے شوہر کی۔ مگر سب اپنے وطنِ مالوف کو چھوڑ کر ایک ہی سمت کو بھاگ رہے ہیں۔ گویا غیر مرئی دشمنوں کا گروہ ان کو فرار ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ **ویمپائر** ہیں جو انسان کا خون چوس لیتے ہیں اور مویشیوں کا دودھ پی جاتے ہیں۔ پروفیسر پیڈرو چند دیگر شہرہ آفاق ڈاکٹروں کے ہمراہ تحقیقات کی غرض سے اس علاقہ میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں ——"

۲۰ راگست ۱۹۳۳ء

مجھے یقین ہوتا چلا ہے کہ ضرور اسی گروہ میں سے نکل کر ایک ویمپائر ہندوستان کی طرف آگیا ہے جو ہر وقت میرے سائے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ میری غذا پر اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اور شاید وہ میرا خون بھی چوستا ہوگا کیونکہ میری رنگت زرد پڑتی جا رہی ہے۔ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ ہر طاقتور چیز اپنی فلاح کے لئے کمزور چیز کو فنا کر دیتی ہے۔ چھپکلی مکھی کو پکڑتی ہے۔ مگر بلی کا پنجہ اسکو بھی زندہ نہیں رہنے دیتا۔ جنگل میں ہرن کے گوشت پر شیر کی پرورش ہوتی ہے۔ اور انسان شیر کا شکار کھیلتا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں ایسی مخلوق کا وجود نہ ہو۔ جو انسان کو اپنا تختہ مشق بنالے۔ وہ ضرور ویمپائر ہے۔ جس کا وجود ہے۔ مگر نظر نہیں آتا۔ میری یہ تمام تخیل آفرینی بھی اسی کی ودیعت کردہ ہے۔ اکثر اوقات میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ میری رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔ جسم کے

اندر دوڑ رہا ہے اور محض اس کا تصور کرنے سے میرے اعضا پر تنویم کا اثر طاری ہونے لگتا ہے۔

۲۴ اگست ۱۹۳۳ء ———

آہ! میں نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے عکس کو۔ اس کے سایہ کو۔ خود اپنی آنکھ سے نہایت واضح طور پر دیکھ لیا۔ کل شام کا ذکر ہے۔ میں مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس جگہ ضرور آئیگا۔ اور میرا مضمون پڑھیگا۔ میں نے عنوان نہایت جلی حروف میں لکھا تھا **ویمپائر** میں چاہتا تھا کہ اس کی مذمت میں تمام فحش الفاظ استعمال کر ڈالوں۔ مگر کسی نے قلم کی جنبش کو سلب کر دیا تھا۔ ایک حرف بھی نہ لکھ سکا۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن کر دی تھیں تاکہ میں اسے بخوبی دیکھ سکوں۔ سامنے ایک قدِ آدم شیشہ تھا۔ جس کے اندر ہر اس چیز کا عکس نظر آرہا تھا جو میری پشت پر تھی۔ میری مشکوک نظریں بارہا اٹھتی تھیں۔ اور چاروں طرف کمرہ کا جائزہ لے کر کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ "ویمپائر" پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔ اچانک مجھے خفیف تنفس کی آواز سنائی دی۔ کوئی میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے سانس سے میری کنپٹی پر سرسراہٹ ہونے لگی۔ میں جھپٹ کر جلدی سے اٹھا۔ تاکہ اسے پکڑ لوں مگر نزدیک کوئی نہ تھا۔ تاہم میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب شیشہ کے اندر خود میرا عکس بھی نظر نہ آیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شیشہ کی سطح بالکل صاف و شفاف تھی۔ مگر میرا جسم یا پشت پر رکھی ہوئی دوسری چیزیں اس میں نظر نہ آتیں۔ آخر یہ کیا اسرار ہے؟ کیا ویمپائر کے اثرِ تنویم سے بے جان شیشہ کی اصل خصوصیت زائل ہو گئی؟ ....

...... اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی۔ کہ وہ چیزوں کو اپنی سطح پر منعکس کر سکے۔ چند لمحے پیشتر اس میں یہ صفت موجود تھی۔ مجھے شبہ ہوا۔ کہ شاید میرے جسم کا وجود قائم نہیں رہا۔ بلکہ صرف ذہن میں ایک مبہم سا خیال باقی رہ گیا ہے کہ "میں ہوں" مگر بازو میں چٹکی لینے سے جب درد ہوا تو تمام شکوک رفع ہو گئے۔ میں اپنے مادی جسم کے ساتھ اس جگہ موجود تھا۔

میں حیرت و استعجاب کے عالم میں اسکو گھورتا تھا۔ حتیٰ کہ تھوڑی دیر میں میرے پاؤں شیشہ کے زیریں حصہ میں دکھائی دینے لگے۔ پھر پنڈلیاں۔ گھٹنے اور بتدریج تمام جسم نظر آنے لگا۔ اسی رفتار سے دوسری چیزیں بھی منعکس ہوتی رہیں۔ جس طرح چاند آہستہ آہستہ سیاہ بادلوں میں سے نکلتا ہے۔ اب میں سمجھا کہ ویمپائر میرے اور شیشہ کے درمیان حائل تھا۔ اسی لئے کوئی شے دکھائی نہ دیتی تھی

۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء ———

میں نے ان تمام کواڑوں کی جوڑیاں تبدیل کرا دیں جن کے اندر درزیں یا سوراخ تھے۔ چوکھٹ میں نئے قبضے اور کنڈیاں لگا دیں۔ تمام کمرے دن رات مقفل رہتے ہیں۔ صرف مطالعہ کے کمرے میں نشست و برخاست رہتی ہے۔ اسی جگہ سوتا ہوں: .... اسی جگہ کھاتا ہوں۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس طرح اسکو قید کر کے مار ڈالونگا۔ وہ آتا ہے مگر قبل اس کے کہ میں باہر نکلوں۔ وہ فرار ہو جاتا ہے کبھی نہ کبھی میرے قابو آئیگا۔ روشندان تک بند کر دیئے ہیں مجھے پرواہ نہیں۔ چاہے صحت بھی خراب ہو جائے۔ مگر اس کے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔

عنقریب مجھے فتح ہوگی

۱۵ستمبر ۳۳ء ——————

دنیا میں کوئی کام غیر ممکن نہیں۔ اگر انسان کوشش کرے تو ضرور کامیاب ہو سکتا ہے مجھے اپنی کاوش پیہم کا ثمرہ مل گیا۔ فتح ہو گئی۔ بہت زبردست فتح۔ کل شام میں سیر و تفریح کے بعد واپس آیا۔ تو مطالعہ کے کمرے میں آہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سنا کسی کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید میرے جلنے سے پہلے وہ کمرے میں موجود نہ تھا۔ اور قفل لگنے کے بعد وہیں رہ گیا بس یہ زریں موقع تھا۔ میں بھاگا ہوا موٹر گیرج میں گیا۔ اور چار ٹین پٹرول کے اٹھا لایا۔ تمام کمروں کے دروازوں اور کواڑوں پہ دیواروں پر غرض ہر جگہ پٹرول چھڑک دیا دیا سلائی لگا دی اور جلدی سے بھاگ کر باغیچہ میں جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ رفتہ رفتہ شعلہ بلند ہوئے۔ اور تمام کوٹھی آتش نمرود کا منظر پیش کرنے لگی۔ قرب و جوار کے لوگ بھاگے ہوئے آئے کسی نے فائر بریگیڈ کو ٹیلیفون کر دیا۔ انجن آیا۔ مگر آگ بجھانے کی تمام سعی لاحاصل تھی۔ لوگ ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ لاکھوں کا مال جلکر سیاہ ہو رہا تھا۔ مگر میں جھاڑیوں میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے دیرینہ دشمن کو مغلوب کر دیا۔ اسے جلا دیا میں خوش تھا۔ کہ اب اطمینان قلب حاصل ہو جائیگا۔ اور میرا قیاس درست نکلا۔ اب اضطراب و بےچینی نام کو بھی باقی نہیں۔ کامل سکون میسر ہے۔ روزانہ متبسم ستارے مجھے لوری دے کر سلاتے ہیں۔ اور خندہ صبح مجھے بیدار کرتا ہے خواب اب بھی نظر آتے ہیں۔ مگر نہایت لطیف و خوشگوار بعض احباب کا خیال ہے کہ مجھے صرف وہم تھا ورنہ در حقیقت کسی کو مجھ سے دشمنی نہیں تھی۔ ویمپائر وغیرہ کوئی چیز نہیں خود انسان کا تخیل اسکو تخلیق کرتا ہے اور فنا کر دیتا ہے بہر حال کچھ بھی ہو۔ مجھے سکون حاصل ہو گیا۔ میرے قلب کو کامل اطمینان ہے۔ مجھ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔

(ماخوذ) ——————

بس ہو چکا علاج دلِ بیقرار کا

(از ماسٹر سید عبد الستار صاحب علوی جیگڈ تی)

دیکھا ہے جب سے جلوہ کسی گلعذار کا
ملتا نہیں مزاج دلِ بیقرار کا

آئے نہ آئے ہم کو غرض کیا بہار سے
بس ہو چکا علاج دلِ بیقرار کا

کس بل پہ کیجئے ہوسِ رنگ و بو یہاں
کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا

ہر ہر نفس میں ایک عجب انقلاب ہے
ہر لمحہ زندگی کا ہے جلوہ شرار کا

دل میں تپش بحجر میں فلک اشک خوں رواں
طرفہ اثر ہے مجھ پہ نسیم بہار کا

اچھی نہیں یہ گوشہ نشینی بہار میں
علوی خیال چھوڑ غمِ روزگار کا

جذباتِ عالیہ

عالیجناب اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری

جویائے حقیقت ہوں عالم سے جُداگانہ
دل مائلِ کعبہ ہے رُخ جانبِ بتخانہ

تاثیرِ بیاں بھر دے اے گردشِ پیمانہ
ساقی کو سُنانا ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرّہ میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اے اہلِ نظر دیکھو خاکسترِ پروانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جاننا منزل کی
چل وادیِ ایمن تک سن طور کا افسانہ

ہے مشربِ رنداں میں اندازِ طلب یہ بھی
ہر گردشِ ساغر پر اک نعرۂ مستانہ

اک کیف نے دونوں پر اس درجہ اثر ڈالا
میکش ہے ز خود رفتہ چکر میں ہے پیمانہ

پردے سے عیاں ہو کر پردے میں نہاں ہو جا
چھا جائے گی خود حیرت اے جلوۂ جانانہ

یہ سنگ دلی تا کے یہ کج نگہی کب تک
لبریز تمنا ہے ساقی مرا پیمانہ

دنیائے حقیقت میں آزاد تعیّن ہیں
ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

حالاتِ الم کہہ کر بیمار نے دم توڑا
آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصلِ افسانہ

اللہ رے کیفِ مے ہے اور ہی عالم میں
معراج تھی بیخودی کی اک لغزشِ مستانہ

یوں جل کے سرِ محفل تصویرِ وفا کھینچی
پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازیِ پروانہ

کیا جانے کہاں موجیں کھینچے لئے جاتی ہیں
پہنچا ہمیں ساحل تک اے ہمتِ مردانہ

اِک مست ابھی اے دلؔ کہتا ہوا گزرا ہے
صد زہد بہ یک جرعہ نذرِ مے و میخانہ

شعرائے رباعی

جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج

جملہ اصناف شاعری میں رباعی وہ چیز ہے جس کی ایجاد کا فخر فارسی زبان کو حاصل ہے۔ اپنی محدود شکل اور مخصوص وزن کے اعتبار سے رباعی کو نمایاں امتیاز حاصل ہوگیا ہے۔ رباعی کی ایجاد بھی نہایت قدیم ہے اگرچہ اسکی وہ قدامت جو چند سال قبل تک مسلم تھی اور تقریباً تمام محققین مشرق و مغرب کو جس پر اتفاق تھا حال میں غلط ثابت کردی گئی ہے، سب سے پہلی نظم فارسی کے چھ سات مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور نظم اولین زمانہ ان آرائے مختلفہ کے حساب سے پانچویں صدی عیسوی سے نویں صدی عیسوی تک قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ ۲۶۵ھ میں بانی حکومت صفاریہ یعقوب ابن لیث کے چھوٹے بچے کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ (غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گور) اور یہ مصرع رباعی کی ایجاد کا باعث ہوا۔

لیکن اب "تاریخ ادبیات ایران" کے مصنف جلال الدین ہمائے اصفہانی نے اپنی جدید تحقیقات سے قدیم نظریوں اور رایوں کو باطل کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے قدیم موزون فقرے جنکو فارسی شاعری کا سنگ بنیاد کہا جاسکتا ہے وہ ہیں جو یزید بن مفرغ نے زیاد کی ماں سمیہ کے متعلق طعن کے طور پر کہے ہیں یہ شخص حکومت یزید بن حضرت امیر معاویہ (۶۰-۶۴ھ / ۶۷۹-۶۸۳ء) کے زمانہ کا ہے۔ وہ فقرے یہ ہیں۔

آبست نبیذ است
عصارات زبیب است
سمیہ روسپید است

تاریخی لحاظ سے اس کے بعد یہ واقعہ ہے جب اسد بن عبداللہ القصاری الختلانی نے خاقان کے ہاتھ سے ۱۰۸ھ میں شکست پائی تو خراسان کے بچوں نے ان موزون الفاظ میں اس کا مذاق اڑایا۔

از ختلان آمدیہ
برو تباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ
خشک نزار آمدیہ

قدامت کے اعتبار سے تیسرا شاعر ابوالینبغی العباس بن ترخاں ہے۔ کتاب الوزرا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر ۱۸۰ھ میں وزرائے برمکی جعفر و فضل کا درباری تھا۔ اس نے شہر سمرقند کے متعلق یہ شعر کہے ہیں۔

سمرقند کند مند
برزینت کے افگند
از شاش نہ بہی
ہمی شہ نہ جہی

اگرچہ ان انکشافات کی وجہ سے یعقوب لیث

صفاری کے عہد حکومت میں فارسی شاعری کی ایجاد کا فخر چھن جاتا ہے تاہم فارسی شاعری کے رواج کا سہرا اسی حکمران کے سر ہے۔ تاریخ سیستان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا شاعر جس نے باقاعدہ فارسی نظمیں لکھیں محمد بن وصیف ہے جس نے یعقوب لیث کی مدح سرائی کی ہے۔

اسی طرح رباعی سب سے قدیم فارسی نظم نہ سہی تاہم اس کا رواج فارسی شاعری کے رواج کے ساتھ ساتھ ہے اور اس خصوصیت کی مالک تو تنہا رباعی ہے کہ تصوف جو فارسی شاعری کی روح رواں اور آب حیات ہے۔ رباعی ہی کے ذریعہ سے سب سے پہلے داخل ہوا ہے۔ رباعی کے وزن میں اگرچہ موسیقیت مقابلۃً کم ہے لیکن لوچ اور لچک زیادہ ہے۔ اس لئے رباعی کے مصرع میں بہت سے ایسے الفاظ کی گنجائش نکل آتی ہے جو اس کے مساوی دوسرے اوزان میں سما نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ رباعی کا دو شعروں میں محدود ہونا بھی بہت کچھ جاذب توجہ اور طالب کمال رہا ہے۔ ایک خیال قطعہ یا غزل یا مثنوی کی صورت میں بہت سے شعروں میں پھیلایا جا سکتا ہے لیکن اسی خیال کو جب رباعی میں باندھا جائیگا تو اس کے صرف چار مصرع ہونگے اس لئے اس تخئیل کے تمام غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے صرف اصل خیال اور ضروری بات کو موزون کرنا ہوگا

تقریباً ہر شاعر نے قصائد و غزلیات وغیرہ کے ساتھ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ لیکن ایسے شاعر جنہوں نے صرف رباعی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا کم ہیں، رودکی و فردوسی، انوری و خاقانی۔ سعدی و خسرو۔ خواجہ و حافظ نظامی و جامی۔ عرفی و ظہوری۔ نظیری و بیدل۔ حزیں و غالب کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے تھوڑی یا بہت کسی نہ کسی موقع پر رباعیاں نہ کہی ہوں۔ لیکن ان میں سے کوئی رباعی گو کی حیثیت سے مشہور نہیں ہے۔

البتہ سلطان ابو سعید ابو الخیر۔ حکیم عمر خیام اور ہندوستان کے حضرت سرمد شہید خالص رباعی گو شاعر ہیں۔ خصوصاً ابو سعید ابو الخیر اور عمر خیام کی رباعیاں فارسی شاعری کے لئے مایہ ناز اور طرۂ امتیاز ہیں۔

مولٰنا ابو سعید ابو الخیر (۹۶۷-۱۰۴۹ء) ہی وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ سے سب سے پہلے مضامین تصوّف فارسی شاعری میں شامل کئے اسرار و معارف خالص تصوّف کی زبان میں بھی ادا کئے ہیں اور عشق و حسن کے رنگ میں بھی ان کو جلوہ دیا ہے چار سو سے زیادہ رباعیاں ان کی یادگار ہیں۔

عمر خیام کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔ اس کی حکیمانہ اور رندانہ رباعیاں مشرق و مغرب میں یکساں مشہور اور ایران و ہندوستان میں برابر مقبول ہیں۔ اس کے سات سو سے زیادہ ستارے آسمان شاعری پر چمک رہے ہیں۔

سرمد شہید کی رباعیاں شمار میں تھوڑی اور شہرت میں کم ہیں تاہم اسی سرمست سرمدی کی زبان سے بعض ایسی رباعیاں نکل گئی ہیں جو الہامات شاعرانہ کا مرتبہ رکھتی ہیں

ان تینوں زندۂ جاوید باکمالوں کی رباعیوں کے نمونے ہم بالقصد حذف کرتے ہیں۔ وقت تھوڑا ہے اور مضمون کو مختصر کرنا ہے اور ایک نئے رباعی گو شاعر کا تعارف مقصود ہے۔

سحابی استرآبادی شعرائے رباعی نویس میں اس اعتبار سے سب سے بڑھا ہوا ہے کہ تین متذکرہ بالا

شاعروں کی تمام رباعیات کا مجموعہ سحابی کی رباعیوں کا ایک چہارم بھی نہیں ہے۔ یعنی سحابی استرآبادی نے چھ ہزار رباعیاں لکھی ہیں جو مجلۂ ارمغان طہران میں کئی مہینے سے شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن ان کا پورا مجموعہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔

ارمغان کی اشاعت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ایک مضمون نگار غلام حسین محتشم دولت شاہی نے کلیات سحابی کے متعلق یہ اطلاع دی ہے۔

"در چند روز قبل دیوانے ازیں شاعر در نزد
آقائے پارسائے تویسرکانی دیدم کہ علاوہ
بر شش ہزار رباعی مزایائے بیشمار دیگر کہ
کمتر کسے را تا حال دسترس بدانہا بودہ است
در بر دارد۔ دیوان فوقی با مقدمہ نثرے بقلم
سحابی شروع میشود و در صفحات اواخر آں
مثنوی کوچکے کہ بوزن بہرام نامہ نظامی است
و از آثار شاعر مذکور می باشد و حاوی ۳۴۳
بیت شعر است ضمیمہ گردیدہ"

اس دیوان کے آخر میں تاریخ استنساخ یعنی نقلِ نسخہ اس طرح درج ہے۔

"ہذہ النسخۃ الشریفہ رباعیات و مثنوی مولینا
سحابی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ چہاردہ جمادی الثانیہ
سنہ یک ہزار و دو (۱۰۰۲)"

افسوس کہ سالنامۂ یادگار کی اشاعت میں تھوڑا عرصہ باقی رہ گیا ہے اور اس مضمون کے لکھنے کی تحریک بالکل آخری وقت میں پیدا ہوئی۔ اس لئے اتنا وقت نہیں رہا کہ سحابی استرآبادی کی رباعیات کو کسی ترتیب کے ساتھ درج کر کے ان پر تنقید کی جائے۔ انشاءاللہ پھر کسی وقت یہ کام یادگار ہی کے لئے کیا جائیگا۔ ممکن ہے اسوقت تک ان رباعیات کا اکثر حصہ شائع ہو جائے۔ بالفعل چند رباعیاں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔ سحابی کی رباعیوں میں سب سے نمایاں موضوع تصوف ہے بعض جگہ خوب لکھا ہے۔

عارف کہ نہ از خلق حجابے دارد   از عالمِ توحید خطابے دارد
میخندد صبح بر ہمہ انجم و شمع   گویا کہ خبر ز آفتابے دارد

کے بہر خدا از دلِ تو بر خیزد   ہر سحرے ہزار طعنہ زن گر خیزد
چوں سایہ تو خورشید کہ بی جنبش او   از جا نرود اگرچہ صرصر خیزد

عاشق ہر چند پائے لغزے دارد   بیروں از خود مقام لغزے دارد
افتادگی صاحب دل خواہ عشق   آرے شکند ہرچہ مغزے دارد

با ذات بہر صفت گرایند خوش است   نغمہ بہر آہنگ سرایند خوش است
از بہرِ خدا ہیچ عمل ضائع نیست   در خلد ز ہر در کہ درایند خوش است

عالم بہ رہ کیش تو خواہند آمد   شاہاں ہمہ در کیش تو خواہند آمد
اے بہر خدا نشستہ فارغ ز ہمہ   بنشیں کہ ہمہ پیش تو خواہند آمد

یہ عاشقانہ رباعی کیا خوب کہی ہے۔

ہر کس بجہاں رنگ و بوی گردد   در آرزوئے آں گل روی گردد
من در غم فتنۂ قیامت بودم   آں نیز بگرد چشم او می گردد

ابنائے جنس سے اپنی بے نیازی ظاہر کرتے ہیں۔

منزل بتقصدش ... بیر افتاد — یکدم پیوند با کرم دست نداد
... نگہ وقت الم — عیسیٰ صفتم مجرد مادر زاد

"تمیں حشیرہ" سے مراد عجب نہیں شیوہ شاعری ہو۔ ممکن ہے سحابی نے ابوسعید ابوالخیر کی طرح شاعری میں کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔ اس لئے کہ ان کی رباعیات میں بعض جگہ ترکیب کی سستی پائی جاتی ہے مثلاً مندرجہ ذیل رباعی کا دوسرا مصرع غور طلب ہے:-

ہستی بہ ... قدِ المنن دارد — ہر سر خلقے اگرچہ یا وسن دارد
جز صاحب کمالا بزد کمالا را — ہر چند کہ حمال بگردن دارد

"یاوسن" قافیہ ہے اسلئے ہٹ نہیں سکتا اور اسکے رہنے سے مصرع ناموزوں ہے۔

رباعی کی رعایت سے یہ رباعی بھی خوب نکالی ہے:-

حق داد جواب ہر سوالے بکمالت — زاں پیش کہ بود رسم ہر داوری خواست
زیں یاوہ ہر رباعی من کہ درد — بیت آخر ز بیت اول پیداست

بہرحال سحابی استرآبادی کی چھ ہزار رباعیاں شائع ہو جائیں تو ان میں سیکڑوں جواہر پارے نکل آئیں گے

(حامد حسن قادری)

مشاہدات

(از جناب کاظم دہلوی)

بصد تلاش ملے وہ بہ آب و تاب ملے — تخیلات کے پردوں میں بے حجاب ملے
خودی پسند ملے کچھ رہینِ خواب ملے — کہ اک سرے سے یہاں سب کے سب خراب ملے
نہیں مجال اسے اب مجالِ خواب ملے — جسے نظارہ کا موقع ملے نہ تاب ملے
نگاہِ لطف سے ساقی ہمیں شراب ملے — کہ تلخ و تند جہاں تک ہو بے حساب ملے
خدا کسی کو محبت نہ دے جوانی میں — خدا پناہ میں رکھے جسے خراب ملے
ابھی تو دور ہے ہاتھوں سے آپ کا دامن — ابھی کچھ اور تڑپ اور اضطراب ملے
حضور پردے سے باہر بھی آئیں گے کہ نہیں — مگر کھلے ہوئے الفاظ میں جواب ملے
عدو کے ساتھ کہاں تک رہے گا راز و نیاز — خطا معاف! ذرا سوچ کر جواب ملے
ہمارے پاس نہیں سیکڑوں تکلف تھے — عدو کی بزم میں بے پردہ بے حجاب ملے
قبول ہو سرِ میخانہ شیخ کی یہ دعا — جو ایک جام دے حج کا اسے ثواب ملے
جنہیں نہ حفظِ مراتب نہ گفتگو کی تمیز — تمہاری بزم میں وہ لوگ باریاب ملے
میں وہ ہوں تشنہ دہن جب تلاش ہو مجھکو — بجائے آب کے چاروں طرف سراب ملے

بڑی امید پہ کاظم گیا ہے آج وہاں
تسلی بخشِ الٰہی اسے جواب ملے

پیارا کنھیا

بھولی بھالی دیہاتی لڑکی شام سے کچھ پہلے پانی لانے کیلئے ندی پر جا رہی ہے۔ کھلا میدان، ٹھنڈی ہوا، ہر طرف کھلے ہوئے خود رو پھول عاشقِ نظر میں الجھ الجھ کر جانے والی کی راہ کھوٹی کر رہے ہیں۔ جب دن ڈھلنے کے قریب ہو جاتا ہے لڑکی گھبرا کر کہہ اٹھتی ہے۔

اے لو، وہ دن ڈھلا جا رہا ہے
وقت شام اب قریب آ رہا ہے
وقت ہے، پاؤں جلدی اٹھاؤں
بھرنے گاگر میں جمنا پہ جاؤں

وہ چار قدم چل کر ٹھنڈے وقت کی سحر آفرینی سے مسرور ہو کر پھر اس طرح گاتی ہے۔

ہے فضا شام کی کیا سہانی
یا شبِ وصل کی ہے نشانی
نور و ظلمت بہم ہو رہے ہیں
راستے والے گم ہو رہے ہیں
کیا خبر، آسماں کیا دکھائے
کیا خبر سامنے کون آئے
غیر مردوں کا پھیرا نہ ہو جائے
شب سے پہلے اندھیرا نہ ہو جائے

اندھیرے میں غیر مرد کے آ جانے کے خیال سے پھر تیز قدمی سے چل کھڑی ہوتی ہے۔ ندی کے قریب پہنچ کر پھر اس طرح بہک اٹھتی ہے۔

موج دریا کو یہ کس کی دھن ہے
راگ پانی کا کیا مست کن ہے
شام کلیاں ہوا گا رہی ہے
بانسری کی صدا آ رہی ہے

دیکھو! کشتی میں بیٹھا ہے کوئی
اجنبی مرد وا سا ہے کوئی
بانسری اس کے منہ سے لگی ہے
زیر و بم کی ہوا کیا بندھی ہے
بانسری کیا بجاتا ہے آہا
راگ کیسا سناتا ہے آہا

سن کے ہر ایک سُن ہو رہا ہے
دھن میں ہوش و خرد کھو رہا ہے
وجد میں عقل کس کی بجا ہے
میں اگر باولی ہوں تو کیا ہے
کان نغمے سے پر ہو رہے ہیں
بلبلے پھوٹ کر رو رہے ہیں
ہے کوئی شعبدہ گر کہ ساحر؟
میں بھی دیکھوں کہ ہے کون آخر

"میں بھی دیکھوں" کہہ کر آگے بڑھتی ہے پھر جھجک کر کہتی ہے۔

غیر محرم سے کیونکر ملوں میں
آنکھیں تلووں سے کیونکر ملوں میں
آرزو دل کی کیونکر نکالوں
اس کو کیونکر گلے سے لگا لوں

پھر دو قدم بڑھتی ہے اور غور سے دیکھ کر چلا اٹھتی ہے۔

ہائے! میں غرق اب ہو گئی ہوں
غرق، گرداب میں تو نہیں ہوں
یہ! کوئی اجنبی تو نہیں ہے
یہ! نیا آدمی تو نہیں ہے
جس کی جویا تھی میں یہ وہی ہے
میرے گلشن کا سرو سہی ہے
آسرا، جاں مری نیم جاں ہے
یہ مری جستجو میں یہاں ہے
دوست کو غیر سمجھی ہوئی تھی
کعبے کو دیر سمجھی ہوئی تھی

یہ تو ہے میرا پیارا کنھیا
میری آنکھوں کا تارا کنھیا

امجد حیدرآبادی

مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ

مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے (علیگ)

[ہم خود کبھی ایسی اوندھی سیدھی ضرب المثل کے قائل نہیں تھے اور اس نظریہ کو شکاریوں کا زعم باطل سمجھتے تھے۔ لیکن آخرش ایک عجیب و غریب طرح اسکا قائل ہونا پڑا۔ محض بحث کیلئے اور اس نظریہ کے لئے سمجھ لیجئے کہ گھٹنے کے معنی ہیں ہمارا نوکر احمد۔ اب صرف دو گھریلو واقعات سُنئیے۔]

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے شبو چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے ہم لوگوں کو اس طرح پنکھا جھل رہی تھی کہ ہوا تو صرف خانم کو لگے اور (ڈنڈی) میری طرف گھومتی رہے۔ احمد پانی کا گلاس لئے اس طرح کھڑا تھا کہ بس نہیں زبردستی پانی پلا دے۔ خانم نے کہا پانی۔ احمد نے گلاس دیا۔ خانم نے ایک گھونٹ مشکل سے لیا۔ توبہ کر کے گلاس میز پر رکھ دیا۔ پانی گرم تھا۔ خانم نے کہا ہم کھولتا ہوا پانی نہیں پیتے۔ سامنے ہی برف والے کی دوکان تھی احمد سے کہا گیا کہ "لپک کے سیر بھر برف تو لے آ۔"

اب احمد کی نالائقی ملاحظہ ہو۔ آج آتا ہے نہ کل۔ خانم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر توبہ کیجئے۔ احمد نہ آیا۔ مجبوراً گرم پانی سے پیاس تیز کی۔

آخرش احمد آیا۔ خانم نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ "کمبخت اب آیا ہے تو برف لے کر۔" احمد نے جواب میں کہا "برف نہیں ملی۔"

اب آپ غور فرمائیں کہ ایک تو مروڑی گھنٹہ بھر بعد آیا اور پھر برف نہ لایا۔ وجہ جو دریافت کی تو کہنے لگا۔ کہ برف والا۔ ایک دوسری دوکان پر تھا آیا تو معلوم ہوا کہ برف نہیں ہے۔ جب خانم نے اس حیلہ کو نہ مانا تو کہنے لگا کہ یقین نہ ہو تو دوکان تو سامنے ہی ہے پوچھ لیجئے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ اب بتائیے کہ اس کا کیا علاج۔ خانم کو بیحد غصہ آیا۔ خانم نے پوری طرح مشتعل ہو کر کہا۔ "میں خوب جانتی ہوں . . . . . واقعی برف کے کارخانے ٹوٹ گئے . . . . . تیرے لئے ہم برف والے کے پاس قاصد بھیجیں گے . . . . . وغیرہ وغیرہ۔" اس کے جواب میں احمد نے پھر جو زور دیکر کہا کہ دوکاندار موجود ہے اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو جو چور کا حال سو میرا حال بس اس کا یہ کہنا تھا کہ خانم نے ادھر تو میری طرف آنکھیں نکال کر کہا کہ۔ "دیکھتے ہو تم اُسے" اور اُدھر شبو سے کہا کہ۔ "لا تو لکڑی۔"

شبو پنکھا پھینک کر لکڑی لے آئی اور خانم نے پھر جو لکڑی لے کر احمد کی خبر لی ہے تو اس حیلہ بازی کا احمد کو

سزا چکھا دیا۔

احمد کو اچھی طرح مار چکنے کے بعد خانم نے مجھ سے کہا کہ "تمہارے احمد نے میرا کھانا پینا ایک کر دیا" (واضح رہے کہ احمد کوئی خطا کرتا ہے تو فوراً اس کی ملکیت میری طرف منتقل ہو جاتی ہے) اتنا کہہ کر لکڑی پھینک کر خانم نے کچھ میری طرف رخ کیا اور ٹیڑھی ترچھی نظریں ڈال کر مجھے مطلع فرمایا کہ۔ "تجھ سے مردوے نہیں مارے جاتے" (گویا کہ میں نے ہی تو اس کام پر آپ کو تعینات کیا ہے) یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ تم خاکساری کرتی ہو۔ کچھ معذرت جو کی تو خانم نے تیز ہو کر مجھ سے دریافت کیا "کیا مجھے مردوے مارنے کے لئے لائے تھے؟"

آپ غور فرمائیں کہ میں اس احمق بیوی کو کیا جواب دیتا۔ ذرا کوئی اس سے یہ پوچھتا کہ اللہ کی بندی۔ تو کونسی ایسی تیس مار خان مشہور تھی جو ہم تجھے یہ سوچ کر لاتے کہ چلو پہلوان سے شادی کر لو اچھا ہے مردوں کو مارے گی۔ یا پھر پولیس کے تھانہ ہماری شادی سے قبل تھوڑے ٹوٹ گئے تھے۔ اور پھر یہ واقعہ ہے کہ میں ذاتی طور پر اس کے قطعی خلاف ہوں کہ لوگ اس مقصد کے لئے شادی کریں کہ بیوی سرکھنی ہوگی۔ جی میں تو یہی آیا کہ کہدوں کہ ہم سے قسم لیلو جو ہم تمہیں اس لئے لائے ہوں" ہم تو سیدھے سادے تہجد والے مسلمان ٹھیرے۔ ہم تو تمہیں ایک "اور ہی" ضروری کام سے لائے تھے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم مارنے کوٹنے میں فاضل ثابت ہوئیں۔

جب خانم نے مجھ سے اور تیز ہو کر بحث کی اور چیزوں کو ادھر سے اُدھر زور زور سے رکھنا شروع کیا۔ تو میں مطلب سمجھ گیا۔ ہوں نا آخر کو نباض۔ احمد تو شدبد کئے ہی جا رہا تھا۔ لکڑی بھی وہیں پڑی تھی۔ اٹھا کر بطور اتمام حجت میں نے بھی ایک دو درجن لکڑیاں احمد پر گن دیں اور اس کے بعد جو خانم کے دلچسپ چہرہ کی طرف دیکھا ہی تو معلوم ہوا کہ شوہر اور بیوی کے روحی تعلقات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ خانم کی طبیعت میں فرحت تھی۔ شبّو اپنے شوہر محترم کو ایک روحی اطمینان اور قلبی سرور کے ساتھ اپنے نام نہاد گھونگٹ میں سے دیکھ رہی تھی کس طرح؟ واللہ اعلم۔ مگر احمد خانم کی نظر بچا کر کام کرتے میں شبّو کی طرف اس طرح دیکھتا تھا کہ بس نہیں کچا چبا جائے۔ وجہ معلوم۔

دوسرا ثبوت

اس واقعہ کے کوئی تین چار روز بعد کا ذکر ہے کہ میں نے خانم سے پوچھا "کیا بسکٹ ختم ہو گئے؟" (میرے الفاظ کو بھول نہ جائیگا۔ میں نے یہی الفاظ کہے تھے۔

خانم سامنے والے کمرہ میں تھی۔ وہیں سے چیخ کر پکاری "احمد کو مارو" اور ساتھ ہی خفگی آمیز گفتگو کا ایک ریلا سا آیا۔ کمرے میں معلوم ہوا کہ غدر ہو رہا ہے۔ او ہو! میں نے دل میں سوچا ہو گیا ستم۔ بسکٹوں کے بارے میں پھر پوچھ لونگا۔ اس نالائق احمد نے معلوم ہوتا ہے کوئی نیا شگوفہ چھوڑا ہے اگر خانم سے مارنے کی وجہ پوچھتا ہوں تو منطق سے وہ ویسے ہی واقف ہی فوراً ثابت کر دیگی کہ میرا مطلب یہ تھا کہ احمد نہ مارا جائے۔ اور پھر ایک "فنا فی القوم" شوہر کو اس سے کیا بحث کہ گورنمنٹ نے حکم کیا دیا ہے۔ اسے تو تعمیل سے مطلب ہے۔ لہذا میں نے احمد پر سخت حملہ کیا۔ وہ یہی کہتا رہ گیا کہ "سنئے تو۔ سنئے تو میں نے کیا کیا؟" وغیرہ وغیرہ مگر تو بہ کیجئے، قبل اس کے کہ وہ اپنے پٹنے کی وجہ ہی معلوم

کر سکے اچھی طرح پٹ چکا تھا۔ اور پھر انصاف سے دیکھا جائے تو وجہ مجھے خود معلوم نہ تھی۔ میں اسے بتاتا کیا خاک اور قبل اس کے کہ میں اسکو کہوں کہ مجھے تیرے مار ی جانے کی وجہ نہیں معلوم۔ خانم بکتی جھکتی پہنچی۔ ہاتھ میں پنکھا تھا منہ ہی منہ پر خانم نے پنکھے رسید کئے اور اسی دوران میں مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ میں نے احمد کو کیوں مارا تھا اور احمد کو یہ معلوم ہوگیا کہ میں کیوں پٹا تھا اور کیوں پٹ رہا ہوں۔

آپ بھی وجہ سن لیجئے۔ احمد کا فرض تھا کہ ایک دن پہلے بسکٹوں کا پتہ چلائے کہ ختم ہوگئے یا نہیں اور ضرورت ہو تو لے آئے۔ اس نے کیوں ایسا نہیں کیا؟ یہ خطا تھی۔ اب مجھے معلوم ہوگیا اور غالباً آپ بھی جان گئے ہونگے کہ میں نے جو پوچھا تھا کہ "کیا بسکٹ ختم ہوگئے"؟ اس سوال کا یہ طول طویل اور "خوبصورت" جواب تھا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھا۔

اب لطف سنئے احمد نے معذرت کی اور اسی سلسلہ میں اپنی چہیتی بیوی شبتو کو پٹوانا چاہا۔ یہ کہہ کر کل جب اس نے شبتو سے پوچھا کہ بسکٹ ہیں یا نہیں تو اس نے کہہ دیا کہ ہیں اور کوئی ضرورت نہیں۔ لہذا احمد نے خانم سے یہ کہا کہ شبتو کو بھی مارا جائے۔ خانم بھلا شبتو کے خلاف کیوں سننے لگی احمد کو ایک ڈانٹ بتائی گئی کہ حجت اگر کی تو اور مارے جاؤگے۔ جاؤ اور جلدی بسکٹ لاؤ۔

اب ایک اور لطف سنئے۔ شبتو چائے تیار کر رہی تھی۔ بسکٹ بھی موجود تھے! اپنے شوہر محترم کے مارے جانے پر شبتو کیسی خوش تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ احمد تو پٹ رہا ہے اور وہ منہ سے نہیں بولتی کہ بسکٹ ہیں۔ پھر طرفہ یہ کہ وہ خندہ فرما رہی تھیں اور اب ستم انہوں نے یہ فرمایا کہ چپکے سے مسکرا کر احمد کو بسکٹ ہلا کر دکھایا۔ یہ جتانے کو کہ یہ دیکھو بسکٹ۔ تم پٹا گئے اور ہم دیکھا کئے۔ ظاہر ہے کہ اس اظہار محبت کا احمد کے پاس کیا جواب تھا۔ ایکدم سے باورچی خانہ سے ڈہوں ڈہاں کی آواز آئی۔ شبتو کو احمد نے بغیر نوٹس دیئے ٹھونکا۔ شبتو کی فلک شگاف چیخ سنکر خانم آگ بگولہ ہوکر پہنچی اور قبل اس کے کہ یہ قصہ معلوم ہو خانم نے احمد کو ٹھونک بجا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد یہ قصہ معلوم ہوا کہ بسکٹ تو ہیں اور شبتو نے احمد کو پٹوایا اور پھر بعد میں چڑانے کیلئے بسکٹ ہلا کر دکھایا۔ احمد نے مجھ سے شکایتاً رونی آواز میں کہا کہ "آپ نے یونہی کہہ دیا کہ بسکٹ نہیں ہیں اور پھر خوب مارا"۔ اب غور فرمائیے کہ میں نے کب کہا کہ بسکٹ نہیں ہیں میں نے تو پوچھا تھا کہ بسکٹ ہیں یا نہیں۔ میں کیوں کہتا۔ مجھے ان معاملات سے کیا سروکار میں نے تو صرف پوچھا تھا کہ بسکٹ ہیں یا ختم ہوگئے۔ اب خانم نے بھی غلطی محسوس کی۔ میں نے تو پوچھا تھا اور وہ دراصل دور ہونیکی وجہ سے صاف سن نہ سکی اور یہ سمجھی کہ بسکٹ ختم ہوگئے اور میں کہہ رہا ہوں "بسکٹ ختم ہوگئے"۔ چونکہ ایک منتظم بیوی ہے اور کچھ روز پہلے احمد سے اس کا پختہ وعدہ کر چکی تھی کہ اگر ایسا ہوا تو بہت مارونگی۔ لہذا اس نے مجھے سے نادرشاہی حکم دیا کہ احمد کو مارو۔ اور میں نے اسوجہ سے حکم کی تعمیل کی میں جلدی کی کہ کہیں میرے سر پر الزام نہ آئے کہ حسب عادت قدیم نوکروں کو بگاڑ رہا ہوں قصہ مختصر غلطی ہوئی اور سخت غلطی ہوئی۔ کہا کچھ سنا گیا کچھ مگر اب کیا کیا جائے؟ احمد تو پٹ چکا تھا۔

جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ اب احمد کی عقلمندی دیکھئے کہ لگا بد تمیزیاں کرنے۔ یعنی بیقصور پٹ جانے پر

ریچ کہنے۔ یہ تو سراسر گستاخی ہے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ تو بے قصور پٹ گیا تو پھر بار بار ، کہنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر لگے ہاتھوں برف والے معاملہ کا بھی اس نے ذکر کردیا۔ کیونکہ وہ دوسرے روز ثابت کرچکا تھا کہ واقعی برف نہیں تھی اور ہمیں بھی تسلیم تھا کہ نہیں تھی تو اس کے معنی یہ تو نہ ہوئے کہ بقول خانم "ڈھکڑے" گائے جاؤ۔ مگر احمد تو احمد ہے۔ نہ مانا۔ نتیجہ یہ کہ خانم کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور خانم نے تہیہ کرکے احمد سے پوچھا۔ "یہ ڈھکڑے تو ہم نے سن لئے اب ذرہ یہ تو بتا کہ تو نے "ہماری" (لفظ ہماری پر زور) شبتو کو کیوں مارا۔ کیا ہم اُسے تیری مارنے کے لئے لائے ہیں؟"

احمد نے وجوہات بیان کئے۔ بسکٹ ہوتے ہوئے اس کی مجرمانہ خاموشی کی وجہ سے احمد کا بے قصور پٹنا اور پھر اس کا اپنے خدائے مجازی کو بسکٹ دکھا کر چڑانا۔ خانم نے کچھ سنجیدگی سے وجوہات سنے۔ میں نے بھی واقعی شبتو کو خطاوار گردانا۔ خانم نے شبتو کو اسطرح "شبتو چڑیل" کہہ کر پکارا کہ احمد خوش ہی تو ہوگیا کہ اب پٹتی ہے شبتو۔ شبتو بھیگی بلی بنی ہوئی آئی۔ خانم نے معاملہ کی تحقیقات کی۔ خانم نے پوچھا کہ تو کیوں نہ بولی کہ بسکٹ ہیں اور تو نے کیوں بسکٹ ہلا کر دکھایا۔ اس نے وجوہات یہ بیان کئے کہ بولی وہ اس وجہ سے نہیں کہ ڈر لگا اور بسکٹ ہلا کر اس لئے دکھایا کہ معلوم ہوجائے کہ بسکٹ ہیں اور احمد لینے نہ جائے

احمد نے خوش ہو ہو کر بڑھ بڑھ کر شبتو کے خلاف الزام دیئے۔ خانم نے بھی شبتو کو حرافہ۔ قطامہ وغیرہ کے لقب دیئے۔ مگر عین اسوقت پر جب احمد کو اس کا پورا یقین ہوگیا کہ اب شبتو پٹے گی خانم نے ایک دم سے رخ پلٹا۔ اور احمد سے کہا۔ "ہم نے سب سن لیا . . . . ٹھیک ہے اسے میں پھر ٹھیک کرونگی مگر اب تم اس سے معافی مانگو!"

عرض ہے کہ ہم خود وکیل ہیں۔ مقدمات میں قابل عدالت کے ایسے ایسے فیصلہ سنتے ہیں کہ توقع کچھ اور ہے اور فیصلہ کچھ اور۔ ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں مگر خانم کے اسوقت کے عجیب وغریب فیصلہ سے میں سچ مچ چونک پڑا۔ میرے منہ سے نکلا۔ "ارے الہی احمد معافی مانگے"

"اور کیا" خانم نے ایک دم سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بیویاں اس لئے ہوتی ہیں کہ انہیں مارا جائے ؟ غضب ہو خدا کا! اس نے کوئی خطا کی تو مجھ سے کہتا۔ مگر نہیں۔ وہ تو مارنے لگا۔ ایسے اس کے باپ کی زرخرید لونڈی ہے نا۔ بیویاں کوئی چیز ہی نہ ہوئیں . . . . . (احمد کی طرف) احمد . . . . . بس خیریت تمہاری اسی میں ہے مانگو شبتو سے معافی؟" خانم نے آنکھیں لال کرکے احمد سے کہا۔

اب احمد کی عجیب حالت تھی مجھے طرف دار بنانے کی کوشش کی۔ میں بڈھا وکیل عدالت کا رخ پہچان کر میں نے احمد کی التجا کا جواب اس طرح دیا کہ خانم کی طرف دیکھا پھر دوسری طرف دیکھ کر لاپرواہی سے ایک انگڑائی کو جمائی پر ختم کرکے لیٹ گیا۔ اُدھر خانم نے فیصلہ کن بات کہہ دی۔ "سب ٹھیک ہے مگر بیویاں مارنے کی چیز نہیں ہوتیں" گویا مطلب یہ کہ صرف پیار کرنے کی چیز ہوتی ہیں خواہ وہ کلمُنی ہوں یا مرکھنی!۔ اور واقعہ بھی دراصل یہی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی خانم کی تائید کی۔ میں نے بھی کہا۔ "خطا تو تھوڑی بہت شبتو کی ہے مگر اس نے اُسے مارا کیسے؟"

نتیجہ اس کا یہ کہ احمد نے شبتو سے معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ خانم نے احمد کو مارا اور مار چکنے کے بعد پھر میری

اوپر وہی الزام دیا کہ میں آسے "مُردُوں" کو مارنے کے لئے لایا ہوں۔ میں نے اس طرح انکار کیا کہ خود احمد کو مارا۔ خانم نے رسماً شبّو سے بھی احمد کو پٹوایا۔

شبّو اور احمد کی دشمنی ٹھن گئی۔ خانم نے انتقاماً میاں بیوی کی بول چال بند کرا دی یہ کہہ کر کہ "اگر تم میں سے ایک دوسرے سے کوئی بھی بولا یا بات کی تو اسی کا منہ کاٹ لونگی"۔ میں بہت دیر تک غور کرتا رہا کہ منہ کدھر سے اور کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔ صرف ہونٹ کاٹے جائینگے یا زبان یا پھر دانت وانت ملا کر سب "منہ" کاٹ لیا جائیگا۔ جی میں آیا پوچھوں مگر پھر رہنے دیا۔

غزل

جناب خادم علی خانصاحب اخضر

قفس کی رات ہی خوابِ چمن کو داستاں کر لیں
سحر ہونے کو آئی دل سے یادِ آشیاں کر لیں

ہمیں یہ ضد ہے لوگوں کو کہ ہم ضبطِ فغاں کر لیں
نشیمن ہی قفس کو بھی الگ اے باغباں کر لیں

تغافل ہو چکا اُن کا قیامت ہو چکی دل پر
مناسب ہو تو اب دو چار آہیں ناتواں کر لیں

نتیجہ کچھ نہ ہو اے آسماں خونِ تمنا کا
بس اتنا ہو کہ ہم ہر رنگ میں اپنا بیاں کر لیں

غنیمت ہی جو اتنا بھی رہے ہنگامۂ محشر
کہ دیوانے تمہارے ختم اپنی داستاں کر لیں

محبت میں وفا کی آرزو اک دل کی فطرت ہے
مگر تقدیر کو کیونکر نصیبِ دشمناں کر لیں

لہو آتا رہے رس رس کے دل کا اشکِ پیہم میں
کہ اپنی بے زبانی کی حکایت بے زباں کر لیں

تڑپتی رہ نہ جائیں ڈھونڈ لیں وہ سب رگیں دل کی
جہاں تیروں کی گنجائش نظر آئے نشاں کر لیں

حسینوں کی اُداسی بھی قیامت ہو گئی اخضر
کسی تدبیر سے ہم اپنے دل کو پھر جواں کر لیں

آہنگِ تپش

اثر جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے (آنرز) ایم او ایل (یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ)
لیکچرار گورنمنٹ کالج ملتان !

باعثِ نغمۂ صد رنگ ہے اُلفت تیری
کیا کرے اب لبِ خاموش شکایت تیری

چٹکیاں لیتی ہے دل میں جو محبت تیری
شکر کے پردے میں ہوتی ہے شکایت تیری

جان جائے کہ رہے قدرِ وفا ہو کہ نہ ہو
دمِ آخر بھی لبوں پر ہو حکایت تیری

ماہ و خورشید سے روشن ہے فقط روئے زمیں
نور افزائے دل و جاں ہے محبت تیری

گوشے گوشے میں ترے عالمِ شکوہ ہے نہاں
اے دلِ تنگ قیامت کی ہے وسعت تیری

روسیاہوں کے گناہوں کی حقیقت کیا ہے
چارہ چھینٹوں میں مٹا دیتی ہے رحمت تیری

دلِ بیتاب نے بدلے ہیں ہزاروں پہلو
نہ نکلنی تھی نہ نکلی کبھی حسرت تیری

بن گئیں پردۂ نظارہ بکھر کر نظریں
اُڑ گئے ہوش میرے دیکھ کے صُورت تیری

پرتوِ حُسنِ خود آرا ہے ہر اک شے میں تپش
رشکِ آئینۂ حیرت ہے یہ صُورت تیری

باپ کا انتقام

(ڈرامہ)

ازجناب مرزا ادیب

منظرِ اوّل

رکیفہ کے شمال کی جانب نہر المقطع کے کنارے ایک مختصر سے شاداب حصے میں جہاں طرح طرح کے پھول ہزنظارہ طلب آنکھوں کو قدرتی حسن کی فراوانیوں کی دعوت عام دے رہے ہیں۔ چند شکستہ مکانات آباد ہیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے مکان کے دالان میں حلیمہ اپنے سات سالہ لڑکے یوسف کے پاس بیٹھی ہے یوسف کی داہنی جانب ایک چھوٹے سے پودے کی پھیلی ہوئی شاخیں پھولوں کی طرف اس طرح جھک رہی ہیں۔ جس طرح ایک ماں اپنے خوابیدہ شیر خوار بچے کی طرف اسکے ہونٹوں پہ معصوم تبسم تھرتھراتے دیکھ کر بے اختیارانہ، ہاتھ پھیلاتے ہوئے۔ جھک پڑتی ہے۔ دور سے مجاہدوں کے نعرۂ اللہ اکبر کی صدا جس کے آغوش میں الوہیت کے روح پرور و ایمان افروز نغمے تیر رہے ہیں، دامانِ ہوا کو چاک کرتی ہوئی، پہاڑوں سے ٹکراتی۔ فضائے لامحدود میں پھیل جاتی ہے —— یوسف کی نگاہیں —— سراپا استفہام نگاہیں۔ حلیمہ کے چہرے پہ پڑتی ہیں۔ پھر ادہر جدھر سے صدا بلند ہو رہی ہے مڑ جاتی ہیں۔ حلیمہ پیار سے یوسف کے چہرے پر جھک جاتی ہے۔

یوسف ۔ اُمّی جان! یہ کس کی آواز ہے —— ؟

حلیمہ ۔ بیٹا! یہ ان مجاہدوں کے نعرے ہیں جو جہاد کر کے میدانِ جنگ سے واپس آرہے ہیں —— ان میں تمہارا باپ بھی ہوگا۔

یوسف ۔ یہ جہاد کیا ہوتا ہے —— ؟

حلیمہ ۔ جہاد؛ —— خدا کی راہ میں جنگ کرنے کا نام جہاد ہے —— (پر اشتیاق لہجہ میں) اکیا بیٹا تم بھی جہاد کروگے —— ؟

یوسف ۔ ہاں امّی، میں جہاد کرونگا۔

حلیمہ ۔ (یوسف کو محبت سے لبریز سینے سے لگا کر) ننھے معصوم بچے! مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے (دیوار پہ آلاتِ حرب کی طرف اشارہ کر کے) وہ دیکھو تمہارے خوبصورت کھلونے۔ وہ دیکھو چمکتی ہوئی تلوار —— ! وہ دیکھو نور پاش تیغ!! بیٹا مسلمان بچوں کے یہی کھلونے ہوتے ہیں اور تمہیں اُنہی کھلونوں سے کھیلنا ہوگا —— وہ وقت کیسا مبارک ہوگا جب تم تلوار اپنے مضبوط ہاتھوں میں لئے۔ اسلامی جوش سے معمور نعرے

نکلتے ہوئے۔ میدان جنگ میں لڑو گے ــــ جہاد کرو گے

یوسف۔ امی جان ضرور لڑوں گا۔ (مستفسرانہ لہجہ میں) آبا جان بھی غازی ہیں؟

حلیمہ۔ تمہارے ابا جان ہی غازی نہیں بلکہ ہر ایک مسلم نوجوان غازی ہے۔ تین سال ہوئے تمہارا بھائی ان ہی کھلونوں سے کھیلتا ہوا شہید ہوگیا۔ اسدن پیارے بیٹا میں بہت خوش ہوئی تھی خدا کرے تم بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلو۔

(نعروں کی آواز برابر آرہی ہے)

یوسف۔ حارث؟ ــــ حارث میرا بھائی ــ ؟؟

حلیمہ۔ ہاں حارث تمہارا شہید بھائی جو اسوقت فردوس میں ہے!

یوسف۔ فردوس کسے کہتے ہیں ــــ ؟

حلیمہ۔ یوسف! جو جہاد کرتا ہوا مر جاتا ہے وہ فردوس میں جاتا ہے۔ فردوس ایک بہت خوبصورت باغ ہے جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور جہاں خداوند کریم کی ہر ایک نعمت ملتی ہے ــــ ! تم بھی شہید ہوگے تو فردوس میں جاؤ گے ــــ !

یوسف۔ (جوش سے بازو اٹھاتے ہوئے) میں ضرور شہید ہونگا ــــ ضرور (نعروں کی آواز زیادہ بلند سنکر) غازی آگئے ہیں۔ ابھی آبا جان آکر مجھے گود میں اٹھالیں گے۔ اور جنگ کے حالات سنائینگے!

حلیمہ۔ کیا تمہیں جنگ کے حالات سننے میں لطف آتا ہے؟

یوسف۔ بہت۔ جب آبا جان اپنی بہادری کا ذکر کرتے ہیں تو میرا جی بھی چاہتا ہے کہ بہادر بنوں۔ ابا جان آئینگے تو میں ان سے کہونگا مجھے بھی جنگ میں لے چلیں!

حلیمہ۔ (فرط محبت سے یوسف کی پیشانی چوم کر) تم ابھی بچے ہو۔ تلوار نہیں اٹھا سکتے، جوان ہو کر لڑنا۔ تمہارا بھائی بھی جوان ہو کر لڑا تھا۔

یوسف۔ وہ کب جوان ہوا تھا؟

حلیمہ۔ تیرہ سال کی عمر میں، ــــ ابھی چھ سال تک تم گھر ہی پر رہو!

یوسف۔ نہیں امی میں چھ سال تک نہیں ٹھیر سکتا جب میں تلوار اٹھانے کے قابل ہو جاؤنگا۔ میدان جنگ میں جاؤنگا ــــ (دیوار سے لٹکی ہوئی تلوار کو دیکھ کر) میں تلوار کو اٹھا سکتا ہوں ــــ اور ــــ

(ایک ضعیف العمر مجاہد جس کے چہرے سے غم و مسرت کے ملے جلے اثرات مترشح ہیں آتا ہے اور حلیمہ کے سر پر نہایت محبت سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ یوسف نانا جان کہتا ہوا۔ اسکی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے)

حلیمہ ــــ آگئے ــــ ؟؟

معمر مجاہد۔ نہیں بیٹی اس کی مراد پوری ہوگئی۔ خوش ہو کہ آج تیرے خاوند نے رتبہ شہادت حاصل کرلیا اور میں ــــ محروم ہی رہا ــــ !

(حلیمہ کی آنکھوں سے، باوجود ضبط کے دو آنسو گر پڑتے ہیں)

یوسف۔ امی آبا جان آگئے ــــ؟ میں ابھی ان کی گود میں چلا جاؤنگا۔

حلیمہ ــ نہیں بیٹا، وہ تمہیں گود میں نہیں لیں گے، انہیں فردوس نے اپنی گود میں لے لیا۔

یوسف۔ کیا وہ فردوس کو چلے گئے؟

حلیمہ ــ ہاں تمہارے بھائی کی طرح وہ بھی فردوس کو

چلے گئے ـــــ کسی نے انہیں شہید کر دیا۔

یوسف ۔ کس نے انہیں شہید کر دیا۔

حلیمہ ۔ کسی ظالم کافر نے ـــــ (آنسو اسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگتے ہیں)

یوسف ۔ امی آپ رو رہی ہیں۔ ابا جان تو فردوس کو چلے گئے جو بہت اچھا باغ ہے اور جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔

حلیمہ ۔ (یوسف کے جذبے سے متاثر ہو کر) شاباش شہید کے بیٹے! خدا کرے تو جوان ہو کر اپنے باپ کے ظالم قاتل سے بدلہ لے (یوسف کا ہاتھ تھام کر) کیا بیٹا تو اپنے باپ کا انتقام لے گا۔؟

یوسف ۔ (اچھل کر) امی میں ضرور اپنے باپ کے قاتل کو ہلاک کرونگا ـــــ ضرور ـــــ میں وعدہ کرتا ہوں ـــــ!

حلیمہ ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ـــــ!

(حلیمہ یوسف کو مہر آنگیز نگاہوں سے دیکھتی ہے)

ـــــ(پردہ)ـــــ

منظر دوم

پہلے منظر کے واقعہ کو گذرے ہوئے، بارہ سال گذر گئے ہیں۔ صلیبی جنگ متصل جاری ہے۔ مسلمانوں نے اجنادین کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ یوسف جس کی عمر اسوقت کم و بیش انیس سال ہے۔ قیساریہ کے ایک سرسبز میدان میں، ایک بلند و عالیشان عمارت کے سامنے سبزے پر، ہیلن عیسائی دوشیزہ کے زانو پر سر رکھے لیٹا ہوا ہے۔ اس کے بازو اور سینے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے زخم لگے ہیں۔ یکایک یوسف کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ ہیلن کے خوبصورت چہرے پر مچلتی ہیں اس کی آنکھوں سے تصادم کرتی ہوئی، ایک طرف سبزے پر جھک جاتی ہیں۔ پھر اٹھتی ہیں اور اس کے گیسوئے سنبل طراز میں کھو جاتی ہیں ـــــ ہیلن کے لبوں پر ـــ گلاب کے سے نازک لبوں پر تبسم لرزتا ہے۔ اور وہ ایک دلاسے، مسحورانہ، ایک طرز محبوبانہ سے، موسیقیت پرور آواز میں یوسف کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہتی ہے۔

ہیلن ۔ یوسف! اب تمہارے زخم مندمل ہو گئے ہیں

یوسف ۔ پیاری ہیلن جسم کے زخم تو مندمل ہو چکے ہیں اور ہوتے کیوں نہ جبکہ تمہارے مرہم بخش ہاتھ ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں ـــــ مگر جگر کے زخم تو ـــــ

(یوسف کا مطلب بھانپ کر) جفاکاروں نے تو مجھے تختۂ بیداد بنانے اور میری عمر تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ یہ تمہاری مہربانی تھی کہ زخم کھا کر بھی مجھے ان کے پنجہ آہنی سے بچا لیا ـــ واقعی میں تمہاری بہت شکر گذار ہوں،

شکر گذار ہونے کی کوئی وجہ نہیں، پیاری ہیلن میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔ ایک نوجوان مسلم جس کی رگوں میں اسلامی جوش کا خون بہہ رہا ہو۔ جس کے سینہ میں اسلامی تعلیم کی شعاعیں پرتو افگن ہوں۔ کبھی اپنے دشمن سے دشمن کو بھی مصیبت میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتا تمہارا تو معاملہ ہی اور ہے ـــــ!

ہیلن ۔ اگر تمہارا مذہب تمہیں یہ تعلیم دیتا ہے تو بہت اچھا مذہب ہے ـــــ!

یوسف ۔ ہمارے مذہب میں بے شمار خصوصیات ہیں۔



حون ٮس ارک





مطالعه

جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں !

ہیلن۔(مسکرا کر) ہو نگی (پٹیوں کی طرف دیکھ کر) اگر کہو تو تمہارے سینے کی پٹی کھول دوں زخم تو مندمل ہو چکے ہیں اب ان کی کیا ضرورت ہے۔

یوسف۔ بیشک، کھول دو، مگر پہلے بتاؤ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے ۔۔۔ ؟

ہیلن۔(ان سنی کر کے) شاید بازو کے زخم اندمال پذیر نہیں ہوئے۔

یوسف (ہیلن کے ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر) ہیلن میں کیا کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔ ؟

ہیلن۔(شرمائی ہوئی نگاہیں ایک طرف ڈال کر) تم کیا کہہ رہے ہو ؟

یوسف۔ اللہ رے شان استغنا گویا ابھی سنا ہی نہیں

ہیلن۔ سناؤ میں سنتی ہوں۔

یوسف۔ میں تو اب نہیں سناتا۔

ہیلن۔ اور میں بھی نہیں سنتی۔

یوسف۔ تمہیں سننا پڑے گا۔

ہیلن۔ کیا ۔۔۔ ؟

یوسف۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے ؟

ہیلن۔(شرما کر) سن لیا۔

یوسف۔ بس ہیلن ؟

ہیلن۔ اور کیا ۔۔۔ ؟ تم نے سنا دیا میں نے سن لیا

یوسف۔ اس کا جواب ؟ میری التجا ئے محبت کا جواب ؟ میری گذارش الفت کا جواب ؟

ہیلن۔(آنسو بہا کر) یوسف اس کا جواب میری آنکھوں سے پوچھو۔ جن میں تمہاری الفت چھائی ہوئی ہے۔اس کا جواب میرے دل سے پوچھو جس کی فضا میں نغمات محبت تیر رہے ہیں۔ اس کا جواب میرے سینے سے پوچھو جہاں تمہارے نقوش الفت مرتسم ہیں ۔۔۔۔ "

یوسف۔(ہیلن کا ہاتھ نہایت گرمجوشی سے دبا کر) بس اب میں اور کچھ نہیں چاہتا ۔۔۔ !

ہیلن ۔ اب میں تمہارے سینے سے پٹی کھول دیتی ہوں (پٹی کھولنے لگتی ہے)

یوسف۔ ہیلن! تمہارے والد کہاں ہیں۔ میں تین دن سے یہاں ہوں لیکن تمہارے والد کو نہیں دیکھا۔

ہیلن ۔ وہ جنگ کو گئے ہوئے ہیں ۔۔۔ !

یوسف جنگ ؟ (ایک بھولی ہوئی بات یاد کر کے) جنگ ! ہیلن مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ چھوڑ دو۔ جہاں تم نے میری سینے کے اوپر سے پٹی کھولی ہے ۔ وہیں سینے کے اندر احساس فرض کے اوپر سے بھی فراموشی کی پٹی اتار دی ہے۔

ہیلن۔(گھبرا کر) پیارے یوسف، کیا ہے ؟ ۔۔۔ کیا ؟

یوسف ۔ کچھ نہیں ۔صرف والد کا انتقام ۔۔۔ ہیلن الوداع (ایک فوری جذبے کے ماتحت اٹھ بیٹھتا ہے) اگر زندہ رہا تو تم سے آملونگا، وگرنہ ۔۔۔۔ ،

ہیلن۔ (یوسف کے ہاتھ تھام کر) نہیں یوسف میں تمہیں نہیں جانے دونگی۔ کیا تمہیں میری حالت پر رحم نہیں آتا ۔۔۔۔ یوسف میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔۔۔،

یوسف ۔ اور میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔۔۔ لیکن میرے والد کو شہید کرنے والا بھی زندہ نہیں رہ سکتا

ہیلن ۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ۔۔۔ ؟

یوسف ۔ ہاں عزیز از جان ہیلن !

ہیلن ۔ ایک شرط پر جا سکتے ہو ۔۔۔ !

یوسف ۔ کیا ؟

ہیلن ۔ وعدہ کرو جنگ سے آکر مجھے ملوگے ۔

یوسف ۔ ہیلن ۔ میں دل سے وعدہ کرتا ہوں ۔ جان سے وعدہ کرتا ہوں ۔ بلکہ دل و جان سے زیادہ عزیز ایمان سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر سب سے پہلا کام جو میں کرونگا وہ تمہارے پاس آنے کا ہوگا ——— !

ہیلن ۔ کیا تم میرے والد کی حفاظت بھی کروگے ؟

یوسف ۔ اگر ہو سکا تو ضرور کرونگا (کچھ سوچکر) تمہارے والد کا نام کیا ہے ۔

ہیلن ۔ بولاس ۔

یوسف ۔ (بولاس زیر لب دہراتے ہوئے) یہ نام تو میں نے بھی سنا ہے ——— لو اب الوداع ۔

ہیلن ۔ آہ تم کس قدر ستم طراز ہو ——— کیا تمہارا فرض نہیں کہ میری محبت کا جواب دو ؟

یوسف ۔ فرض ہے ۔ لیکن اس سے بڑا وہ فرض ہے جو میں ادا کرنے چلا ہوں ۔ ہیلن تم میری جان کی مالک ہو ایمان کی نہیں ——— اور وہ فرض ایمان سے تعلق رکھتا ہے ——— لو اب رخصت ——— ہاں اپنا رومال مجھے دیدو ——— میری تسکین کرتا رہیگا ۔

ہیلن ۔ (رومال دیتے ہوئے) خدا اور یسوع تمہاری مدد کریں

(یوسف چلا جاتا ہے)

———(پردہ)———

منظر سوم

(اجنادین کا قلعہ فتح ہو چکا ہے اور اسکی بلندی پر اسلامی عظمت کا پرچم لہرا رہا ہے ۔ فاتح مسلمان فلک شگاف نعرے لگاتے برق رفتار تیزی سے قلعے میں گھس رہے ہیں اور ہزیمت خوردہ عیسائی یا تو سر پر قدم رکھے بھاگ رہے ہیں یا مسلمانوں کی امان میں آگئے ہیں ۔ قلعہ سے جنوبی جانب آدھ میل کے فاصلے پر یوسف اپنا گھوڑا دوڑاتے چلا آرہا ہے یکایک وہ اپنے قریب ہی ایک عیسائی سوار کو دیکھتا ہے ۔ یوسف اسے جا ملتا ہے ۔ عیسائی اپنے تحفظ کے لئے تلوار اٹھاتا ہے ۔ اچانک یوسف کی نظر اسکی انگشتری پر پڑتی ہے ۔ اور وہ نہایت تیزی سے اس پر حملہ کرتا ہے عیسائی وار بچا لیتا ہے ۔)

عیسائی ۔ نوجوان ! کیا تجھے اپنی جان کی ضرورت نہیں جو خواہ مخواہ میرے ساتھ ارادہ بزدکر کے نہنگ اجل بن رہا ہے

یوسف (فرطِ غصہ سے کانپ کر) ذلیل انسان ! تو میرے باپ کا قاتل ہے ۔ یہ انگشتری میرے باپ کی ہے جو اس وقت میں تیری انگلی میں دیکھ رہا ہوں !

عیسائی ۔ (انگشتری پر نظر جما کر) ہاں یہ زید کی ہے جسے میں نے کئی سال ہوئے موت کے گھاٹ اتارا تھا ۔

یوسف ۔ اُف ظالم ۔

عیسائی ۔ (زہر خندہ ہوکر) نوجوان ! کیا تو زید کا بیٹا ہے ؟

یوسف ۔ ہاں میں زید کا بیٹا ہوں ۔ اور تیری تلاش میں عرصہ سے سرگرداں رہا ہوں ۔ شکر ہے آج تو مجھے مل گیا ، اور میرے دل سے ایک بارِ گراں اتر گیا ——— اب تو زندہ رہے گا یا میں ——— بس ایک سیکنڈ میں ہمارا فیصلہ ہو جائیگا ۔ لے سنبھل ۔

(یوسف حملہ کرتا ہے ۔ مگر اس کا وار خالی جاتا ہے)

عیسائی ۔ (کڑک کر) معلوم ہوتا ہے آج تیرے سر پر موت

کا عقاب منڈلا رہا ہے ۔ بے خبر جانتے بھی ہو میں کون ہوں؟

یوسف تم ـــــ ؟ میرے باپ کے قاتل ۔

عیسائی ۔ تمہارے باپ ہی کا قاتل نہیں بلکہ تمہارے باپ ایسے ہزاروں جوانمردوں کا قاتل (غضبناک لہجے میں) سنو میرا نام "بولاس" ہے بولاس جس کی عظمت اور بہادری کا اعتراف ایک دنیا کرتی ہے ۔

یوسف ۔ بولاس ـــــ : (دل میں) پیاری ہیلن کا والد جس کی حفاظت کے لئے اس نے مجھے اپنی پیاری اور رجاں پرور آواز میں کہا تھا ـــــ آہ میں مجبور ہوں اپنی محبوبہ کے والد سے نہیں لڑسکتا ـــــ مگر (اچانک ایک برقی لہر اس کے دماغ سے اٹھ کر دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں جا پہنچی ہے) کیا میں اپنی مرحوم والدہ کی آرزو، تمنا کو بھلا دوں ۔ اپنی زندگی کے اہم ترین فرض کو فراموشی کی چادر میں لپیٹ کر ۔ ایک سیاہ داغ جبیں روح پر لگالوں نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ وہ قبر کے کونے سے میری طرف دیکھ رہی ہے ـــــ ! میں ضرور "بولاس" کی لاش کو خون و خاک میں تڑپاؤنگا ـــــ (یوسف نعرہ تکبیر لگاکر پورے زور سے حملہ کرتا ہے ۔ عیسائی کا سر تین چار گز کے فاصلے پر جاگرتا ہے اور بے جان لاش گھوڑے سے نیچے گر جاتی ہے ۔ یوسف گھوڑے سے اترتا ہے بولاس کی انگلی سے انگشتری اتارتا ہے ۔ اُسے چومتا ہے اور اپنی انگلی میں پہنکر، گھوڑے پر سوار ہو ۔ ایک طرف غائب ہو جاتا ہے ـــــ) پردہ

منظر چہارم

(قیساریہ کی ایک وادی گلپوش)

(گوشہ مشرق سے چشمۂ نور بادلوں سے پھوٹ پھوٹ کر فضا میں ہر طرف موجزن ہے، بلند درختوں سی، جن کے اوپر نیم تاریک و نیم روشن بادل چھا رہے ہیں ۔ خوش الحان طائروں کی روح پرور و معصوم موسیقی کا طوفان شاخوں سے پتوں سے، اُمنڈ اُمنڈ کر بکھر رہا ہے ۔ چھا رہا ہے ۔ ہیلن پھولوں کے کنج میں داہنے ہاتھ پر سر رکھے خاموش بیٹھی ہے ۔ گاہے گاہے ہوا کا تیز جھونکا آتا ہے اور اس کے شانوں پر بکھری ہوئی زلفوں کو چھیڑتا، نکہت مشام پرور چیراتا چلا جاتا ہے ۔ یکایک دو آنسو، دو قطرہ شفاف کی صورت ۔ اس کی نرگسیں آنکھوں سے ٹپک کر، رخساروں پر ہوتے ہوئے، پھولوں کے ہجوم میں غائب ہو جاتے ہیں)

ہیلن ۔ معلوم نہیں اس پر کیا افتاد پڑی جو ابھی تک نہیں آیا ـــــ اُف یہ دورِ مفارقت تو مجھے مار ڈالیگا (آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں) یوسف ـــــ فریب کار تو نہیں، مگر اس غائبیت کا باعث ـــــ ؟ کہیں (کسی خیال سے تھرا اٹھتی ہے) نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، وہ طاقتور جوان ہے کوئی بھی اسے زیر نہیں کرسکتا ۔ (ایک طرف سے آہٹ معلوم ہوتی ہے ۔ ہیلن اِدھر اُدھر دیکھتی ہے ۔ ایک منٹ کے بعد یوسف گھوڑے سے اتر کر، کانپتا، جھجکتا، آتا ہے ۔ ہیلن وفور مسرت سے اچھل کر اس کے بازوؤں سے جا لپٹتی ہے، یوسف اسے علیحدہ کر دیتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

ہیلن ۔ یوسف ـــــ ؟

یوسف ۔ ہیلن! کہو،

ہیلن ۔ پیارے یوسف کیا تم وہی یوسف نہیں ہو جس

نے مجھے جفاکاروں کے دستِ تظلم سے بچایا تھا۔
یوسف۔ بیشک میں وہی یوسف ہوں ـــــ مگر ہیلن اب تمہارے قابل نہیں، میری یاد کو میری محبت کو اپنے سینے سے نکال دو، کیونکہ اس کے بعد میں تمہیں نہیں ملونگا ـــــ ہیلن میں تمہارے پاس نہ آتا مگر وعدہ کر چکا تھا، مسلمان وعدے کو کبھی نہیں توڑ سکتا خواہ تلوار اس کی گردن پر رکھی ہوئی ہو۔

ہیلن ـ یوسف تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہارے دل سے میری محبت نکل گئی ـــــ !

یوسف ـ میرے دل میں تمہاری محبت بدستور موجود ہے مگر میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جو یقیناً میری محبت تمہارے دل سے نکال دیگا ـــــ !

ہیلن ـ کون کام ـــــ ؟

یوسف ـ میں نے اپنے مرحوم باپ کا انتقام لینے کیلئے اس کے قاتل کو قتل کر دیا۔

ہیلن ـ اس کام کو تو پایۂ تکمیل تک پہنچانے تم گئے تھے۔ شکر ہے تم کامیاب ہو کر آ گئے ہو!

یوسف ـ ہاں کامیاب ہو کر آیا ہوں ـــــ مگر جانتی ہو میرے باپ کا قاتل کون تھا؟ ـــــ کس کو میں نے تیغ کے گھاٹ اتارا ـــــ ؟

ہیلن ـ کوئی ظالم ہوگا ـــــ !

یوسف ـ کوئی نہیں ـــــ تمہارا باپ بولاس"

ہیلن ـ میرے باپ بولاس کو تم نے قتل کر دیا ـــــ ؟؟ یوسف تم کیا کہہ رہے ہو ؟؟؟

یوسف ـ یہی حقیقت ہے۔ اگر یقین نہیں تو دیکھ لو (انگشتری دکھا کر) یہ تمہارے باپ کی انگلی میں نہیں تھی ـــــ ؟

ہیلن ـ (انگشتری دیکھ کر) اُف یوسف تم نے میرے باپ کو قتل کر دیا ـــــ !

یوسف ـ کیونکہ اس نے میرے باپ کو شہید کیا تھا۔

ہیلن ـ کیا تم زید کے بیٹے ہو، زید جو ایک بہادر جرنیل تھا اور جسے میرے باپ نے قتل کر کے اس کی انگشتری اپنی انگلی میں پہن لی تھی ـــــ ؟

یوسف ـ بالکل درست، اب میں جاتا ہوں، خدا حافظ! ہیلن میں تمہارے باپ کو قتل کرنے پر مجبور تھا ـــــ آہ میں کس طرح اپنی مرحوم والدہ کے الفاظ بھلا دیتا، میں نے کئی بار اس کام کو کرنے پر قسمیں بھی کھائی تھیں ـــــ ہیلن مسلمان خدا سے کئے ہوئے قول کو ہرگز نہیں توڑ سکتے۔

ہیلن ـ (سر جھکا کر) تو کیا میرے ساتھ کئے ہوئے قول کو توڑ دوگے؟

یوسف ـ کیا قول؟

ہیلن ـ قول محبت،

یوسف نہیں میرے دل میں تمہاری محبت موجود ہے۔ اور تمہارے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔

ہیلن ـ کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔

یوسف ـ بالکل سچ۔

ہیلن ـ تو آؤ مجھے آغوشِ محبت میں لے لو،

یوسف مگر میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں ـــــ !

ہیلن ـ میرا باپ بھی تمہارے باپ کا قاتل تھا۔

یوسف ـ کیا تم نے مجھے معاف کر دیا

ہیلن ـ ہاں اور ساتھ اس کے تمہارا مذہب بھی قبول ـــــ

یوسف (فرطِ مسرت سے لرزتی ہوئی آواز میں) پیاری ہیلن میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں (ہیلن اپنے آپ کو یوسف کے آغوش محبت میں چھوڑ دیتی ہے) (پردہ) فقط

فقیر و شاعر

از جناب جلال الدین صاحب حیدر دہلوی

اے گدائے رہ نشیں اے خستہ حال — جا۔ انہیں جا کر سُنا۔ حرفِ سوال
جو مسرت کیش و خوش قسمت ہیں آج — جنکے دامن۔ دامنِ دولت ہیں آج
جن کو اللہ نے دیا ہے اقتدار — جن سے ہم آغوش ہیں عزّ و وقار
جن کے تہ خانوں میں ہیں لعل و گہر — جن کے ایوانوں میں ہے انبارِ زر
جن کو کہتا ہے زمانہ فخرِ عصر — جن کے گردوں بوس ہیں ایوان و قصر
جو باطمینانِ دل مسرور ہیں — جو بزعمِ مال و زر مغرور ہیں
جن کی عیاشی کا شہرہ عام ہے — جن کو حاصل عیش صبح و شام ہے
جو صلے میں ظلم کے دشمن نواز — جبہ و دستار سے ہیں سرفراز
جو تصدق ہیں نمود و نام پر — حق و باطل کی نہیں جنکو خبر
جنکے قبضے میں یتیموں کا ہے مال — جنکے ہونٹوں پر ہے چندے کا سوال
قوم کے جو درپئے آزار ہیں — ملک کے جو رہزن و غدار ہیں
جن کی سب خدمات شر انگیز ہیں — زر سے جن کی جھولیاں لبریز ہیں
میں غریب اک شاعرِ افسردہ دل — ہوں فرومایہ پریشاں۔ مضمحل
اور تو کیا کام آ سکتا ہوں میں — شعر کچھ للہ سُنا سکتا ہوں میں

شاعرانہ اپنی فطرت کے خلاف
تجھ پہ تحسین و ستائش بھی معاف

اردو ڈرامہ نویسی پر ایک تنقیدی نظر

از جناب شیخ افتخار الرسول صاحب بیرسٹرایٹ لا

اردو لٹریچر میں کئی بار اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ ڈرامہ کی ابتدا کیسے ہوئی مگر بہت کم موقعوں پر یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈرامہ کہتے کسے ہیں اور اردو لٹریچر سے اس کا تعلق کیا ہے۔

ارسطو ڈرامہ کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہتا ہے "ڈرامہ کسی مکمل روائیداد کی ایسی نقل ہے جسے حرکات وسکنات سے ادا کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ نثر میں ہو، مگر یہ ضروری ہے کہ وہ عملاً کر کے دکھائی جائے اور تماشائیوں کے سامنے (۱) اسٹیج پر (۲) افعال کے ذریعہ انسان کی معاشرت، تمدن یا طریق کار کی تصویر اتاری جائے۔

یہ ایک امر فطری ہے کہ انسان اپنے خیالات کا اظہار اشارات اور سکنات یا گفتگو سے کرتا ہے۔ اسے بچپن ہی سے نقل وحرکت کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح چلنا پھرنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا وغیرہ لوازم حیوانی ہیں جو بغیر کسی زحمت وتکلیف کے خود بخود قدرتی طور پر عمل میں آتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح نطق و گویائی بھی انسان کا فطری خاصہ ہے۔ جس کی تخلیق انسانی دماغ سوزی وجگر کاری کا نتیجہ نہیں۔ زبان قدرت کی ودیعت کردہ نعمت ہے۔ جس میں انسان کے صنع واختراع کو کچھ بھی دخل نہیں یہ ڈرامہ کی پہلی منزل ہے۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا ہے۔ اس کے خیالات بھی وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گفتگو کرتے وقت اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے یہ کوشش کرتا ہے کہ انہیں اچھی طرح سمجھا دے۔ یہ اس کی دوسری منزل ہے، اسی طرح آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں بلند پروازی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان تخیلات اور احساسات کے اثر سے جو پیداوار ہوتی ہے۔ اس کا نام لٹریچر ہے یہ ڈرامہ کی منزل مقصود ہے۔

ڈرامہ میں چند اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اول یہ کہ اس میں تسلسل اور ہمواری ہو یعنی حالات تاریخی واقعات اور بندش کا سلسلہ ایسا ہو کہ وہ خیالات کی بہتی ہوئی ایک تیز ندی کی مانند ہوں۔ اس کا زیادہ تر انحصار ڈراما نویس کے زور قلم پر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے کیرکٹرز کو پبلک کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ انکی بڑائی اور چھوٹے پن میں امتیاز ہو سکے۔

برنرڈ شاہ کا قول ہے۔

"کہ ڈرامہ نویس کے لئے کوئی خصوصیت اسقدر باا ثر وسیع الاختیار اور حیرت افزا نہیں ہوسکتی جتنی اس کی بلند نظری اور رفعتِ تخئیل ہے"۔ اس کے علاوہ .... جب تک وہ کشادہ دل، آزاد خیال، عالی حوصلہ، بلند نظر، مستقل مزاج نہ ہو۔ وہ اپنے تخئیل اور بلند پروازی سے سامعین کے دلوں پر اثر نہیں ڈال سکتا"

شکسپیر کے متعلق نقادوں کی رائے ہے کہ اسکا کلام صداقت، اصلیت دلسوزی اور دلپذیری کا روشن ترین مرقع تھا۔ اور اس کی زندگی نرالاپن، جدت، شان وعظمت کی ایک زندہ تصویر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے دنیا میں ایک بلند مرتبہ انسان سمجھا جاتا ہے۔

ڈرامہ کا منتہائے کمال نظر فریبی پیدا کرنا ہے جب تک ان کے حرکات وسکنات میں اصلیت کی روح پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کامیاب نہیں ہوتا اسکی دو قسمیں ہیں ایک ٹریجڈی اور دوسرا کامیڈی

ٹریجڈی

ٹریجڈی انسانی زندگی کے اس پہلو کو بے نقاب کرتی ہے جس میں وہ تنازعِ بقا کی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ یا ان دردناک مناظر کا نقشہ کھینچتی ہے۔ جسے دیکھ کر تماش کار کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں اسکے دیکھنے سے انسان کے دل میں جذبات ترحم پیدا ہو جاتے ہیں جس سے دوسرا آدمی سبق سیکھتا ہے۔ ٹریجڈی کے مقصد سے ہمیں یہ بھی بتلانا ہوتا ہے کہ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے۔ یہ ایک فنا پذیر، متضاد، اشکال رکھنے والی چیز ہے اس کے جملہ فردعات ہیچ ہیں۔ اصل مدعا اہم ہے جسکی طرف کل مظاہر حیات اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں خوشی کم اور رنج زیادہ ہے۔ بیوفائی اور ناقدرشناسی کا بازار گرم ہے حیاتِ انسانی ایک مجبوری کلفت ہے۔ جو انسان کے پیچھے لگادی گئی ہے"۔ کل نفس ذائقۃ الموت" ہر ایک کیلئے آیا ہے۔

کامیڈی

کامیڈی کا مقصد انسان کو ہنسانا اور زندگی کے ان مضحکہ خیز افعال کا خاکہ کھینچنا ہے۔ جس سے ہر ایک فرد و بشر بیساختہ ہنس پڑے۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد ہر ایک شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں بیٹھ کر چند لمحوں کے لئے روحانی مسرت حاصل کرے۔ موسیقی، ناچ رنگ میں محو ہو کر غمِ فردا اور زندگی کی کشمکش کو تھوڑی دیر کے لئے بھول جائے اور ایسے رویّے اختیار کرے جو اسے تفکرات اور تاثرات رنج وغم سے بے نیاز کردے اور وہ اپنی زندگی کو اس شعر کے مصداق بنا دے۔

"بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

پُرانے زمانے کی قصہ گوئی اور موجودہ ڈرامہ نویسی

زمانہ ہمیشہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور تبدل وتغیر قانون فطرت ہیں۔ جس طرح چند سال پہلے ریل، تار برقی، ہوائی جہاز اس زمانہ کے لوگوں کے لئے پروازِ تخئیل تھے اور آج مہذب دنیا کے لئے ضروری عناصر ہیں، اسی طرح دنیائے ادب نے بھی ترقی کی۔ نظریہ زندگی منقلب ہوا تحقیق وتجسس کی نئی بنیادیں پڑیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ نے فیلڈنگ اور رچرڈسن جیسے ماہر نفسیات اور شکسپیر جیسے

ڈرامہ نویس پیدا کر دیئے جنہوں نے امراؤ غربا کے مختلف معاشری اور اخلاقی مرقعے اس طرح پیش کئے کہ اپنے لئے شہرت عام اور بقائے دوام کی سند حاصل کر لی۔

ڈرامہ نویسی اہلِ مغرب کی چیز ہے

پرانے لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہماری ہندوستانی زندگی ڈرامہ کی مقتضی نہ تھی۔ ہمارے ملک میں شرفا کے رہنے سہنے کا طریقہ، رسموں کے قیود، قومی روایات، نظریہ زندگی ہمیں عشق و حسن کی پرستش کی طرف لیجاتے اور نہ ہم میں صنفوں کے ارتباط و اختلاط میں وہ آزادی ہے جو اہلِ مغرب کو ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انیسویں صدی کے آخری حصے میں جب مغربی تہذیب و تمدن کا رنگ ہماری معاشرت پر چڑھنے لگا تو ہماری افسانہ نویسوں نے یورپ کی کورانہ تقلید کو خضرِ راہ بنا لیا اور تب سے افسانہ نویسی کی بنیاد ڈالی جسے بیشک اب کمال حاصل ہے

اس موقعہ پر میں بے اختیارانہ "شکسپیرِ ہند" جناب آغا حشر صاحب کاشمیری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جن کی ہستی پر ہندوستان کو ناز ہے آغا صاحب اردو کے بہترین ڈرامہ نویس ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ خیال کی جدت، طرزِ بیان، ندرت، زبان کی آمد، اور فقروں کی برجستگی جو آغا صاحب کے ڈراموں میں ہے۔ میں نے اب تک کسی اور ہندوستانی ڈرامہ نویس میں نہیں دیکھی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ڈرامہ کی کامیابی کا راز اس کے مکالمہ میں پنہاں ہوتا ہے اور اس میں جتنا آغا صاحب کو جو کمال حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں؟

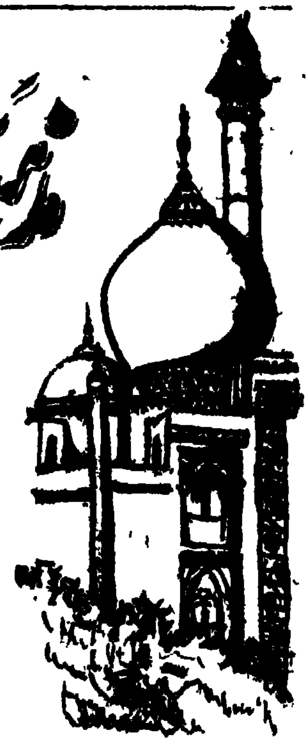
(افتخار رسول)

وارداتِ قلب

آپ نے مسکرا کے دیکھ لیا — حدِ صبر آزما کے دیکھ لیا
اُن پہ ہوتا نہیں اثر کوئی — خونِ دل بھی بہا کے دیکھ لیا
خاک میں مل کے بھی ہے دامنگیر — تم نے دل کو مٹا کے دیکھ لیا
روٹھ کر پھر نہ آئے راہ پہ وہ — سو طرح سے منا کے دیکھ لیا
تم نے بیمار کا جو ذکر کیا — دشمنوں نے بھی آ کے دیکھ لیا
میرے مرنے کا اعتبار نہ تھا — خود سے شانہ ہلا کے دیکھ لیا
بھول جانا نہیں محال سا ہے — ہر طرح سے بھلا کے دیکھ لیا
مجھ کو مرجانے ہی میں راحت تھی — تم نے کیوں مسکرا کے دیکھ لیا
کوئی سمجھا نہ دل کا افسانہ — اک جہاں کو سنا کے دیکھ لیا

(احتشام رضا)

مذہب دُنیا کی امن و عافیت کا ضامن ہے



اِسلام عالمگیر مذہب ہے

تحقیق و اجتہاد کے داعیوں کو درسِ بصیرت

(از جناب منظور حسین صاحب. ماہر القادری)

یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا. کہ دُنیا کا کارخانہ ایک نظام کے ماتحت چل رہا ہے سورج اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے، چاند کی ضیا باری ایک خاص وقت کے لئے مخصوص ہے نسیم سحری کے خوشگوار جھونکے کلیوں کی نرم و نازک رگوں میں گدگدی پیدا کرتے ہیں تو اُن کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، اور اِسی ابتسام" کے آخری درجہ کا نام پھُول" ہے قوتِ نامیہ کے لئے حرارت ضروری ہے، پودوں کی شادابی کیلئے پانی بلا زمات سے ہے، برسات کی رُت میں حشرات الارض کثرت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، قوس وقزح اپنی تمام جاذب نظر دلفریبیوں کے ساتھ نمودار ہوجاتی ہے، اور زمین کا چپہ چپہ مرغزار بن جاتا ہے غرض کائنات کا ہر ذرہ ایک نظام میں ممزوج و مولف ہے اور اگر خدانخواستہ نظام قدرت میں اختلال پیدا ہوجائے اور عناصر و اجسام کی باہمی تنظیم و تالیف باقی نہ رہے، تو کرہ ارض کا شیرازہ بکھر جائے اور بہت جلد دنیا تباہ و برباد ہوجائے، جب قادر مطلق نے جامد اور بے جان ذرّوں کو تنظیم کی نعمت سے نوازا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اس نے انسان کو گمراہی کی تاریک منزلوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہو اور اس کے لئے کوئی نظام خلق نہ فرمایا ہو۔

انسانی آبادی کے اولین دور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بادشاہت و امارت کا کہیں نام و نشان نہیں ہے حکومتوں کے بنائے ہوئے قوانین و آئین سے انسانی دماغ مطلقاً روشناس نہیں ہیں، لیکن پھر بھی گناہ کے تصور سے وہ لوگ کانپ جاتے ہیں جن کو ہم وحشی نہیں تو "نیم انسان" ضرور سمجھتے ہیں، قتل غارت گری، فحش کاری، غصب اموال وغیرہ جرائم موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت بھی قابل مواخذہ اور لائق احتساب ہیں، ممکن ہے کہ سزا کی نوعیت میں اختلاف ہو، لیکن جُرم کا مذموم پہلو اس وقت بھی پیش نظر تھا، آخر وہ کیا چیز تھی، جس نے انسان کے دل میں گناہ کی طرف سے نفرت پیدا کردی اور پاداشِ معصیت کا خیال قدم قدم پر اس کو ارتکاب جرائم اور اقدام معاصی سے باز رکھتا تھا، حالانکہ اس دور میں

ہر شخص ہر حیثیت سے آزاد تھا، اور حکومت کی آہنی گرفت کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔

اگر اس گتھی کے سلجھانے کے لئے ناخن عقل وتفکر کو ذرا بھی جنبش دی جائے تو یہ گرہ کھل جاتی ہے اور انسانی ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ " مذہب " انسانی حیات کی پاکیزگی کا ضامن تھا۔ اور اسی کے تصور نے اس کو تخریب سے بچا لیا، جس عہد کا ذکر کیا جا رہا ہے اس میں حکومتوں کے خود ساختہ گھروندے موجود نہ تھے، دُنیوی اعتبار سے کوئی شخص کسی کا ماتحت نہ تھا، ذرّے ذرّے سے آزادی کے چشمے اُبل رہے تھے دُنیا کا گوشہ گوشہ انوار حریت سے معمور تھا، قانون حکمت کے فقدان کے علاوہ " جماعتی قوانین " بھی مدون نہیں ہوئے تھے معاشرت و تمدن کی ابھی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی، خدا کی زمین انسانوں کا بچھونا تھا، درختوں کی چھال اور جانوروں کی کھال اُن کا لباس تھی، اور حضارت و عمرانیت کے آفتاب کی کرن نے اُن کے دامن معاشرت کو چھوا بھی نہیں تھا، لیکن اس عہد جہالت میں مذہب کی شمع ان کی رہنمائی کرتی تھی، اور اُن کا ضمیر ثواب و گناہ کے فلسفہ سے واقف تھا، پس معلوم ہوا کہ آفرینش انسان اور تخلیق مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کی تاریخ ابتدا ایک ہے۔

مذہب اور قوانین حکومت

انسان نے ابتدائی دور سے گذرنے کے بعد زندگی کی ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں اس کو جماعتی نظام مرتب کرنا پڑا اور اسی طرح ترقی کرتے کرتے حکومتوں کی بنا پڑ گئی اور اقوام و ممالک کے طاقتور و مدبر افراد اپنی اپنی ٹولیوں کے قائد بن گئے، دُنیا ترقی کرتی گئی اور آہستہ آہستہ قیادت و سیادت مختلف نوعیتوں کی حکومت میں تبدیل ہو گئی اور حکومت کے استحکام کیلئے اس کے رکھ رکھاؤ کے لئے ایک ایسے نظام کی ضرورت داعی ہوئی جو رعایا کے امن و عافیت کا ضامن ہو اور ساتھ ہی حکومت کا اقتدار بھی قائم رہ سکے، لہٰذا اس نظریہ کے ماتحت مدبرین نے قوانین وضع کئے، مدبرین حکومت کو قانون بنانے میں کسی ابداع سے کام لینا۔۔۔ نہیں پڑا، کیونکہ قوانین مذہب ان کے سامنے موجود تھے اور گناہ و ثواب کی افادیت و غیر افادیت کا درس جو مذہب نے دیا تھا وہ ان کے دماغوں میں محفوظ تھا، لہٰذا احتساب جرائم اور مواخذۂ معاصی کے لئے قوانین کی تدوین عمل میں آئی تاکہ حدود حکومت میں امن و امان قائم رہ سکے مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ حکومتوں کے وہ قوانین جن کا خالص مطلب انسانی حقوق کی صیانت و عافیت ہے وہ سب مذہبی قوانین کے اُتارے ہوئے چربے ہیں، اور اسی آفتاب کی یہ جھلکیاں ہیں جو مختلف لباسوں میں متضاد صورتوں سے جلوہ گر ہیں۔

مذہب اور مرکزیت

بہرحال یہ امر ثابت ہو چکا کہ جس طرح دُنیا کا کارخانہ ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہا ہے اسی طرح انسان بھی ایک مخصوص نظام اور ضابطہ کا مقلد ہے اور اس نظام کا نام " مذہب " ہے، یہی وہ نظام ہے جو انسانی آبادی کو تخریب سے بچائے ہوئے ہیں، یہی وہ مرکز ہے جس پر دُنیا کی فلاح و بہبود کا کرہ ٹھہرا ہوا ہے، یہی وہ چشمہ ہے جس سے امن و عافیت کے دریا جاری ہیں اگر مذہب کا تصور انسانی دماغ سے محو ہو جائے تو دُنیا میں ابتری اور انتشار پیدا ہو جائے، قتل و غارتگری کا ایسا بازار گرم ہو کہ خون کی ندیاں بہ جائیں، اقوام عالم ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو جائیں دُنیا کی اس بسیط فضا میں ایک انسان بھی سانس لینے کے لئے باقی نہ رہے، بالفرض محال اگر انسان باقی بھی رہ جائیں تو کیا اس دُنیا پر " انسانی دنیا " کا اطلاق ہو سکتا ہے جہاں کے بسنے والے معصیت کے پیکر

اور گناہ کے مجسمے ہوں جن کے ضمیر پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہوں اور اخلاق و تیاجن کے ضابطۂ معاشرت میں ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتے ہوں، دُنیا کا کوئی صاحب عقل خونخوار بھیڑیوں کی اس انسانیت کش آبادی کو "انسانی آبادی" نہیں کہہ سکتا، غرض انسانیت کا انحصار مذہب پر ہے اور اس کے باغ کی کلیاں اس وقت تک کھل ہی نہیں سکتیں، تاوقتیکہ مذہب کی نسیم عملی جنبش نہ کرے۔

دُنیا میں جب کبھی ابتری پھیلی تو اس کا سبب محض یہی تھا، کہ انسانی خیال مذہبی تصور سے دور ہو گیا تھا، آج بھی دُنیا کے جن گوشوں میں اخلاقی تباہی کارفرما ہے اس کی وجہ مذہب سے دور ہے ظاہر ہے کہ جب تک کوئی عنصر نظام سے مربوط ہے، وہ صحیح و سلامت حالت میں ہے لیکن مرکزی نظام سے انحراف کے بعد اس کی شکست و ریخت ناگزیر ہے لہٰذا دُنیا نظام مذہب سے جس قدر دُوری اختیار کرے گی اسی قدر اس کا وجود تباہی آشنا بنیگا اور فقدان تنظیم اور عدم ترتیب کی بجلیاں اس کے خرمن عافیت کو جلا کر خاکستر کر دیں گی، دُنیا کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ مذہب کی مرکزیت سے اپنے تعلق کو استوار و مستحکم بنالے۔

مذاہب عالم پر تبصرہ

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ انسانوں کی عافیت و سلامتی کا راز مرکزیت میں ہے اور اس مرکزیت کا نام مذہب ہے لیکن جبکہ دُنیا میں بے شمار مذاہب موجود ہیں تو پھر مرکزیت کہاں باقی رہتی ہے! بلاشبہ دُنیا میں بہت سے مذاہب موجود ہیں، اور انسان خود ساختہ ٹولیوں میں منقسم ہو کر "مرکزیت" کی سرمدی دولت زائل کر چکے ہیں، اسی سبب سے اکناف ارض اور اقصائے عالم میں انتشار برپا ہے اور رنگ و نسل کے امتیازات باطل نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا دیا ہے قومیت کے جھگڑے ہیں، وطنیت کے قضیے ہیں اور دُنیا کے بہت سے حقوق کی ذلیل ہڈیوں پر جھگڑ رہے ہیں اگر لامرکزیت کی یہی حالت رہی، تو دُنیا کو ایک ایسی عظیم الشان جنگ سے دوچار ہونا پڑے گا، جو دُنیا کے بڑے حصہ کو تہ و بالا کر کے رہے گی اور جس کے سامنے جنگ عظیم کے اُبھرے ہوئے نقوش دب کر رہ جائیں گے لہٰذا دُنیا کے امن و عافیت کا راز صرف اس میں مضمر ہے کہ دُنیا سچائی کے ساتھ تمام مذاہب کو حقانیت کی کسوٹی پر پرکھے اور جو مذہب خالص ثابت ہو اسی کو اپنا مرکز بنالے۔

موجودہ دنیا کی آبادی ہندو، بدھ، عیسائی، اور اسلام چار مذاہب پر مشتمل ہے دیگر چھوٹے چھوٹے فرقے ان ہی کی فروع ہیں وہ مذہب دُنیا کا کامیاب ترین مذہب ہو سکتا ہے، اور اسی مذہب کو عالمگیر مذہب کہہ سکتے ہیں جس کے ماتحت ہر قرن میں ہر انسان حیات کی ہر منزل سے گذرتا ہوا سکون قلب اور طمانیت ضمیر حاصل کرلے، دُنیا کی جائز لذتوں سے حسب استطاعت اور بقدر ذوق محظوظ بھی ہوتا رہے، اور روحانیت کی کیفیات سے بہرہ اندوز ہونے کا سلسلہ بھی جاری رہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے ہم کو مندرجہ بالا مذاہب کے "داعیوں" کے سوانح حیات پر تبصرہ کرنا چاہیئے، کیونکہ داعیٔ مذہب، صاحب شریعت اور پیغمبر کا کردار اس کے مقلدین کے لئے ایک ایسے ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تقلید کے بغیر اس کی زندگی کا کوئی جزو مکمل نہیں ہو سکتا۔ پس جس مقدس پیغمبر کی زندگی دنیا کے لئے نمونہ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو، وہی پیغمبر اور داعیٔ مذہب سزاوار تقلید اور مستحق اقتدا ہے اور اس کا پیش کیا ہوا مذہب عالمگیر مذہب ہو سکتا ہے۔

ہندو مذہب میں سب سے زیادہ اہم مرتبہ مہاراج

کرشن" کو حاصل ہے۔ گیتا کی عظمت روحانی سے کون انکار کرسکتا ہے، اس کے صوفیانہ نکات اور نفسیاتی باریکیوں سے انحراف کی کس میں طاقت ہے؟ یقیناً مہاراج کرشن اپنے زمانہ کے مقدس انسان تھے، اور بندرابن کے ذرے آج بھی اُن کی بانسری کے نغموں سے وجد میں ہیں، لیکن افسوس کہ آپ کی زندگی کے اکثر و بیشتر حالات ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ آپ کی زندگی کا دوسرا رُخ "نے نوازی" سے عبارت ہے، بانسری کے نغمے ہیں اور جنگل کی فضا، صحرا کے جانور کرشن جی کے آس پاس مستانہ وار جمع ہو گئے ہیں، اور کرشن جی تانیں اڑا رہے ہیں، جو بظاہر مادی ہیں لیکن فی الحقیقت وہ اپنے اندر روحانی اعتبار سے بڑی گہرائی رکھتی ہیں یہ ہے کرشن جی کی سوانح حیات کا لب لباب اور ماحصل، اگر تمام دنیا مہاتما کرشن کی مقلد بن جائے تو کیا وہ منزل حیات سے اطمینان کے ساتھ گذر سکتی ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ دُنیا کی کتنی آبادی اس نوعیت کی حُسن پرستی اور نغمہ نوازی کے لئے تیار ہو جائے گی اور اس عمل کی مداومت کے بعد انسان کی عملی قوتوں کا کیا حشر ہوگا؟ ایک مزدور، ایک فلسفی، اور ہر وہ شخص جو کشمکش حیات میں مبتلا ہو، کرشن جی کی زندگی کو کسی طرح نمونہ نہیں بنا سکتا کیونکہ کرشن جی کی موصوم زندگی قدم قدم پر اس کی جدوجہد میں مزاحم ثابت ہوگی، اور کامیابی حیات کے امکانات میں بعد پیدا ہو جائے گا اس کے ماسوا دُنیا کے بے شمار انسانوں کے لئے جو مختلف قسم کی جامعتی زندگیاں گذار رہے ہیں، ان کیلئے کرشن جی کی حیات کا اس قدر مختصر پہلو کس طرح نمونہ بن سکتا ہے۔؟

مہاتما بُدھ کی تلاش عرفان کے افسانے تنقید و تبصرہ سے بے نیاز ہیں، تلاش حق کے لئے راج پاٹ کو لات مار کر سنسان جنگلوں میں پھرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے تزکیہ نفس اور تقدیس جذبات کی خاطر لذات دُنیوی سے کنارہ کش ہو کر طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنا کوئی غیر اہم چیز نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تلاش حق کے لئے اگر ساری دُنیا مہاتما بُدھ کی زندگی کو مشعل راہ بنالے تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ کتنے لوگ ایسے نکلیں گے جو اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگلوں کے چکر کاٹنا شروع کر دیں گے، کتنے ایسے انسان ہوں گے جو عیش و آرام کو تج کر تکلیف مالایطاق کی جانگداز کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے، یقین جانئے کہ لاکھ آدمیوں میں ایک آدمی کی فطرت بھی اس کو گوارا نہ کرے گی، پس ثابت ہو گیا، مہاتما بُدھ کی پیش کردہ زندگی دُنیا کے لئے نمونہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت روحانی سے انکار کفر ہے، آپ کے معجزات سے بُعد معصیت ہے، آپ کی مسیحا نفسی کے افسانے حقائق سے لبریز ہیں، خدا کے اس مقدس رسول نے رہنے کے لئے ایک جھونپڑا بھی نہیں بنایا، تمام عمر عالم تجرد میں بسر کر دی اور رحم و کرم کے اس مقدس حامل نے تعلیم دی کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر طمانچہ لگائے تو دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو، اگر کوئی ایک کوس تم کو بیگار میں لے جائے تو تم دو کوس تک جاؤ، بیشک اس زمانہ کی نوعیت کے اعتبار سے یہ تعلیم بہتر اور قابل عمل تھی، لیکن اس زمانہ میں اگر اس پر عمل کیا جائے تو سائنس کی ساری ترقیوں پر موت طاری ہو جائے اور وہ لوگ جن کی فطرت ظلم و شقاوت سے مرکب ہے، زیر دستوں پر جبر و ظلم کے پہاڑ توڑ کر چھوڑیں اور وہ بیچارے مدافعت بھی نہ کر سکیں، حضرت مسیح کے وہ نالائق پیرو جو خدا کے اس مقدس بندہ کو "ابن اللہ" مانتے ہیں، اگر مسیحی تعلیم پر عمل پیرا ہوتے تو برطانیہ کی عظمت کا دُنیا میں وجود بھی نہ ہوتا، اس کے ماسوا چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے شادی نہیں کی لہٰذا شادی شدہ اشخاص کے لئے آپ کی زندگی اپنے اندر کوئی ایسی مثال نہیں رکھتی جسکو موجب

تقلید بنایا جا سکے، زن و شو کے تعلقات و فرائض، بچوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ، ان تمام باتوں کے جواب میں بھی حضرت مسیح کی زندگی ساکت ہے، لہٰذا معلوم ہُوا کہ حضرت مسیح کی زندگی بھی تمام دُنیا کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔

اب اُس مقدس رسول کے دربار میں آیئے جس کیلئے حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس وقت دعا مانگی تھی جب وہ کعبۃ اللہ کی بنا رکھ رہے تھے جس کی تشریف آوری کی نوید حضرت مسیحؑ نے دی، جس کے لئے بزم کونین آراستہ کی گئی، جس کی خاطر چاند سورج کو ضیا دی گئی، جو یتیموں کا والی اور غلاموں کا مولیٰ تھا جس کے صحرا نشین غلاموں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے پرچے اُڑا دیئے، جو خدا کا مقدس ترین بندہ اور عالم انسانیت کا سب سے بڑا محسن تھا اور جس کو دُنیا "محمدؐ" (روحی فداک) کے نام سے پکارتی ہے، ایک فاقہ کش مزدور اگر حضرت پیغمبر اسلام کی حیات مقدسہ کو نمونہ بنانا چاہتا ہے تو اس کو غزوۂ خندق کا نظارہ کرنا چاہیئے کہ سرکار دو عالم تمام مسلمانوں کے ساتھ کدال لے کر مٹی کھود رہے ہیں، مسلسل فاقوں کے باعث شکم مبارک پر پتھر بندھے ہوئے ہیں، ایک فوجی افسر اگر سرکار مدینہ کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے "معرکۂ بدر" کی تفصیلات کو اوراق تاریخ میں دیکھنا چاہیئے کہ کس بہترین حربی اسلوب کے ساتھ صف آرائی فرمائی گئی ہے اور فتح پانے کے بعد ان قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا جنہوں نے فاتح اور اُس کے اعوان و انصار پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور جو بدر کے میدان میں اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے مجتمع ہوئے تھے، اگر کسی شکست خوردہ جنرل کو رسول خدا علیہ السلام کی سیرت طیبہ سے سبق لینا ہے تو اسکو غزوۂ اُحد کے واقعہ کو شمع ہدایت بنانا چاہیئے کہ ایسی صورت میں جبکہ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے خدا کا سچا رسُول یکہ و تنہا کھڑا ہوا ہے اور کفر کی آندھی کا بڑے سے بڑا جھونکا مرکز حق کو جُنبش میں نہیں لا سکتا۔

ایک فاتح بادشاہ کے لئے " فتح مکہ " کا واقعہ درس بینش بن سکتا ہے۔ "صُلح حدیبیہ" کی معرکۃ الآرا صلح موجودہ دور کی اُن تمام حکومتوں کی رہبری کر سکتی ہے جو مصالحت و مسالمت کے لئے عرصہ سے تگ و دو کر رہی ہیں، لیکن چونکہ دل صاف نہیں ہیں اور نیتوں میں کھوٹ ہے لہٰذا صورتیں بن بن کر بگڑ جاتی ہیں غرض انسانی زندگی کے ہر روشن پہلو کیلئے سرکار دو عالم ارواحنا لہم الفدا کی مقدس زندگی نمونہ بن سکتی ہے اور آپ کا پیش کردہ مذہب ہی صرف عالمگیر مذہب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسلام کے آستانہ پر آکر ہی تمام دُنیا کو پناہ مل سکتی ہے۔

اسلام کے ٹھوس اصُول

آریہ سماجیوں نے شاستروں کی دھجیاں اُڑا دیں اور ضرورت زمانہ سے مجبور ہو کر شودروں سے مساویانہ سلوک کرنے پر اُن کو مجبور ہونا پڑا، توریت و انجیل کا ایک نسخہ بھی دُنیا میں ایسا موجود نہیں ہے۔ جس کی عمومی صحت پر اتفاق ہو سکے، یہودی اور نصاریٰ کو اپنے مذاہب کے قوانین کو تبدیل کر دینا پڑا، لیکن خدا کا آخری قانون " اسلام " اپنی اسی نوعیت میں موجود ہے جس میں وہ پیش کیا گیا تھا، اسکا ایک اصول بھی تبدیل نہیں ہُوا، اس کی اصل تو کیا فروع میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ دُنیا کے دیگر اہل مذاہب، اسلام کے پیش کردہ اصولوں کی تقلید کو موجب فلاح اور باعث کامیابی سمجھ رہے ہیں، اس کی الہامی کتاب کا ایک شوشہ بھی محرف و مبدل نہیں ہُوا، سائنس کی محیر العقول ترقیوں اور دُنیا کے مہتم بالشان انقلابات کے باعث اس کا ایک اصُول بھی تبدیلیوں کا رہین منت نہیں ہُوا لہٰذا ان حقائق کے مسلّم ہو جانے کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دُنیا کا عالمگیر مذہب صرف اسلام ہے اور دُنیا کی موجودہ ہنگامہ آرائیاں

کا قلع قمع صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا اسلام کے آستانہ پر سر جھکا دے کیونکہ اسلام سے علیحدہ رہ کر مرکزیت باقی نہیں رہتی، اور عدم مرکزیت کا نام ہے تخریب، جنیوا میں لاکھ کانفرنسیں منعقد ہوں، جمعیت الاقوام ایڑی چوٹی کا زور صرف کرے لیکن دُنیا اس خوفناک جنگ میں کودنے سے باز نہیں رہ سکتی جس کے خیال سے یورپ کو پسینے آنے لگتے ہیں، دُنیا میں امن و عافیت کی صرف یہی ایک شکل ہے کہ اسلام کی مقدس اور کامیاب تعلیم پر عمل کیا جائے۔

چودہویں صدی کے مُصلحین

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی مخاطب دنیا کی وہ آبادی ہے جو بدقسمتی سے اسلام کے حلقہ بگوش نہیں ہے، ہاں تمہید مضمون سے وہ لوگ بھی بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، جو مذہب کے وجود کو دُنیا سے اُڑا دینا چاہتے ہیں، اور جو اپنے گمراہ زعم اور سزا پندار کے سبب مذہب کو توہمات کا بے معنی طومار سمجھتے ہیں، آگے چل کر میں ان اشخاص کو مخاطب بنانا چاہتا ہوں جو اپنے جہل اور تنگ ظرفی کی بنا پر، انقلابات عام اور اُن کے شئون و مظاہر سے سراسیمہ ہو کر اسلامی اصولوں میں یا تو تبدیلی چاہتے ہیں یا اس کی آفتاب کی طرح روشن تعلیم کو تاویلات کی غلیظ چادروں میں چھپا کر اور دُنیا کو دھوکا دے کر خود کو مصلح اور مجدد سمجھتے ہیں، نوجوانوں کو رنگین ادب کی چاٹ لگا کر، ان کے دماغوں کو اسلام سے بیگانہ بنانا اور مشاہیر اسلام کے مقدس وجود پر کذب آمیز تنقید کرنا، خلاقی نقطۂ نظر، اور جماعتی زاویۂ نگاہ سے ایک ایسا عظیم الشان گناہ ہے جو اپنے اندر تخریب اور بربادی کے سوا اور کوئی چیز نہیں رکھتا۔

اسلام کی تعلیم روحانیت کا سرچشمہ اور اخلاقیات کا منبع ہے، اس کا ہر اصول تقدیس مآب ہے، تنزیہ جذبات اور پاکیزگی خیالات کا داعی ہے، اس کے قوانین و آئین کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے ایک ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو شکوک و شبہات سے پاک ہو کر خلوص اور صرف خلوص کا متلاشی ہو، جو انقیاد و اطاعت کی استعداد و قابلیت اپنے اندر رکھتا ہو، ایسا دماغ یقیناً اسلام کے اصول سے مطمئن ہو جائے گا، اور نور ربانی اور تجلیات الٰہی اس کو جگمگا کر چھوڑیں گے، وہ اپنے اندر ایک سرمدی سکون محسوس کرے گا جو اطمینان و سکون کا گنجینہ ہوگا، ظاہر ہے کہ سکون ضمیر اور طمانیت قلب کا ہی نام "معرفت الٰہی" ہے اور اس دولت کے مل جانے کے بعد دُنیا کی بڑی سے بڑی نعمت ہیچ اور بے مقدار ہے لیکن محض فلسفہ کے بل بوتے پر اصول اسلام کو سمجھنا، اپنی ناقص عقل کو معیار بنانا، اور اپنے مفروضہ خیالات کو بنیاد قرار دے کر ہر اُس اصول پر جس کے سمجھنے میں عقل کو اپنے نقص و کوتاہی کے سبب دقت پیش آتی ہے، بے باکی کے ساتھ اعتراض کر دینا فی الحقیقت دہریت اور الحاد ہے۔

بدقسمتی سے ایک زمانہ میں قرآن کریم کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کے متعلق فلاسفۂ اسلام میں جنگ چھڑ گئی تھی بعض کج فہم فلسفیوں نے اپنی عقل کی جودت دکھانے کے لئے اس سلسلہ میں اکاذیب و اباطیل کا طومار لگا دیا، اور وہ چیز جو نہ اصول اسلام میں داخل تھی اور نہ جس پر بحث و تحقیق کی ضرورت تھی، اس پر اس قدر شدت کے ساتھ بحث کی گئی کہ مسلمان مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے، اور ہر گروہ ایک دوسرے کے لئے تکفیر و تفسیق روا رکھنے لگا، معاملہ یہاں تک طول کھینچا کہ مسلمان بادشاہوں کو بھی اس ہنگامہ میں حصہ لے کر اپنے ہاتھوں کو کلمہ گویوں کے مقدس خون سے رنگنا پڑا، یہ ابتدا ہے ملت اسلامیہ کی تباہی کی، یہ دیباچہ ہے مسلمانوں کی کتاب افتراق و پراگندگی کا، جب کافی تباہی ہو چکی، فلسفہ کا نشہ اُتر چکا، اور عقل و خرد کا نشہ کم ہوا، تو کہیں جا کر یہ جوش ٹھنڈا ہوا، یہ مسئلہ

قریب قریب موضوع کلام سے خارج کر دیا گیا۔

دوزخ وجنت کی بحث

آج بھی اسی فتنہ کا دروازہ کھولا جا رہا ہے اور دوزخ وجنت کی مادیت وغیر مادیت کے متعلق محض ذاتی قیاس آرائی کی بنا پر آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو ایسے ایسے معانی پہنائے جاتے ہیں جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے، حالانکہ اس مسئلہ کو چھیڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، قرآن پاک نے جن الفاظ میں دوزخ وجنت کا ذکر فرمایا ہے اور ان مقامات کی کیفیات کی تفصیل جن طریقوں پر کی ہے، وہ اپنی جگہ پر مسلم ہیں، اور محض پندار عقل کی فریب خوردگی کے باعث ان پر ردوقدح کرنا درحقیقت ایک ایسی عظیم الشان گمراہی اور معصیت ہے جس کی تلافی بہت مشکل سے ہو سکتی ہے، اول تو اس بحث کے چھیڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، کیونکہ جنت اور دوزخ پر ایمان لانا تو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، لیکن اُن کی کیفیات کی ٹٹول کرنا اور اُن کی کنہہ کو پہنچنا یہ چیز اصول ایمان اور آئین عقائد میں داخل نہیں ہے، بس اس قدر ایمان لانا کافی ہے، کہ قرآن شریف میں جنت و دوزخ کی حقیقت کا جن الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ پر مسلم اور یقینی ہیں، اُن کی تفصیلی کیفیات کا علم خالق جنت و دوزخ کو ہوگا، ہمارا کام خداوندی احکام کے سامنے سر جھکا دینا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسکو کمال ایمان کہا جاتا ہے، یہ تو وہ آسان صورت ہے جو ضمیر و قلب کے اطمینان کا باعث بن سکتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں اور زیادہ تفحص و جستجو سے کام لینا چاہے تو پھر اس کو احادیث نبوی کا مطالعہ کرنا چاہئے، جن میں جنت و دوزخ کے بعض مناظر کی تشریح فرمائی گئی ہے، ان احادیث کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے، کہ جنت و دوزخ محض روح کے سکون اور اس کی اذیت کا ہی نام نہیں ہے بلکہ جسم سے بھی اس کا تعلق ہے، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر جنت و دوزخ مادیات سے عبارت ہیں تو اس میں اللہ تعالےٰ کی تنزیہ و تقدیس اور اس کی حکمت بالغہ پر آخر کیا حرف آتا ہے، کسقدر ناسمجھی کی بات ہے کہ محض اپنی ذاتی عقل کی بنا پر قرآنی آیات اور احادیث نبوی کو پس پشت ڈال کر ظن و قیاس کا ایک نیا گھروندہ بنا لیا جائے اور اس کا نام رکھا جائے "تحقیق و اجتہاد" لیکن کیا دُنیا کا کوئی صاحب فہم اس تضلیل و جہالت کو تحقیق و اجتہاد سے تعبیر کر سکتا ہے

تحقیق کے جھوٹے دعویدار

اس قماش کے افراد کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ہر چیز کی تحقیق کی جائے۔ اصول ایمان و عقاید کو کھنگالا جائے اُن کو حقانیت کی کسوٹی پر پرکھا جائے، اور جب تک ایک ایک اصول و عقیدہ کے متعلق عقل مطمئن نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کو تسلیم نہ کیا جائے، یہ اصول بظاہر بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے، اور ظاہری نظر اس فریب میں مبتلا ہو جاتی ہے، کہ اس قسم کا اصول مرتب کرنے والا بہت ہی روشن خیال ہے، حالانکہ اس سے زیادہ تاریک خیالی کی مثال دُنیا پیش کر ہی نہیں سکتی، اور اس عقیدہ اور خیال کا انسان درحقیقت دہریت کا داعی اور الحاد کا مبلغ ہے وہ مذہب کے پرزے اُڑانا چاہتا ہے، خدائی احکام کی عدم متابعت کی تعلیم دیتا ہے اور اس عقل کو مشعل راہ بنانا چاہتا ہے جو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے اور جس پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

میرا مقصد عرض کرنے کا یہ نہیں ہے کہ اسلامی اصول خدانخواستہ عقل کے منافی ہیں، اسلام دین فطرت ہے اس کا ہر اصول فطرت کے مطابق اور عقل کے موافق ہے، لیکن ادراک و بصیرت کے لئے محض عقل کو معیار بنانا جہالت اور گمراہی ہے آپ اسلام کے ہر اصول کو عقل کی روشنی میں سمجھئے اور ضرور سمجھئے لیکن اگر کسی اصول کے سمجھنے میں آپ کی عقل آپ کا ساتھ نہ دیکے،

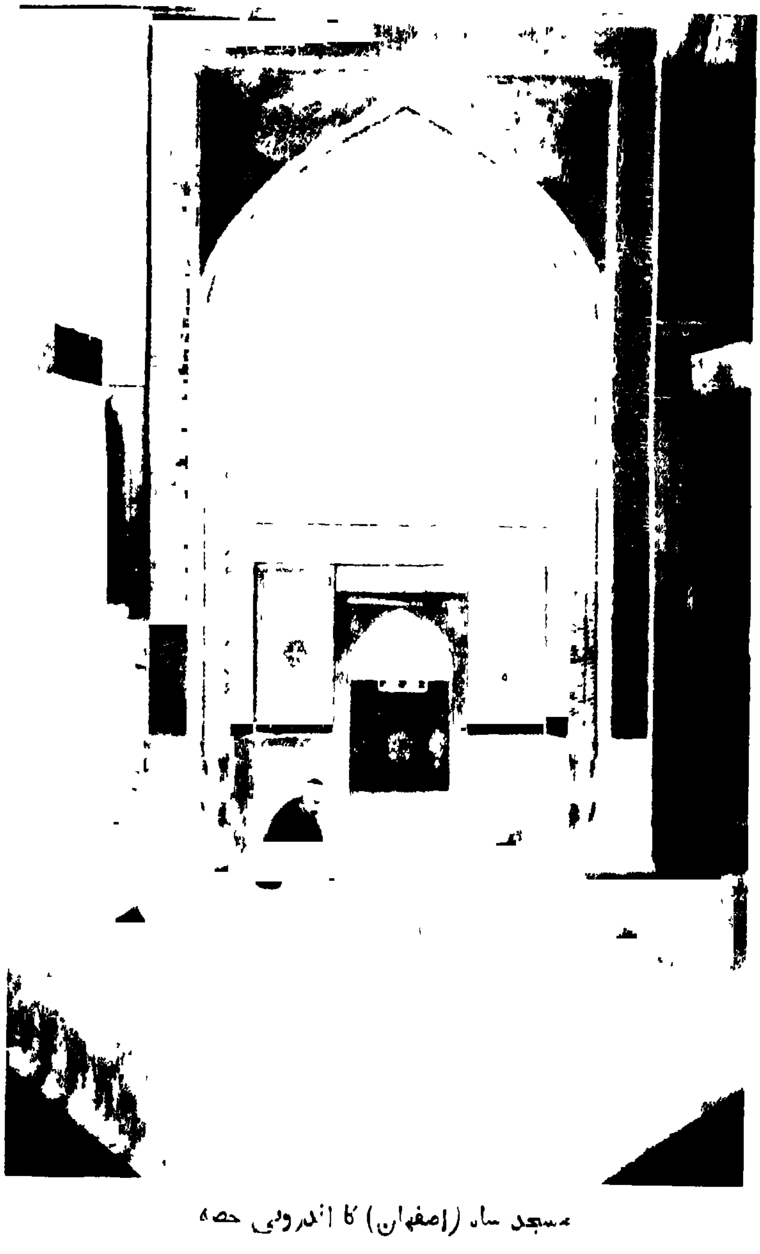
تو اس اصول کو مردود و نامقبول نہ سمجھئے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی عقل نے غلطی کی ہو اور نقصِ عقل اور کوتاہیِ بصیرت کی بنا پر اس اصول کی باریکی آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو، اس بات کے ماننے کیلئے کہ عقل غلطی کر سکتی ہے اور نقصِ عقل مسلم ہے، دُنیا کے عقلاء اور عالم کے مدبرین کے اقوال کا مطالعہ کیجئے کہ اُن مایۂ ناز علماء کی عقول نے کیسی کیسی زبردست ٹھوکریں کھائی ہیں، بطلیموس نے "سکونِ ارضی" کا ایک نظریہ پیش کیا، جس پر تمام دُنیا ایمان لے آئی، کچھ دنوں کے بعد گلیلیو نے اس نظریہ کی دھجیاں اُڑا دیں، بعد میں جاکر نیوٹن نے کچھ اور اضافہ کر دیا، اسی طریقہ پر یونان کے فلسفیوں کے نظریوں میں آپ کو بہت کچھ بُعد نظر آئے گا، غرض عقل کی بنائی ہوئی عمارتیں اسی طرح تباہ ہوتی رہتی ہیں، اور ہر فلسفی اور صاحبِ عقل ایک دوسرا قصر تیار کر دیتا ہے، حرکت، جہت، مرکز، اجزا کے متعلق کسقدر لاتعداد نظریے مدون ہوئے ہیں، اور آنے والی صدی کے عقلاء نے گذشتہ صدی کے نظریوں کو باطل کر کے چھوڑا ہے، یہ ہے عقل کی کائنات اور اس کے کمال کا عالم! کیا اس نوعیت کی عقل پر پورے طور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

تحقیق کا جنون

اگر اسی اصول پر دُنیا عمل شروع کر دے کہ تحقیق کے بغیر کسی بات پر ایمان لانا حماقت ہے تو کائنات کے بہت سے نظریوں اور دُنیا کے اکثر اصُولوں کے متعلق انسانی عقل شبہ میں مبتلا رہے گی اس کے ماسوا تحقیق کا یہ سودا انسان کو اسدرجہ مضطرب و بیقرار بنا دے گا، کہ وہ اضطراب کے سوا کبھی بھی سکون کی دولت سے بہرہ اندوز نہ ہو سکیگا، میرے خیال میں اضطرابِ روح سے بڑھکر اور کوئی شئے انسان کیلئے باعثِ تکلیف نہیں ہو سکتی، تحقیق کے اس عجیب و غریب اصول کے مدون کرنے والے کیا دُنیا کو مضطرب بنانا چاہتے ہیں، اور یقین و ایمان کی اس سرمدی قوت کو دلوں سے چھین لینا چاہتے ہیں جو فلاحِ کونین کی ضامن ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی انسان اس اصول پر کاربند ہو ہی نہیں سکتا، کائنات کے لاتعداد اسرار اور اُن کے ان گنت شئون و مظاہر کی حیاتِ مستعار میں تحقیق ناممکن ہے، جب یہ امر اپنی جگہ ثابت ہو چکا تو پھر ایک محال شے کے پیچھے دوڑنا کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جو اشخاص کہ اس نوعیت کے اصول پر ایمان رکھتے ہیں وہ خود اسکے عامل نہیں ہیں اور نہ وہ اس پر عمل کرنے کی قوت رکھتے ہیں، پس سکونِ ضمیر اور اطمینانِ قلب کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ انسان "ایمان بالغیب" کا قائل ہو جائے اور تجربہ اور شہود کے فریب میں مبتلا نہ ہو۔

"ایمان بالغیب" کے نام سے اس دور کے نوجوان تعلیم یافتہ شاید کچھ بھڑکیں گے کہ اس زمانہ میں جبکہ ہر چیز کا تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں مطالعہ کیا جا رہا ہے، "ایمان بالغیب" کی تعلیم ایک مضحکہ انگیز چیز ہے، لیکن میں آپ کو بتاؤنگا کہ ہر انسان غیوب پر ایمان لانے کیلئے فطرتاً مجبور ہے، اور ایمان بالغیب کے بغیر زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی، آپ نے جغرافیہ کی کسی کتاب میں پڑھا کہ "پیکن" چین کا دارالسلطنت ہے اور اس جملہ کے پڑھتے ہی آپ ایمان لے آئے کہ واقعی جو کچھ کہا گیا وہ درست اور ٹھیک ہے، حالانکہ تحقیق و تجربہ کا منشا تو یہ تھا کہ آپ چین جاکر اس جملہ کی صداقت کو جانچتے کہ آیا پیکن نامی شہر چین میں ہے بھی یا نہیں! لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور آپ "ایمان بالغیب" کے عامل ہو گئے اس طرح دُنیا کی ہزاروں چیزوں کے متعلق آپ ایمان بالغیب رکھتے ہیں، ہاں! تو مطلب عرض کرنے کا یہ تھا، کہ جغرافیہ کی کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے دل میں یہ یقین جاگزیں ہو گیا، اس کتاب کا لکھنے والا غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا لہٰذا آپ اس کی ہر بات



مسجد شاہ (اصفہان) کا اندرونی حصہ

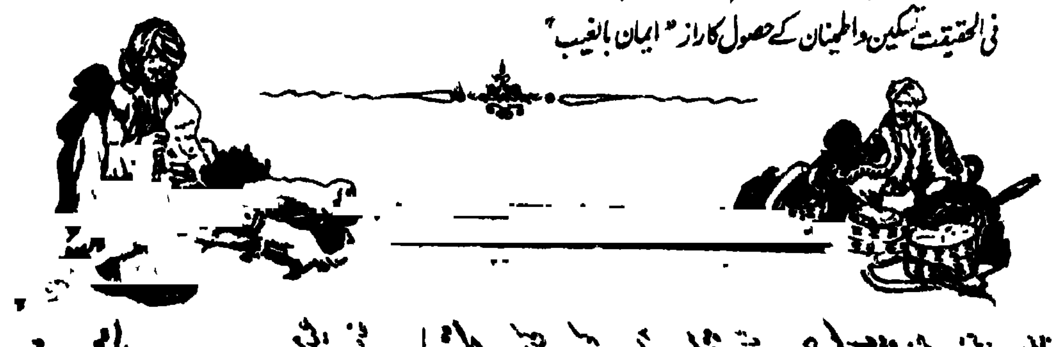
پر یقین لے آئے اور آپ نے اپنی عقل کو ایمان بالغیب کے تابع رکھا، جغرافیہ، تاریخ نیز دیگر دُنیوی علوم کے سلسلہ میں تو آپ کی عقل اس فرو ماندگی کے ساتھ سپر انداختہ ہو جاتی ہے، لیکن افسوس کہ اصُول مذہب کے متعلق آپ عقل کی تلوار کو بے نیام لیکر اُٹھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جسدِ مذہب کی ہر رگ کو قطع کر دیں، کیا اسی کا نام تحقیق ہے؟ یہ تو کھلی ہوئی مذہبی عداوت اور الحاد و دہریت کی دعوت ہے۔

ایک جغرافیہ کی کتاب لکھنے والا آپ کے نزدیک معتبر لیکن وہ ائمہ دین اور پیشوایانِ مذہب جن کی عظمت و صداقت ہر حیثیت سے مسلّم ہے، اُن کے متعلق آپ کی عقل طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اُن کی تنقیص و تذلیل کے لئے آپ کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے! کیا اسی کا نام انصاف ہے کیا اسی کو روشن خیالی کہتے ہیں۔

مذہب کا شکار

تحقیق کا منشا ہے، تسکین ضمیر اور اطمینان قلب، لیکن فی الحقیقت تسکین و اطمینان کے حصول کا راز "ایمان بالغیب" میں مضمر ہے، تحقیق بُری چیز نہیں ہے لیکن تحقیق کی دو صورتیں ہیں ایک تو انکشاف حقائق کے لئے تحقیق کرنا دوسرے اپنے مزعومہ خیال اور مفروضہ اصول کی فتح کے لئے تحقیق آڑ میں ایمان و مذہب کا شکار کرنا، پہلی صورت مستحسن ہے، لیکن صورت ثانی تباہ کن ہے اور اسی کا نام الحاد و دہریت ہے۔

اسلام کی تعلیم شکوک و شبہات سے پاک ہے اُس کا ہر اصُول آئینہ سے زیادہ شفاف اور چاندنی سے زیادہ اُجلا ہے جو شخص عداوت و پندار عقل سے ہٹ کر اُس کی تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہے اُس کو یقیناً اطمینان و سکون کی دولت نصیب ہو سکتی ہے لیکن کمال عقل کے نامنرا پندار کے ساتھ اجتہاد و تحقیق کا دعویٰ کرنا اور پھر اصول اسلام کو اپنے منشار کے مطابق پیش کرنا یہ خدمت اسلام نہیں بلکہ اسلام کی دشمنی ہے اور اس سے کسی قسم کا دینی اور دُنیوی فائدہ نہیں پہنچ سکتا؛ وما علینا الا البلاغ المبین ؛



اِنسان

از جناب حبیب [illegible]

ہستی سے اپنی بیٹھا ہوں میں ہو کے بے خبر ۔۔۔ دھوکا سا دے رہی ہے یہ کوتاہ بیں نظر
ہے طائرِ خیال کی پرواز عرش پر ۔۔۔ پھر اسکے ساتھ گرنے کا بھی دل میں ہے خطر

ہے بادۂ الست کا سر میں مرے خمار
حُسنِ ازل کے جلوے ہیں سینہ میں بیقرار

پہلو میں میرے کیا دلِ حسرت نشاں ہے یہ ۔۔۔ "شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے یہ"
حُسنِ ازل کے نور کا چشمہ رواں ہے یہ ۔۔۔ یا سترِ کُن فکاں کا کوئی رازداں ہے یہ

تیشہ یہ کوہکن کا ہے یا دل کھلا ہوا
پیشِ نظر ہے قیس کے محمل کھلا ہوا

دورِ فلک ہے گردشِ پرکار کی مثال ۔۔۔ ہے داستاں جہان کی اک خوابِ بے خیال
ماہِ تمام کا مجھے بھاتا نہیں کمال ۔۔۔ میرے فروغِ حُسن کی دُنیا ہے لازوال

میرے ہی سامنے رُخِ خورشید زرد ہے
لب پر فلک کے شام و سحر آہ سرد ہے

جلوہ ہے میرا دہر کو حیراں کئے ہوئے ۔۔۔ نظارہ ہے بتوں کو پریشاں کئے ہوئے
گلشن میں گل کا چاک گریباں کئے ہوئے ۔۔۔ اور عندلیبِ زار کو نالاں کئے ہوئے

تصویرِ انتشار ہے گویا مرا وجود
بچوں کا کھیل ہے یہ تماشائے ہست و بود

دُنیا میں حُسن و عشق کی میں بارگاہ ہوں ۔۔۔ منزلِ فنا و فقر کی اُلفت کی راہ ہوں
ہوں شمع یا پتنگے کی خاکِ سیاہ ہوں ۔۔۔ شوریدہ سر ہوں اور بحالِ تباہ ہوں

دُھندلا سا عکس ہوں میں کسی کے جمال کا
پُتلا بنا ہوں آپ ہی اپنے خیال کا

باغِ حیات میں مرے دورِ خزاں نہیں ۔۔۔ ہستیٔ بے ثبات کا نام و نشاں نہیں
منت کشِ فنا مری روحِ رواں نہیں ۔۔۔ وہ گل ہوں جسکا خار بھی دامن کشاں نہیں

کیا مشتِ خاک کیلئے بادِ خزاں کا ڈر
ملجائینگے وہ ذرّے جو ہونگے اِدھر اُدھر

خالی کوئی جگہ نہیں میرے وجود سے ۔۔۔ کون و مکاں کے نقش ہیں دل پر کھنچے ہوئے
تقدیس کی ضیا کے جو شعلے بھڑک گئے ۔۔۔ رازِ نہفتہ پر نہیں پردے حجاب کے

ہستی مری نہاں نہیں دنیائے راز میں ✤ یہ زمزمہ ہے میرا ہی فطرت کے ساز میں

رحم....؟

(جناب سید انیس الدین احمد رضوی امروہوی، ایم اے۔ علیگ)

یارک شائر کے انتہائی شمال میں وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور ایک برانچ ریلوے لائن کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن سے تین میل دور واقع تھا۔ گاؤں میں موجودہ دور ترقی کے آثار و قرائن نظر نہ آتے تھے، البتہ وہ اپنی قدیم روش پر قائم تھا اور قرب و جوار کے دیہات میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سر سبز پہاڑیاں ہر چہار طرف سے اسے محصور، اور بہ ظاہر بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات کو منقطع کئے ہوئے تھیں، بایں ہمہ وہاں بھی انسانوں کی پیدائش، زندگی اور موت کے وہی مناظر نظر آتے تھے، جو خارجی دنیا کے زیادہ اہم مرکزوں میں جاذبِ نظر ہوتے ہیں، اور لوگوں کی کاروباری زندگی میں حسب معمول ایسے وقفے بھی ہوتے تھے جنہیں تفریحی کھیل تماشوں سے پُر کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے تفریحی کھیل تماشہ والے اور شعبدہ باز گاؤں میں کبھی کبھی آتے رہتے تھے، لیکن ان کی ہمت افزائی ان کے حسب دلخواہ نہ ہوتی تھی، گاؤں والے جادو کے کھیلوں میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے تھے۔

لیکن موسم گرما آتے ہی چند بیرونی قافلے گاؤں کے گرجا کے قریب کھلے میدان میں اپنے ڈیرے خیمے نصب کر لیتے، اور تمام گاؤں پر ایک عجیب چہل پہل اور ہماہمی پیدا ہو جاتی تھی، یہ گاؤں کے سالانہ میلے کا آغاز ہوتا تھا، اور دو روز تک گاؤں کی تمام آبادی کا مرکزِ اجتماع وہی میدان رہتا تھا، عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ میلہ اپنی قدیم ایام کی رونق اور عظمت ضائع کر چکا ہے اور اب زوال پذیر ہے ——— اور اس گاؤں سے تعلق رکھنے والی اکثر و بیشتر چیزیں زوال پذیر تھیں۔

میلے کا پہلا دن ختم ہو رہا تھا، رات کے ساڑھے دس بجے تھے اور گیارہ بجے میلہ اگلے روز صبح تک کے لئے بند کر دیا جائے گا، کاروباری حیثیت سے یہ آخری آدھ گھنٹہ بہترین ہوا کرتا ہے چاروں طرف کی سڑکیں تماشائیوں سے بھری پڑی تھیں، تاک جھانک کے تماشہ والا بڑی تیزی کے ساتھ پیسے وصول کر رہا تھا، گو ایک دوسرے تماشہ والا آمدنی کے اعتبار سے اس سے بھی کہیں بڑھا ہوا تھا، لوگوں کی ایک خاصی تعداد کینولیس کے اس خیمہ کی طرف متوجہ تھی جس پر حسب ذیل سائن بورڈ لٹک رہا تھا:۔

سائنس کے دلچسپ لکچر

داخلہ مفت

خیمہ میں ایک طرف کو ایک میز رکھی تھی، جس پر سرخ بانات کا کپڑا پڑا ہوا تھا، اس پر بوتلیں، ڈبے، ایک انسانی کھوپڑی، شیشہ کا ایک عرق کش، ایک بہت بڑی کتاب، اور خشک جڑی بوٹیاں

کے بنڈل بندھے رکھے تھے، اس کے پیچھے مقرر کھڑا تھا، ایک پتلا دبلا بڈھا آدمی جو بھڑکیلے کپڑے کا ایک جبہ پہنے ہوئے تھا، وہ بڑی تیزی طراری اور جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر رہا تھا، اس کا جوش و خروش کمرے کی گرم فضا کے ساتھ مل کر اس کی گرمی میں اضافہ کر رہا تھا، اور کبھی کبھی وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ لیتا تھا۔

"میں عنقریب ہی آپ حضرات کو ایک ایسے راز کا تماشہ دکھانے والا ہوں" وہ صاف صاف، ایک ایک لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "جس کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، اور یقین ہے کہ وہ راز مشرق کے ان عقلمند حکما سے سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے، جن کا تذکرہ کتب سماوی میں کیا گیا ہے"

اب اس نے شیشہ کی دو نلیاں پانی سے بھریں اور بلورہ کے چند سبزی مائل نیلے ٹکڑے ایک میں اور چند زرد ٹکڑے دوسری میں ڈال دیئے۔ اس کی زبان اس دوران میں برابر چلتی رہی اور لاطینی کتابوں کے مقولات، عام پسند قصے کہانیاں، مقامی اور ذاتی اشارہ کنایہ برابر اس کے منہ سے ادا ہوتے رہے، آخر کار وہ پھر اُن ہی دونوں نلیوں کی طرف متوجہ ہوا، جن میں تقریباً بالکل بے رنگ عرق سا نظر آتا تھا، اس نے دونوں کو ایک ساتھ شیشہ کے ایک برتن میں انڈیل دیا اور مرکب نے اسی وقت گہرا زعفرانی رنگ اختیار کر لیا بعدازاں اس نے کسی چیز کا ٹکڑا اس مرکب کی سطح پر ڈالا اور اس ٹکڑے میں فوراً آگ لگ گئی، یہ شعبدہ بہت کامیاب ثابت ہوا، حاضرین اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس شعبدہ کے اسباب و علل پر غور کرنے کی کوشش کرتے، مقرر نے معدہ اور شکم کا تذکرہ شروع کر دیا، معلوم ہوتا تھا، کہ اسے معدہ اور اس کے امراض کے متعلق بہت سی "ناگفتہ بہ" معلومات حاصل ہیں، اس نے عام شکایات کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ گولیاں بنائی تھیں، جو معدہ کی مضبوطی کے لئے بہترین ثابت ہو چکی تھیں،

اور اب وہ گولیوں کو چھ چھ پنس اور ایک ایک شلنگ والے ڈبوں میں فروخت کرنے پر بھی آمادہ تھا، اس نے اسی وقت چار ڈبے فروخت کئے اور اپنی جگہ پر واپس پہنچا ہی تھا، کہ عورت آگے بڑھی۔

"میں بہت غریب عورت ہوں" وہ کہنے لگی۔ "کیا ان گولیوں کا ایک ڈبہ آپ مجھے آدھی قیمت پر دے سکتے ہیں؟ میرے لڑکے کی حالت خراب ہے، بہت زیادہ خراب، میرے حال پر رحم کیجئے"

بوڑھے مقرر نے اپنی درشت آواز سے عورت کی بات کاٹ دی۔

"عورت، میں نے کبھی کسی پر رحم نہیں کیا۔ حتیٰ کہ خود اپنے اوپر بھی نہیں"

بہرکیف کسی نیک دل دوست نے کچھ رقم عورت کے ہاتھ پر رکھ دی اور اس نے دو ڈبے خرید لئے۔

(۲)

اب رات کے بارہ بج چکے تھے، میدان کے خیموں اور دکانوں کی لہراتی ہوئی روشنیاں خاموش ہو چکی تھیں، تماشوں کے خستہ و ماندہ منتظمین خوابِ غفلت کے مزے لے رہے تھے قبرستان کی قبروں کے پتھر تیز اور شفاف چاندنی میں سفید سفید چمک رہے تھے لیکن اسی کینوس کے خیمے کے دروازے پر "نیم حکیم خطرۂ جان" بوڑھا ایک صندوق پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا، اس نے جبہ اتار ڈالا تھا اور صرف قمیص پہنے بیٹھا تھا، اس کے کپڑے کالے اور پھٹے پرانے تھے، اچانک اس نے کان کھڑے کئے ــــــــ اسے خیال ہوا کہ کہیں سے سسکیوں کی آواز آئی۔

"یہ بھی عجب خود غرض دنیا ہے" اس نے بلند آواز سے کہا، تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا، اور پھر کہنے لگا: "نہیں، میں نے خود اپنے اوپر بھی کبھی رحم نہیں کیا، حالانکہ اکثر سمجھتا یہی رہا کہ خود پر

رحم کر رہا ہوں، ورنہ اس حالت کو نہ پہنچتا۔"

اس نے پائپ منہ سے نکالا اور تھوکا، دوبارہ پھر وہی حیرت انگیز آواز گریہ وزاری کی سنائی دی، اس مرتبہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آواز کی جانب چل دیا۔

ہاں! یہی وہ جگہ ہے، آواز اس خیمہ سے آ رہی تھی جو گنجان درختوں کی تاریکی میں تنہا کھڑا تھا، خیمہ پر نمائشی تصاویر بنی ہوئی تھیں اور دروازہ سے زمین تک چند سیڑھیاں تھیں، اسے یاد آیا کہ دن میں بھی اس نے اس خیمہ کو ایک مرتبہ دیکھا تھا، صاف ظاہر تھا کہ اندر کوئی شخص کسی مصیبت میں ــــ کسی بڑی مصیبت میں ــــ مبتلا تھا، بوڑھے آدمی نے آہستہ سے دروازہ پر کھٹکھٹایا۔

"یہاں کون رہتا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اندر سے ایک شکستہ آواز آئی۔

"کیا تم کوئی عورت ہو؟"

ایک خوفناک قہقہہ کی آواز سنائی دی۔

"نہ مرد نہ عورت ــــ صرف ایک تماشہ۔"

"کیا مطلب؟"

"خیمہ کے بازو پر جائیے اور خود دیکھ لیجیے۔"

بوڑھا ڈاکٹر اس طرف گیا اور دو دیا سلائیوں کی روشنی میں خیمہ پر بنی ہوئی بھدی تصویر کا ایک حصہ اسے نظر پڑا، دیا سلائیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑیں، وہ واپس آکر خیمہ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"تم ویسی تو نہیں ہو؟" اس نے کہا۔

"جی نہیں۔ اس سے بدتر۔ میں خوبصورت کپڑے نہیں پہنے ہوں، مخملی کوچ پر نہیں لیٹی، اس کے برعکس اس ملعون خیمہ کے ایک گوشہ میں آدھی ننگی پڑی ہوئی کراہ رہی ہوں، کیوں کہ میرے مالک نے مجھے مارا ہے، اب جائیے، ورنہ دروازہ کھول کر جس حالت میں ہوں، وہ آپ کو دکھا دوں گی، آپ خوفزدہ ہو جائیں گے رات کو خواب میں چونک پڑیں گے۔"

"میں کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوتا ایک مرتبہ یہ حماقت ضرور سرزد ہو گئی تھی، لیکن اس کے بعد سے کبھی نہیں ڈرا، اس مالک کو تم پر کیا حق حاصل ہے؟"

"وہ میرا باپ ہے۔" آواز نے زور سے چلا کر کہا، اس کے بعد پھر کچھ گریہ وزاری سنائی دی اور وہ پھر کہنے لگی۔

"بڑی مصیبت ہے، میں تو اب ہر بات برداشت کرنے کو تیار ہوں ــــ ہر بات ــــ اگر وہ اس حالت سے بہتر ہو ــــ لیکن کیا ہوگی! میرا دماغ زنانہ ہے، میری ضروریات بھی زنانہ ہیں، لیکن میں عورت نہیں ہوں، ایک تماشہ ہوں، وحشی درندے تماشائی مجھے گھیر لیتے ہیں، مجھ سے بات چیت کرتے ہیں، مجھے چھو کر دیکھتے ہیں۔"

"ایک طریقہ ہے اس سے نکلنے کا۔" بوڑھے نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہا۔

اغلباً اس کے دماغ میں کوئی نیا خیال پیدا ہوا تھا۔

"میں جانتی ہوں، لیکن اسے اختیار کرنے کی ہمت نہیں، یہاں بھی ایک چیز میرے پاس ہے، لیکن اسے استعمال کرنے کی ہمت نہیں۔"

"تم کوئی ایسی چیز پی سکتی ہو جس سے تکلیف کا اندیشہ نہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تنہا ہو تم کیا؟"

"جی ہاں، میرا مالک گاؤں کی سرائے میں ہے۔"

"اچھا تو ایک منٹ ٹھہرو۔"

بوڑھا تیز قدم ڈالتا ہوا اپنے کینوس کے خیمہ پر واپس

آیا اور عرق و ادویہ میں جلد جلد کچھ تلاش کرنے لگا، اسی دوران میں اس نے آخر کار کسی پر رحم کرنے کے متعلق چند الفاظ زیرِ لب گنگنا کر کہے، اس کے بعد وہ ایک بے رنگ عرق کا گلاس ہاتھ میں لئے دوسرے خیمہ کو واپس ہو گیا۔

"دروازہ کھول کر اسے لے لو" اس نے آواز دی۔

دروازہ بہت تھوڑا سا کھلا اور ایک پتلے دُبلے ہاتھ نے باہر نکل کر گلاس کو پکڑ لیا، دروازہ پھر بند ہو گیا اور اسی آواز نے کہا۔

"اس میں آسانی رہے گی؟"

"ہاں"

"اچھا الوداع۔ آپ کی صحت کا جام ——"

بوڑھے کو لکڑی کے صندوق پر گلاس کے پٹخے جانے کی آواز آئی، اس کے بعد وہ پھر اپنے خیمہ کے سامنے اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور احتیاط کے ساتھ اپنا پائپ دوبارہ سلگا لیا۔

"میں نہیں جاؤں گا" وہ بلند آواز سے کہنے لگا "مجھے کسی چیز کا خوف نہیں —— حتیٰ کہ اپنے بہترین کارنامے کے نتائج کا بھی نہیں۔"

وہ کان لگا کر سننے لگا۔

دوسرے خیمہ سے اب کوئی آواز نہ آتی تھی، تمام میدان پر خاموشی مسلط تھی، بہت دور مشرق کی طرف آسمان طلوعِ سحر کی رنگ آمیزیوں کی بدولت زیادہ روشن اور زیادہ دل فریب ہوتا جا رہا تھا۔

(بیری پین)

انیس رضوی امروہوی

دُنیا میں جہنم

بیوی کا لیکچر

(پردہ پر)

آگ لگے اس پردہ کو، بھاڑ میں جائے یہ پردہ جس نے ہمکو بالکل لنگڑہ، اپاہج بنا دیا ہے، نہ کسی کام کی نہ کاج کی دنیا بھر کی محتاج، ذرا ذرا سی چیز کیلئے ایک ایک سے خوشامد کرنا اور پھر بھی نہ میسر آئے نوج ایسا پردہ کس کام کا، اپنے حساب قیدخانہ میں بند ہیں نہ کہیں آنے کے نہ کہیں جانے کے، دم گھٹ گھٹ کر رہتا ہے جی گھبراتا ہے مگر کیا کریں مجبوری نے قفس میں لاکر بند کر دیا ہے۔ سنتے ہو اس سے تو یہ اچھا ہے کہ مجھے پھانسی لگا دو، مجھ سے تو گھٹ گھٹ کے نہیں مرا جاتا، تمکو کیا اگر تم بھی ہماری ہی طرح پردہ میں رکھے جاتے تو پتہ چلتا، اب بھی دیکھو ناکہ اگر ایک منٹ کیلئے بھی تمکو کوئی گھر میں روک لینا چاہے تو نہ رکوگے ہزاروں حیلہ بہانے کرتے ہو کبھی کہتے ہو کہ ذرا سی تازہ ہوا کھا آئیں کیونکہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے کبھی کہتے ہو کہ گھر میں بیٹھکر دم گھبرا جاتا ہے میں پوچھتی ہوں کہ کیا ایک تم ہی دنیا میں انسان ہو آخر میری بھی جان ہے تمہاری ہی طرح ایک میں بھی انسان ہوں بس یہی نا کہ تم مرد ہو اور میں عورت تو کیا میں شکر کی پڑیا ہوں کہ کوئی مجکو گھول کر پی جائیگا تر نوالہ ہوں کہ مجھکو کھا جائیگا، تمہاری ہی طرح دنیا میں سب مرد بدنیت ہیں خدا خدا کرو میں تو اس ہر وقت کی کوفت سے گھلی جاتی ہوں مجھے تو یہ قید و بند نہ بھیگی اب تو میں ایک منٹ کیلئے بھی گھر میں نہ بیٹھوں گی جب تم روزانہ سیر سپاٹا کرتے ہو ایک ایک دو دو بجے رات تک مٹر گشتی میں رہتے ہو تو کیا مجھ کمبخت ماری ہی پر ساری کمبختی آفت آئی تھی ہزاروں بندیاں اسی طرح سے کھلے بندوں جاتی ہیں سیر کرتی ہیں اور گھر واپس آتی ہیں مجھ میں ایسے کونسے لعل لگے ہیں جو کوئی توڑ لیگا مہینوں ہو گئے ہر وقت طبیعت مضمحل رہتی ہے نہ اچھی طرح کھانا کھایا جائے نہ نیند آئے اگر باہر کی تازی اور کھلی ہوا میں ایک گھنٹہ بھی ملجائے تو یہ سارا فساد دور ہو جائے لیکن وہ تو کمبخت پردہ مارے ڈالتا ہے جیسے ایک تمہیں تو اب دُنیا میں اکیلے شریف رہ گئے ہو اور سب کے سب رذیل آباد ہیں کل ہی کا ذکر ہے کہ کمبخت بندے بیچنے والا دروازے پر گھنٹوں چیختا رہا، نہ تو حرامزادی نصیبن گھر میں نہ موئے کریم کا پتہ اور تم تو بھلا کاہیکو ہوتے کمبختی کی ماری پردے کا بُرا ہو سنکر رہگئی بندے نہ خرید سکی پیاس کے مارے چاہے دم نکلجائے لیکن دوپہر میں ٹھنڈا پانی نہیں نصیب آتا اور نصیب ہو تو کیا ہو اسوقت کوئی گھر میں موجود نہیں نہ گھر میں ٹھنڈا پانی رہتا ہے نہ باہر سے برف خرید سکتی ہوں ——— ہاں ہاں مجھ کو معلوم ہے کہ پردہ کرنا چاہیئے میں نے شرع و حدیث پڑھی ہے مگر وہ شرع نہیں پڑھی جو تم نے پڑھی ہے تمہاری شرع ہماری شرع سے بالکل الگ ہے کہتے ہوئے شرم تو نہیں معلوم ہوتی کیا اسقدر سخت پردہ شرع میں ہے پڑھے نہ لکھے ملا فاضل نام، توبہ توبہ پردہ کے معنی بھی تو تمکو نہیں معلوم ہیں اور پھر اسپر پردہ پردہ بگھارتے ہو، اچھا اب کل سے تمکو بھی اسی پردے میں رہنا پڑیگا عورت کیلئے حیا، غیرت، پردہ دنیا بھر کی چیزیں ہیں لیکن مردوں کیلئے کچھ نہیں بالکل آزادی، جو چاہے کریں گویا توبہ توبہ اللہ میاں نے دوزخ و جنت سب عورتوں

ہی کیلئے بنائی ہے سو بیچارے فرشتوں کی صف میں داخل ہو جائینگے خدا کی پناہ تمہاری عقل تو جیسے ماری گئی ہے میں کہتی ہوں کیا پردہ میں رکھکر اچار ڈالو گے یا کیا کروگے تمہارے خاندان میں تو لوگ اتنے کٹر ملا نہیں تھے، مگر آپ بس کڑوا کریلا ہوتے جاتے ہیں اچھا میں کہتی ہوں کہ مجھے تم شتر کوٹھڑیوں میں بند رکھو مگر آج سے گھر کی تمام ذمہ داریاں بھی لیلو اور اگر یہ نہیں کرسکتے تو لو آؤ تم پردے میں بیٹھو اور مجھ باہر جاکر سارا کام انجام دینے دو بس خالی خولی پردہ کا نام ہی سُن لیا ہے اور خدا کے فضل وکرم سے کسی چیز سے واسطہ نہیں ہے، مُنے کو دیکھو کہ ایک ایک چیز کیلئے پھڑک پھڑک کر رہتا ہے دروازے پر دُنیا بھر کی چیزیں بکنے آتی ہیں مگر میرے کس کام کی، نہ تم گھر میں رہتے ہو نہ نیک بخت نصیبن کا پتہ رہتا ہے میں تمہیں کہ پردے کی بولو بنی ہوئی ہوں، کوئی آواز نہ سُن لے کوئی جھلکی نہ دیکھ لے، نگوڑا پردہ کیا ہے عذاب جان، یا کوئی شیر بھیڑیا کہ کسی کو پھاڑ ڈالیگا کوئی سُنے تو کیا کہے اور کیا مذاق اُڑائے اور پھر لطف یہ کہ گھر میں بیشتر باہر کی ساری ذمہ داری مجھ پر، ایک طرف تو پردے کی تاکید ہے اور دوسری طرف مزاج میں یہ بوکھلاہٹ کہ مجھی سے پوچھتے ہو، رضا آئے اور چیخ کر چلے گئے، چپراسی دفتر سے فائلیں لینے آیا اور کوئی نہ بولا، ممتاز مجھے دریافت کرنے آئے اور یونہیں واپس گئے، بلا سے میری جوتی سے ... رضا آئے چیخکر چلے گئے، اچھا ہوا چپراسی کمبخت یونہیں واپس گیا، خوب ہوا ممتاز کو کسی نے جواب نہ دیا، کیوں یہ بھول گئے تھے کہ میں پردے میں رہتی ہوں، کیا یہ خبر نہ تھی کہ کسی کو آواز سُنانا گناہ ہے اب ساری شرع غائب ہو گئی، رکھو نا اور دو تین نوکر کہ موئے دروازے پر ہر وقت پڑے رہیں اور تمہارے احبابوں کی خاطر و تواضع کیا کریں، کوئی جواب دینے والا ہو تو کیوں کوئی چیخکر واپس جائے، مجھ پر کیوں غصہ دکھاتے ہو، پردہ بھی چاہتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو یہ سب کچھ خدمت بھی انجام دیا کروں؟ اب تمہیں کھوکو اور تمہیں جانو، مجھ پر تو پردہ کا بھوت سوار ہے اور اب میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ سارے کام یونہی پڑے رہا کریں گے یا تو تم خود کروگے یا کوئی دوسرا انتظام کروگے گھر میں ایک اور ماما نوکر رکھو تاکہ باہر کے مردوں سے بات چیت کرے سب کی خاطر مدارات کرے ہاں پوسٹ مین کتابوں کا پارسل لے کر آیا تھا پھر میں کیا جانوں واپس گیا ہوگا کمبخت بھاڑ میں جائے پوسٹ مین اور آگ لگے پارسل کو میں کیا کرتی، میں کیا پردہ توڑ دیتی، تم جانو تم بھگتو، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے اب میں پردہ کروں گی اور اس سے زیادہ سخت پردہ کرونگی واہ وا یہ بھی خوب رہی کہ میں تو قیدخانہ میں پڑی سڑا کروں اور آپ دن رات شہر بھر میں بغلیں بجاتے پھرا کریں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اسطرح قید کرکے تم آزادی سے گلچھرے اڑاؤ گے اگر تم ایک قدم تو میں سو قدم تم سے آگے رہوں گی، تم اگر ایک مرتبہ سنیما جاؤ گے تو میں دس مرتبہ سنیما جاؤں گی، بڑے آئے وہاں سے پند و نصیحت کا دفتر لے کر، پہلے آپ اپنی عاقبت کی خبر لیجئے اس کے بعد پھر ہمارے گناہ بخشوائیے گا، ہمارے لئے پردہ بھی ہے، شرع بھی ہے اور ساری دُنیا کی جکڑ بندیاں مگر خود اپنے لئے حرام حلال سب جائز ہے، بس خبردار جو آج سے پردہ کا نام لیا تو تم جانو گے اور نہیں تو، دیکھتے ہو، میں ساری مشیخیت نکال دوں گی بس ایک میرے پردے سے آپ کی ناک کٹ جائے گی؟ جب دروازے پر سینکڑوں تقاضے کرنے آتے ہیں بُرا بھلا کہتے ہیں تب آپ کی ناک کہاں چلی جاتی ہے اور سب کچھ بھول گئے لے دے کے بس ایک سبق یہی یاد رہ گیا پردہ، پردہ، پردہ - فقط۔

(آمنہ بیگم سلونوی)



نقش دیوار

جناب عبدالغفور صاحب طاہر قریشی

میرا دل اب بھی اس کو مت سے لرزاں ہے۔ جو مجھ ڈینی سے شام کے وقت پہنچی۔ ہم فوق العادت واقعات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے ——— جو ایک بے فائدہ اور لا متناہی مضمون ہے۔ اور ہم میں سے ہر ایک نے ایسے واقعات بیان کئے جو نہایت غیر دلچسپ تھے جماعت کے افراد میں ایک سفید رو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جو ہر ایک کی کہانی غیر منقسم توجہ سے سن رہا تھا۔ مگر خود خاموش تھا۔ ڈینی نے اسے گفتگو میں شریک کرنیکی خاطر کہا "کیا آپ کو کوئی ایسی کہانی یاد نہیں؟" وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا "معمولی کہانیوں میں سے نہیں۔ جیسی کہ تم بیان کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ "سچ" نہ صرف تحیر خیز ہوتا ہے۔ بلکہ بہت زیادہ دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ میں تمہیں ایسی کہانی سناؤنگا جو میرے ذاتی تجربے سے تعلق رکھتی ہے اور جو ابھی ابھی اختتام پذیر ہوئی ہے"

ہم نے اس سے بیان کرنیکی درخواست کی اس نے کہا۔

ایک یا دو سال کا ذکر ہے میں گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں اقامت گزین تھا۔ میرا مسکن ایک فرسودہ گھر تھا۔ سونے کے کمرے کی دیواریں صاف کرانے والے نے بری طرح خراب کر چھوڑی تھیں۔ اور اب وہ نم آلودہ معلوم ہوتی تھیں۔ کئی جگہوں سے سفیدی اتر چکی تھی۔ ایک جگہ سے ——— اور یہ اکثر ظہور میں آتا ہے ——— سفیدی کے اکھڑ جانے سے انسانی شکل بن گئی تھی۔ مگر یہ شکل غیر معمولی طور پر حیرت انگیز تھی۔ بستر پر سوتے وقت، صبح کے وقت، شام کیوقت غرضکہ ہر وقت میں اسے دیکھا کرتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ میں اسے زندہ اور اصلی خیال کرنے لگا۔ مگر سب سے زیادہ عجیب چیز یہ تھی کہ دوسرے نقوش تو بتدریج بڑے ہوتے رہتے تھے لیکن منہ ویسے کا ویسا تھا۔

میں وہاں زکام کے مرض سے بری طرح بیمار ہو گیا۔ سارا دن سوائے کتب بینی یا سوچ بچار کے اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ اور یہ اسی وقت کا ذکر ہے جب نقش مذکور نے مجھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ شب و روز اس نے میرے تمام خیالات پر غلبہ پالیا۔ اسکی ناک بہت عجیب بنی ہوئی تھی۔ اور پیشانی کی ڈھلان لاثانی تھی۔ حقیقتاً وہ ہزاروں میں سے واحد شخص ہوگا جس کے چہرے کی شبیہ دیوار پر ثبت تھی۔

میں تندرست ہوگیا۔ مگر وہ چہرہ ہر وقت میرے سامنے رہتا۔ میں گلیوں میں اس جیسا چہرہ معلوم کرنے کی

خاطر پھرتا رہتا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس چہرے والا آدمی لندن میں ضرور موجود ہے۔ اور اسے میں ضرور ملونگا۔ میں ان جگہوں میں ڈھونڈتا پھرتا۔ جہاں لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ مثلاً سیاسی مجمعوں میں فٹ بال کے میچوں، ریلوے اسٹیشنوں پر، جب کہ غیر ملکی گاڑیاں اجنبیوں کو لندن لاتی اور شام کے وقت باہر لے جاتی ہیں مگر بے سود ـــــ ! ہر ایک شخص کا چہرہ الگ الگ تھا۔

تلاش نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں نے دیگر تمام امور چھوڑ دیئے۔ اور لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ تا آنکہ وہ مجھے دیوانہ خیال کرنے لگے۔ اور پولیس مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں عورتوں پر کبھی بھی نگاہ نہ ڈالتا۔ ہر وقت مرد میرے پیش نظر تھے۔

اس نے کسلمندانہ انداز سے ایک ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا۔ اور آخر کار میں نے اُسے پا لیا۔ جس کا میں اتنے عرصے متلاشی تھا۔ وہ موٹر پر جا رہا تھا۔ میں ایک ٹیکسی لے کر اس کے پیچھے بھاگا۔ "ڈرائیور! اس سامنے والی موٹر کے پیچھے پیچھے چلو۔" میں نے کہا۔ ڈرائیور نے موٹر مذکور کو تاک میں رکھا، اور مجھے چیرا ٹنگ کراس پر جا اتارا۔ میں پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ اور مطلوبہ شخص کو دو عورتوں اور ایک لڑکی کے ساتھ کھڑا پایا۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود، وہ گاڑی پر سوار ہو گیا۔

میں نے جلدی سے فاکس ٹون کا ٹکٹ خریدا۔ تاکہ اسے کشتی پر پکڑ سکوں۔ مگر فاکس ٹون پر وہ ایک جہاز پر سوار ہو کر غائب ہو گیا۔ وہ بظاہر متمول معلوم ہوتا تھا میرے پاس کرایہ گو کم تھا۔ مگر یہ حوصلہ شکن امر مجھے میرے ارادے سے نہ روک سکتا تھا۔ میں اس کے کمرے کے مقابل ایک کمرہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور وہ چھوٹی لڑکی کے ساتھ باہر نکلا۔ میرا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ جس سے تمام کشتی متحرک ہو رہی تھی۔

"کیا آپ مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ دکھا سکتے ہیں؟ آپ سے ایک اہم کام ہے" میں نے کہا۔ اس پر وہ بہت حیران ہو گیا۔ مگر اس نے میری درخواست قبول کر لی، نہایت فراخدلی سے اس نے اپنا کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ مجھے دیوانہ خیال کرتا ہوگا۔ اس لئے میرے ساتھ گفتگو کرنے کو پسند نہ کیا۔

میں نے تنہائی میں جا کر کارڈ پر نظر ڈالی میری آنکھیں اندھیر ہو گئیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ کارڈ پر یہ الفاظ مرقوم تھے: "مسٹر آرمنڈل ہمپس برگ امریکہ"۔ . . . اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا حتیٰ کہ میں نے اپنے آپ کو ایک ہسپتال میں پایا۔ میں وہاں سے ایک ماہ قبل آیا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ہاں تو۔ اس کے بعد میں گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں پہنچا۔ تاکہ اس امریکن کو معلوم کروں۔ میں نے امریکہ خطوط بھیجے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں سے استصواب کیا مگر بے سود اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

وقت گذرتا گیا۔ کل میں خلاف معمول تھکا ماندہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اور اس وقت جاگا جب کہ سورج کی کرنیں کمرے میں رقص کر رہی تھیں۔ میں نے فوراً دیوار

…طرف دیکھا —— وہ نقش بہت مدہم پڑ چکا تھا
میں اسی ادھیڑ بن میں کبیدہ خاطر ہو کر اٹھا۔ شام
ے وقت کے اخبارات نکل چکے تھے۔ میں نے امریکہ کے
یک اخبار کی فہرست پر نظر ڈالی تو ذیل کی خبر دیکھی۔
"امریکہ کے ایک متمول شخص —— آرمنڈ وال
—— کا حادثہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔"
میں اپنے کمرہ میں واپس آگیا۔ اور بستر پر سے دیوار
طرف دیکھنے لگا۔ وہ نقش غائب تھا —— !
یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"بہت خوب" ہم سب نے کہا
"ہاں ہاں" اجنبی نے جواب دیا۔ میری اس کہانی
میں تین خصوصیات حیرت انگیز ہیں۔ پہلی یہ کہ دیوار کے
نقش کے عین مشابہ ایک زندہ شخص مل گیا۔ دوسری یہ
کہ اس شخص کا نام مقام مذکور کے نام سے بہت مناسبت
رکھتا ہے۔ اور تیسری یہ (اس نے دروازہ کھول کر شب
بخیر کہتے ہوئے کہا) اور یہ سب سے اہم ہے کہ یہ کہانی میں
نے اب سے آدھ گھنٹہ پہلے اختراع کی تھی —— !

(ای۔ وی۔ لیوکس) (طاہر قریشی)

تغزل کا دلفریب رنگ

جناب ولی حیدر گہرؔ ابن صفیر بلگرامی !!!

…بستہ گیسو وحشی ہے۔ اور غم کے سبب دلگیر بھی ہے
ہر طوق گلے میں الفت کا۔ پاؤں میں پڑی زنجیر بھی ہے

…پہلو میں عدو کے دیکھا ہے۔ گردن وہ جھکائے بیٹھے تھے
اس خوابِ پریشاں کی تعبیر۔ کہئے تو کوئی تعبیر بھی ہے

…ن کڑوی میٹھی باتوں کا۔ کچھ حال نہ پوچھو اے ہمدم
کچھ تلخی کی آمیزش ہے۔ کچھ شہد بھی ہے کچھ شیر بھی ہے

…س کس سے بچائیں دل کو ہم۔ بچنے کی نہیں کوئی صورت
قاتلِ جاں آنکھیں تیری۔ کچھ سرمہ کی تحریر بھی ہے

…ہ وقت گیا۔ وہ دن بھی گئے۔ وہ رات گئی! پر تم وہ نہیں
اب تک ہے محبت دل میں بھری۔ آنکھوں میں تری تصویر بھی ہے

…ر مٹنے کو ہم حاضر ہیں۔ وہ ترچھی نظر سے دیکھیں تو
ابرو کا اشارہ کافی ہے۔ گو پاس ترے شمشیر بھی ہے

…امید میں ساری عمر کٹی۔ اب آئیں گے۔ اب آئیں گے
کچھ تو ہی بتا دے پیکِ صبا۔ ملنے کی کوئی تدبیر بھی ہے

…پھر کچھ بھی بنائے بنتی ہے؟ جب بات بگڑتی ہے اپنی
تو مجھ سے پھرا جب سے دلبر۔ برگشتہ مری تقدیر بھی ہے

…ہوں محوِ خیالِ جانانہ۔ کچھ حال نہ پوچھو اس دل کا
چپ میں بھی کھڑا ہوں اک جانب۔ سکتے میں تری تصویر بھی ہے

…س طرزِ بیاں کا کیا کہنا۔ ہو سہل گہرؔ جس کی اردو
جو سیدھی سادی بندش ہو۔ وہ رنگ بھری تحریر بھی ہے

شیر شاہ کا مقبرہ

جناب سید محمد موسیٰ اخگر سیمابی سہسرامی

قبل اس کے کہ شیر شاہ کے روضہ کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی توجہ اس زندہ جاوید بادشاہ کی طرف مبذول کرائی جائے گو اس کی ذاتِ ستودہ صفات ہرگز اس امر کی محتاج نہیں آج ہندوستان کیا دنیا کا بچہ بچہ شیر شاہ کے حالات زندگی سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے صدہا اوراق ایسے دلاور، شجاع اور کبھی نہ بھولنے والے شہنشاہ کی مدح و ستائش میں لکھے گئے ہیں کیا دنیا اسکے پرشوکت عہد سلطنت کو فراموش کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں

شیر شاہ کون تھا؟ کس طرح پردۂ دنیا پر مختصر مگر کامیاب حکومت کر گیا؟ شیر شاہ سور خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ اور اس کا دادا بہلول لودی کے دورِ حکومت میں ہندوستان آیا۔ شیر شاہ کے باپ کو سلطان جونپور کی طرف سے صوبہ بہار میں ایک پرگنہ سہسرام جاگیر میں ملا۔ اور شیر شاہ موجودہ شہر سہسرام سے ایک میل شمال کی جانب بستی لال گنج میں پیدا ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے شیر خان کا خطاب کیونکر ملا۔ تاریخ ہند شاہد ہے کہ شیر خان حاکم بہار سلطان محمد کے دربار میں سپاہیانہ حثیت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے آقا کی معیت میں شکار کو گیا اور وہاں اس نے اپنے مالک کے روبرو کسی شیر کو مار ڈالا۔ اسی موقعہ پر حاکم بہار نے شیر خان کا لقب اسے عطا کیا اور وہ فرید خان سے شیر خان ہو گیا جب شیر خان کا آقا انتقال کر گیا تو اس کا جانشین سلطان جلال بہار چھوڑ کر بنگالہ چلا گیا۔ اور شیر خان خود حاکم بہار بن بیٹھا۔ ۱۵۳۸ء میں بنگالہ کے دارالسلطنت پر حملہ کیا اور وہاں کے بادشاہ کو شکست دیکر شاہ کا لقب اختیار کیا غرض اپنی حکومت کے ۵ برس کے مختصر وقفے میں اس نے قریب قریب تمام ہندوستان کو فتح کر لیا۔ اور آج اپنی ہمت و شجاعت کے باعث ایک سپاہی سے ایک دلیر، بیدار مغز اور نکتہ رس بادشاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسی موقعہ پر اس کے کارہائے نمایاں کو بھی اختصار کے ساتھ واضح کر دیا جائے تو ناظرین کے لئے بعید از دلچسپی نہ ہوگا۔

شیر شاہ نہایت عاقل، عادل، رعایا پرور اور رحمدل بادشاہ تھا۔ انصاف کے وقت اپنے بیگانے سے یکساں برتاؤ رکھتا تھا۔ رفاہ عام کے لئے بنگال سے پنجاب تک پکی سڑک بنوائی جو اب بھی موجود ہے۔ اس نے دو دو

کوس کے فاصلے پر سرائیں تعمیر کرائیں اور ہر ڈیڑھ میل پر کنوئیں کھدوائے۔ اس کا یہ فرمان تھا کہ بلاتفریق مذہب وملت ہر منزل پر سرکاری خرچ سے مسافروں کی مہمانداری کی جائے۔ سڑک کے دو جانب سایہ دار اشجار لگوائے تاکہ مسافر دھوپ سے محفوظ رہیں۔ اول اول ہندوستان میں ڈاک کا رواج گھوڑوں کے ذریعہ اسی نے ایجاد کیا

مورخین شیر شاہ کے انتقال کے متعلق یوں قمطراز ہیں کہ شیر شاہ جب قلعہ کالنجر کو فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو قلعہ کی دیوار سے گر کر ہلاک ہوگیا۔ شیر شاہ نے ہنگام مرگ یہ وصیت کی کہ مرنے کے بعد مجھے میرے وطن سہسرام میں دفن کیا جائے۔ لہذا حسب وصیت اس کی لاش سہسرام لائی گئی اور سور خاندان کا یہ ماہ روشن یہیں سپرد خاک کیا گیا

شیر شاہ کے لائق بیٹے سلیم شاہ نے والد کے مقبرے کی بنیاد خود اپنے ہاتھ سے رکھی۔ اور اس کی تعمیر کے لئے محتاط منتظمین نیز اس دور کے مشہور و معروف معماروں اور کاریگروں کو مقرر کیا۔ سلیم شاہ آگرہ اور دہلی میں رہ کر ضروری باتوں کی ہدایت ہمیشہ معماروں کو دیتا رہا۔ ۸ برس کی طویل مدت میں جب روضہ کی تکمیل ہوئی تو سلیم شاہ بذات خود فاتحہ خوانی کے لئے سہسرام آیا۔ اور روضہ کی تعمیر کے بعد غریبوں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی۔

مقبرہ شہر کے مغرب کی جانب ایک پرفضا جگہ پر واقع ہے۔ یہ دو ہزار فٹ مربعہ ہے عمارت ہشت پہلو ہے۔ روضہ کے ہر چہار طرف ایک میل کی پختہ سڑک ہے اس کے بعد تالاب ہے جس کا طول اور عرض قریباً گیارہ سو فٹ ہے۔ اسی کے ٹھیک وسط میں روضہ قائم ہے۔

روضہ پر جانے کے لئے شمالی سڑک سے راستہ ہے یہاں شیر شاہ کے ایک وفادار ملازم کا چھوٹا سا مقبرہ ملتا ہے جس کے وسط میں اس کا مزار ہے اور وہ مرنے کے بعد بھی اب تک دربانی کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ اسی مقبرہ کے دروازہ سے گذر کر جنوب کی جانب زینوں سے اس راستے پر اترتے ہیں جو روضہ تک جاتا ہے۔ اس راستہ کی لمبائی ساڑھے تین سو فٹ ہے اسی راہ میں ایک مختصر سا پل ہے جس سے تالاب کا پانی با آسانی ایک طرف سے دوسری طرف آتا جاتا رہتا ہے۔ یہاں چند ٹیلے نظر آتے ہیں جو قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت سڑک کی دونوں جانب محرابوں کی صورت میں استادہ تھے موجودہ راستے کی مسافت طے کر کے پھر زینوں سے اوپر جانا پڑتا ہے جہاں پہلا دروازہ ہے۔ اس سے گذر کر ایک چبوترے کے احاطے میں پہنچتے ہیں۔ جس کی بلندی ۳۰ فٹ ہے۔ اسکی بنا ایک دوسرے نچلے چبوترے پر قطب نما کی صورت میں ہے۔ چبوترے کے نیچے ہر چہار طرف سنگین زینے ہیں۔ جو تالاب کے اندر تک چلے گئے ہیں نچلے چبوترے تک جانے کے لئے اوپر کے چبوترے سے چار راستے ہیں۔ اوپر کے بڑے چبوترے کے چاروں طرف منڈیر ہیں اور ہر گوشہ پر آٹھ دروازوں والے ہشت پہلو اور خوبصورت گنبد ہیں اور ہر ایک کی بلندی ۳۰ فٹ ہے۔ مغربی سمت کے سوا چہار دیواروں میں چار کھمبوں والے گنبد ہیں۔ جہاں سے تالاب کا منظر دیکھنے میں بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ چبوترے کے بالکل وسط میں مقبرے کی پختہ ہشت پہلو عمارت ہے جس کا ہر پہلو باہر سے ۷۰ فٹ اور اندر سے ۴۳ فٹ لمبا ہے۔ پہلی دیوار کی بلندی اول

درجہ تک ہے۔ اور منڈیروں تک جاکر ختم ہو جاتی ہے دوسرے پہلو کی دیوار دوسرے درجہ تک جاکر ختم ہو جاتی ہے۔ دونوں پہلوؤں کی دیواروں سے جو سائبان بنتا ہے۔ اس کا عرض دس فٹ ہے۔ جس کی بلندی چھت تک تقریباً ۴ فٹ ہے۔ سائبان مذکور کے اگلے ہر پہلو میں تین تین بڑے محرابی در ہیں اندرونی پہلو میں مغربی سمت کے علاوہ گاتھک وضع و قماش کے محرابی دروازے ہیں۔ صدر دروازہ شمال کی جانب ہے۔ اس سے ہوکر پر شوکت ایوان میں پہنچتے ہیں جس پر ایک سر بفلک عالیشان قبہ تعمیر ہے۔ اس میں گاتھک وضع والے دروازوں کے اوپر چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں۔ اوپر کے حصے میں متفرق قسم کے جالیوں کے تراشے ہوئے پتھر نصب ہیں۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ ہوا، اور روشنی برابر آتی رہے۔ ایوان کے وسط میں شیر شاہ کا مزار ہے۔ سرہانے پتھر کا چراغ دان ایک امتیازی خصوصیت ظاہر کرتا ہے اس حصہ میں تقریباً پچیس مزار ہیں جو شیر شاہ کے افسران اور اہل خاندان کے ہیں پچھم کی جانب کے پہلو میں ایک محرابی مسجد ہے جس میں زمانہ قدیم کے کاریگروں کی صنعتیں نمایاں ہیں۔ اعلیٰ قسم کی مینا کاری عمدہ عمدہ سورج مکھیوں کے پھول، بیل بوٹے اپنی اگلی خوشنمائی کا اظہار زبان حال سے کر رہے ہیں۔

محراب میں آیات قرآنی، درود شریف تعلقات تاریخ وغیرہ خط طغرا میں منقوش ہیں جن کی خوبصورتی قابل دید ہے۔ مسجد کی محراب کے اوپر "روضہ متبرکہ حضرت سلطان شیر شاہ نور اللہ مرقدہٗ" منقوش ہے۔

ایوان میں جہاں شیر شاہ کا مزار ہے پہلے درجہ پر جانے کے لئے زینہ ملتا ہے۔ اول درجہ تک جانے میں چھبیس زینے کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ پہلے درجے سے ایک دوسرا زینہ دوئم درجے پر جانے کے لئے ملتا ہے پہلے درجے میں وہی متفرق تراش کے جالیوں والے دریچے ہیں جن سے قبہ کا اندرونی منظر دکھائی دیتا ہے اور انہی دریچوں سے قبہ کی وسط والی آہنی زنجیر (جس میں ایک طلسمی چڑیا آویزاں ہے) کے عجائبات نظر آتے ہیں۔ اس طلسمی چڑیا کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور قدیم کاریگروں کی صنعت وحرفت اور نازک خیالی کا پتہ چلتا ہے۔ آج سائنسدان طبقہ کو ان کا مرہون منت ہونا چاہیے کہ انہی کی اختراع و ایجاد سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے

اس طلسمی چڑیا کی حقیقت یوں بیان کی جاتی ہے کہ کسی دھات کا ایک ہلال ہے۔ جس میں متعدد چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ ہلال کی ساخت فن ریاضی کے قاعدے سے ہے۔ ہلال ایک بڑی آہنی زنجیر سے لگا کر قبہ کی چھت میں آویزاں کر دیا گیا ہے۔ جو تمام جالیوں سے متفرق صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ کہیں سے ہاتھ کی شکل کہیں سے طوطے کی، کہیں سے ایک چڑیا پنجرے کے اندر کہیں سے گلہری۔ غرض مذکورہ بالا جالیوں کے اٹھارہ در ہیں جن سے ہلال کی اٹھارہ صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

اول درجہ سے دوئم درجے پر جانے کے لئے دو راستے ہیں۔ دوسرے درجے سے شہر کی آبادی —— پہاڑوں کا پر لطف نظارہ —— اور کھیتوں کے سبزہ زار عجیب نظر پرور مناظر پیش کرتے ہیں۔ طبیعت یہی چاہتی ہے کہ عمر کا تمام حصہ اسی پر فضا مقام میں بسر ہو یہاں سے تالاب کا پانی شیشے کا ایک . . . سطح میدان معلوم ہوتی

پہلوی اور فارسی قدیم

از جناب نذیر احمد خاں صاحب مرغوب ایم اے

سر ولیم جونز اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئے ہیں - وہ پہلے یوروپین ہیں جنہوں نے سنسکرت سیکھی - اس میں ان کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا - لیکن آنیوالی نسلوں کے لئے وہ ایک ایسا راستہ تیار کر گئے جس پر گامزن ہوکر مغرب والوں نے ایسی ایسی دقیق اور کارآمد باتیں دریافت کیں - جنہیں دیکھ کر مشرق والے انگشت بدنداں ہوگئے - سر ولیم جونز کا نظریہ تھا - کہ کوئی علم اللسان کا ماہر اسوقت تک سنسکرت پر قادر نہیں ہوسکتا جب تک یہ بات اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لے کہ سنسکرت اور مغربی زبانوں خصوصاً لاطینی اور یونانی میں ضرور کچھ تعلق ہو بلکہ اتنا قریبی تعلق جتنا کہ لاطینی اور یونانی الفاظ کے مادوں اور اسلوب بیان میں ہے - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کی مستند زبانوں کا تعلق سنسکرت سے کس طرح واضح کیا جاسکتا ہے - اس کا جواب سر ولیم موصوف نے یوں دیا - کہ یہ تینوں زبانیں اس انڈو یورپین زبان کی شاخیں ہیں جس کا وجود بدقسمتی سے اب ناپید ہوچکا ہے اس کا تاریخی ثبوت یہ ہے کہ وسط ایشیا کے لوگ جب زمانہ قدیم میں وہاں سے نکلے تو کچھ یورپ کی طرف جھکے کچھ فارس کی طرف، اور باقی ہندوستان میں اقامت گزین ہوگئے - اس طرح اگلی زبان نے بھی مختلف صورتیں اختیار کرلیں -

سنسکرت کے متعلق ایسی معلومات نے یورپ میں تہلکہ مچا دیا - بڑے بڑے فاضل ادیب اس میدان میں کود پڑے - اور سنسکرت سیکھنی شروع کردی یہ انیسویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے اور سر ولیم جونز کے اس خیال نے کہ سنسکرت سب زبانوں کی ماں ہے اور باقی زبانیں اسی سے ظہور میں آئی ہیں - لوگوں کے لئے ایک زبردست عقیدے کی شکل اختیار کرلی -

لیکن بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا -

اس قسم کی حیرت انگیز تحقیقات نے محققین کے دل بڑھا دیئے اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی تحقیق بھی شروع ہوگئی - کھوج نکالنے والوں نے آخر کھوج نکال ہی لیا - کہ موجودہ فارسی اور قدیم فارسی کا آپس میں کیا تعلق ہے - اور ژند - اوستا - پاژند اور پہلوی وغیرہ کونسی زبانیں ہیں ؟ زبان کی عمر کیا ہے ؟ ارتقا کیسے ہوئی ؟ اور بالآخر اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ؟

فردوسی شاہنامے میں لکھتا ہے - کہ فریدوں کے

چھوٹے لڑکے کا نام ایرج تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کے ملک کا نام (جو فریدون نے اسے دیا) ایران پڑ گیا لیکن تاریخی لحاظ سے ایران وہ سرزمین ہے۔ جس کو ایرین نے اپنا وطن بنایا۔ (ایران یا ایری آنا ایک ہی چیز ہے) اسی خطے کی زبان کا نام "فارسی" ہے۔ ہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ایران کی زبان بجائے ایرانی ہونے کے فارسی کیوں ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارس ایران کے ایک صوبے کا نام ہے۔ جہاں سے ایک ایسا زبردست خاندان ۵۵۰ برس قبل از مسیح پیدا ہوا۔ جس کی حکومت ایران کے طول و عرض پر تھی اس کی زبان اس کے وطن کی زبان تھی۔ حکومت کے بل بوتے پر زبان کو بھی غلبہ حاصل ہوا۔ اور تمام اضلاع کی زبان فارسی ہو گئی۔ اس خاندان کو سکندر نے ۳۳۰ سال قبل از مسیح نیست و نابود کر دیا۔

فارسی قدیم

یوروپین علما و فضلا اسی عہد کی زبان کو فارسی قدیم کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ پرسیپوس سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ فارسی قدیم کا پتا دیتے ہیں۔ فارسی قدیم کی کل کائنات ۴۰۰ الفاظ ہے۔ اس کی ابجد اور حروف خط میخی ہیں۔

وہ کتبے اب معلوم ہو چکے ہیں اور ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

سکندر کی فتح پر اس زبان یعنی فارسی قدیم کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ۵۵۰ سال قبل از مسیح سے لے کر ۳۳۰ سال قبل از مسیح تک جو زبان رائج رہی۔ فارسی قدیم تھی۔

اسکندر سے ۵۰۰ سال بعد تک کچھ پتا نہیں جاتا کہ زبان کا کیا حال ہوا۔ اور کون کونسی پراکرتیں رائج ہوئی اس عرصہ دراز میں ایران کا علم و ادب بالکل پردہ خفا میں رہا۔ اس کے بعد ۲۲۶ء میں ساسانی خاندان برسر اقتدار ہوا۔ اسوقت یونانی درباری زبان تھی اور اس کے ذریعے سے خط و کتابت ہوا کرتی تھی لیکن ملک میں مختلف پراکرتیں موجود تھیں۔ یہ زمانہ پارتھین عہد کہلاتا ہے۔

ساسانیوں کی حکومت ۴۰۰ سال تک رہی۔

ساسان (ساسانی خاندان کا بانی) نے ایک قسم کی قومی سلطنت کی بنیاد ڈالی ہے۔ عربوں نے ۶۵۰ء میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اسلام کا بے پناہ سیلاب حکومت کے ساتھ اس کی زبان کو بھی بہا لے گیا۔

پہلوی

ساسانی خاندان کے عہد میں جو زبان ۴۰۰ سال تک رائج رہی۔ پہلوی زبان کہلاتی ہے۔ اور یہی مغربی علما کی تحقیق ہے۔

مولانا رومؒ اور خواجہ حافظؒ کے دو اشعار اس نظریے کی تائید کرتے ہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

مثنویٔ مولویٔ معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

یہاں "پہلوی" عبرا اور شستہ زبان کے معنوں میں آیا ہے۔

خواجہ حافظ ؎

بلبل ز شاخ سرو بگلبانگ پہلوی
مے خواند دوش درس مقامات معنوی

یہاں لفظ پہلوی کے معنے "نہایت نفیس" اور


TOMB OF





تاج محل کا ایک دلفریب نظارہ

توچار زبان ٹکے ہیں۔

جہاں تک علما کی تحقیق ہے۔ پہلوی کا مادہ پرتھوی ہے۔ یعنی پارتھیا والوں کی زبان یوروپین علماً اس کو مڈل پرشین یعنی عہد متوسط کی زبان بھی کہتے ہیں؛

ساسانی عہد کے ختم ہونے پر زبان کے دوسرے دور کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور تیسرا دور شروع ہوا

تیسرا دور

زبان فارسی کے تیسرے دور کا آغاز اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ موجودہ فارسی یعنی آجکل کی زبان جو لکھی اور بولی جاتی ہے اسلام کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔

اگر موجودہ فارسی میں سے عربی آمیزش دور کردی جائے تو باقی پہلوی رہ جائیگی۔ لیکن پہلوی کی کتابت گورکھ دھندے سے کم نہیں۔

دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کو لکھا کسی اور طریق سے جائے اور پڑھا کسی اور سے۔ لیکن پہلوی میں یہ حیرت انگیز تفاوت موجود ہے مثال کے طور پر اگر ہم لحما لکھیں تو پڑھتے وقت "نان" پڑھیں گے۔ اور اگر یکتبونتن لکھیں گے تو "نوشتن" پڑھیں گے۔ علیٰ ہذالقیاس

اس تبدیلی کو ہزوارش طریق کہتے ہیں۔

ہزوارش کا مادہ "زور" ہے یعنی دھوکا (تزویر کے بھی یہی معنے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پڑھنے میں عجیب دھوکا لگتا ہے۔ اسکی مثال بعینہ ایسی ہے کہ کوئی شخص انگریزی کا خط کسی ناخواندہ کے سامنے پڑھ کر اس کو سنا رہا ہو۔ اور انگریزی میں سنانے کی بجائے اس کا ترجمہ مروجہ زبان میں سناوے پہلوی لٹریچر کافی ضخیم ہے اور اس میں کم و بیش . . . . . ہم الفاظ موجود ہیں۔

امریکہ اور گمشدگی

از جناب سید شفقت حسین صاحب شفقت عباسی بی اے

نیو یارک صوبجات متحدہ امریکہ کا دار الخلافہ ہے۔ یہ شہر نہایت عظیم الشان اور عجوبہ روزگار ہے اسکی سر بفلک عمارتیں۔ شیشے کی طرح چمکتی ہوئی سڑکیں، موجودہ سائنس کی نو ایجادات کا صحیح اور فراداں استعمال، موٹر کاروں اور پیدل چلنے والوں کی چہل پہل۔ ہوٹلوں میں مسافروں اور سیاحوں کا جم غفیر۔ شوقین مزاجوں اور بانکوں کا اٹھلاتے ہوئے چلنا۔ عورتوں کا رنگ رنگ کے شوخ اور فیشن ایبل کپڑے پہن کر تتیریوں کی طرح لہراتے پھرنا ایک اجنبی کو محو حیرت بنا دیتا ہے۔ بادی النظر میں اس شہر کی رونق اور لوگوں کی خوشحالی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے اور ایک اجنبی کو کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس گلشنِ نشاط میں کوئی غم دیدہ بھی ہو سکتا ہے آج ہم ناظرین کو اس دلاویز اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہیں۔

نیویارک کے صدر پولیس ہیڈکواٹر میں ہر روز سینکڑوں بچوں، مردوں، اور عورتوں کی گمشدگی کی اطلاعات پہنچتی رہتی ہیں۔ گم ہونے والوں کی تعداد اسقدر بڑھ چکی ہے کہ حکومت کو اس کے متعلق ایک علیحدہ محکمہ قائم کرنا پڑا جس کا نام "Bureau for recovery of lost persons" یعنی محکمہ بازیافتنِ گمشدگان ہے۔ یہ گم ہونے والے کیونکر گم ہوتے ہیں؟ گم ہو کر کہاں جاتے ہیں؟ اور انہیں کس طرح ڈھونڈا جاتا ہے؟

گمشدہ کی تلاش

جب کوئی شخص گھر سے غائب ہو جاتا ہے تو اس کا کوئی نزدیکی رشتہ دار محکمہ گمشدگان ... Missing Bureau میں اطلاع دیتا ہے۔ محکمے کا افسر اعلیٰ گمشدہ شخص کا مکمل حلیہ رجسٹر میں درج کر لیتا ہے۔ مثلاً گمشدہ کی عمر۔ قد۔ جسامت۔ مونچھیں (اگر ہوں) آنکھوں کا رنگ۔ لباس، بالوں کا رنگ اور طرز۔ کس جگہ سے غائب ہوا۔ اس کی طبیعت اور عادات وغیرہ وغیرہ۔ وہ افسر اس حلیے کا مقابلہ ان لوگوں کے حلیے کے ساتھ کرتا ہے جنکی بازیافتگی کی رپورٹ روزانہ مختلف پولیس افسر محکمہ میں بھیجتے

اس مضمون کا ماخذ کتاب موسومہ Detectives of Europe & America ..... کا دیباچہ ہے

رہتے ہیں۔ اگر اس گمشدہ شخص کا حلیہ مل جائے تو اس خوشخبری کی اطلاع اس کے رشتہ داروں کو بذریعہ تار دی جاتی ہو اگر اس طریق سے اس شخص کا پتہ نہ چلے تو اس شخص کے متعلق چھ سو یا سات سَو کے قریب کارڈ چھپوا کر پولیس کے تمام دفاتر میں جو شہر کے مختلف حصص میں اسی مطلب کیلئے قائم کئے گئے ہیں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اور پولیس افسروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس شخص کو پوری کوشش کے ساتھ تلاش کریں۔ اس نوع کے چند ایک کارڈوں کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

گمشدہ

جان۔ ایف۔ میکارمیک، گم ہونے سے پہلے ۱۳ نومبر بروز پیر۔ آخری مرتبہ "یانکی" جہاز پر دیکھا گیا عمر ۲۴ سال۔ آنکھیں اور بال سیاہ۔ قد پانچ فٹ چار انچ۔ موٹے موٹے ابرو۔ خاکی رنگ کا ڈھیلا سا کوٹ۔ سیاہ پتلون۔ سیاہ چپٹی ٹوپی پہنے رہتا تھا۔ جس شخص کو اس کا پتہ معلوم ہو یا اس کو مندرجہ بالا تاریخ کے بعد دیکھا ہو تو وہ شخص گمشدہ کے چچا رابرٹ میکارمیک نمبر ۱۲ ٹالمان اسٹریٹ بروکلن کو یا انسپکٹر ڈلکس۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز۔ نمبر ۳۰۰ ملبری اسٹریٹ کو مطلع کرے۔

مورخہ . . . . . .

گمشدہ

اینی ہرن اپنے گھر سے گذشتہ پیر کے روز سے غائب ہے۔ اسکی عمر دس سال ہے۔ شربتی آنکھیں۔ سیاہ بال چھوٹے چھوٹے۔ زخم کا ایک چھوٹا سا داغ بائیں کنپٹی پر۔ سیاہ الپاکا فراک۔ سیاہ اونی جرابیں۔ سیاہ مخملین ٹوپی۔ اونچی ایڑی کی گرگابی پہنے ہوئے تھی۔ گمشدہ کے متعلق کسی قسم کی اطلاع رچرڈ بریک۔ نمبر ۲۱۴۔ میڈیسن اسٹریٹ یا انسپکٹر ڈلکس نمبر ۳۰۰ ملبری اسٹریٹ کو پہنچائی جائے۔

مورخہ . . . . . .

پچیس ڈالر اس شخص کو انعام دیئے جائینگے

جو ایسی اطلاع بہم پہنچائے جس سے نیری ایٹا واس عمر ۱۶ سال ڈھونڈی یا گرفتار کی جاسکے۔ ہڈسن کونٹی۔ نیوجرسی سے مورخہ ۲۱ جولائی بروز بدھ تقریباً صبح سات بجے نکلی۔ اس کا حلیہ حسب ذیل ہے:

دراز قد۔ پتلا جسم۔ تھوڑی سی خمیدہ۔ بھورے بال۔ نیلی آنکھیں۔ زرد پتلا اور لمبا چہرہ۔ مکمل سیاہ لباس میں ملبوس۔

مندرجہ بالا انعام کے ساتھ اس کے باپ کا شکریہ بھی شامل ہوگا جو اپنی لڑکی کو بچانا چاہتا ہے

مورخہ . . . . . .

لوگ کیسے اور کہاں غائب ہوتے ہیں

گمشدہ بچے | سینکڑوں بچوں کی گمشدگی ان کی ماؤں اور ماماؤں کی بے احتیاطی اور بے پرواہی پر منتج ہے۔ عورتیں اپنے بچوں کو لے کر بازاروں میں نکلتی ہیں اور کارڈ یا ادھر ادھر کی گفتگو میں اسقدر محو ہو جاتی ہیں کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ان کا ننھا بچہ کب ان سے بچھڑ گیا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک ننھا بچہ جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں اور آنکھیں روتے روتے سرخ اور متورم ہوگئی ہیں نظر پڑتا ہے۔ کبھی تو اس کے ننھے سے ہاتھ میں

مصری کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ کبھی روٹی یا مکھن یا سیب وغیرہ کا۔ پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا ہے۔ یہ بچے اکثر اپنے والدین تک پہنچ جاتے ہیں بشرطیکہ اس گمشدگی میں بدمعاشوں کا ہاتھ نہ ہو۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے اولاد لوگ بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور خود ان کی پرورش کرتے ہیں یا دوسرے بے اولاد لوگوں کے لئے لے جاتے ہیں۔ اور آج کل تو ایسے بچوں کے پالنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ اس لئے بچوں کی زندگیاں عموماً خطرہ میں رہتی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً ایک ہزار بچے اکیلے اسی شہر سے غائب ہوتے ہیں۔ لیکن عموماً تمام کے تمام واپس مل بھی جاتے ہیں۔

پوشیدہ جگہیں

اگر اس شہر کی ہزاروں پوشیدہ اور خفیہ جگہوں کو آشکارا کیا جائے تو بیشمار گمشدہ مردوں، اور عورتوں کے گلے سڑے ہوئے جسم دستیاب ہونگے اور بہتوں کی ہڈیاں پڑی ہوئی نظر آئینگی —— یہ لاشیں کہاں سے آتی ہیں؟ علاوہ ازیں آئے دن پھولی اور گلی سڑی ہوئی لاشیں۔ دریائے ہڈسن میں سے دریائی پولیس پکڑتی ہے۔ یہ مردے کہاں سے آتے ہیں؟

اس عظیم الشان گناہگار شہر میں جو لوگ اردگرد کے دیہاتوں سے آتے ہیں یا وہ پردیسی جو سیر کا جنون لے کر آتے ہیں۔ یہاں کی چہل پہل دیکھ کر مسحور ہو جاتے ہیں۔ شوخ رنگ اور دلآویز لباسوں میں ملبوس۔ حسین وجمیل نوجوان لڑکیاں جو درحقیقت عصمت فروشی اور گناہگاری کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر چکی ہوتی ہیں۔ ان پردیسیوں کے لئے عیش ومسرت کا خزینہ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی پاسبان عقل کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو چار مسرت انگیز گھڑیاں گزارتے ہی شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی جان شیریں کھو بیٹھتے ہیں اور ان کا تمام زرونقد بدمعاشوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے صبح ہونے تک یا تو ان کی لاشیں دریائے ہڈسن میں سے دریائی پولیس نکالتی ہے یا صفحہ ہستی سے غائبانہ طور پر مٹا دیئے جاتے ہیں۔

خوف نمود صبح

گمشدگی کے کئی واقعات تمثیلاً پیش کئے جا سکتے ہیں

ایک نوجوان رئیس زادہ جس نے پہلے نیویارک کبھی نہیں دیکھا سیر وتفریح کے لئے یہاں آتا ہے۔ ایک فیشن ایبل ہوٹل میں ٹھیرتا ہے شام کے وقت امنگوں بھرا نوجوان دل پہلو میں لئے عشق ومحبت کے راز ہائے سربستہ سے واقف ہونے کی نیت سے باہر نکلتا ہے۔ دیہاتی سادہ لوحی کے سبب اس کے دماغ میں یہ سمائی ہوتی ہے کہ نیویارک میں جونہی کسی نوجوان اور خوشرو امیرزادی سے دوچار ہونگا تو وہ میرے دیہاتی حسن اور نوجوانی پر عاشق ہو جائیگی اور فوراً میری طرف سے شادی کا پیغام قبول کر لیگی۔ وہ بازاروں اور سینماؤں کی سیر کرتا ہوا جب رات کے بارہ بجے اپنے ہوٹل کو لوٹتا ہے تو اسکی توجہ بے اختیار ایک حسین وجمیل اور دلفریب شاہد رعنا کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ جو ایک خاص انداز سے اسکے آگے آگے خراماں خراماں چلی جا رہی ہوتی ہے جب یہ اس کی طرف دیکھتا ہے وہ اسے ایک خاص انداز میں اشارہ کرتی ہے۔ جس کا مطلب سمجھنے میں کبھی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس شہر کی خاندانی اور شریف عورتوں

گو اسقدر بیباک اور آزاد دیکھ کر متحیر تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی مُرغِ دل کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اور والہانہ انداز سے اسکے ساتھ ہولیتا ہے۔ حتے کہ وہ اس کی نشاۃگاہ میں پہنچ جاتا ہے . . . . . . آدھی رات کو یکدم اس کی آنکھ کھلتی ہے کیا دیکھتا ہے کہ وہی حسین قتالہ اس کے گلے سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کا ایک آشنا خنجر کو سنبھال رہا ہے۔ چشم زدن میں وہ خنجر اس کے سینہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اسطرح اس کے تعشق کا خاتمہ ہوتا ہے . . . . . . اس کے بعد کوئی شخص رات کے اندھیرے میں ایک بند صندوق کو دریائے ہڈسن میں ڈال جاتا ہے . . . . . . تین چار روز کے بعد ایک اور لاش دریائی پولیس کے ہاتھ آتی ہے لیکن اس کی جیبوں میں نہ نقدی ہوتی ہے نہ سونے کی گھڑی اور نہ نوٹ بک۔

خواری شرمندگی اور موت

گمشدگی کی ایک اور مثال | ایک خوبصورت لڑکی ساونڈ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوتی ہے معصومیت اور عصمت شعاری کی فضا میں پرورش پاتی ہے۔ حتٰے کہ سترہ سال کی ہو جاتی ہے کبھی اس نے اپنے دل میں محبت کی ٹیس محسوس نہیں کی۔ اس کی دنیا میں خواہشاتِ نفسانی کو دخل نہیں۔ وہ صبح صادق کی طرح حسین ہے سترہ سال کی عمر میں وہ نیویارک دیکھنے کے لئے پہلی بار آتی ہے۔ اس شہر کے تھیٹر۔ ناچ گھر اور سنٹرل پارک اس کی آنکھیں خیرہ کر دیتے ہیں۔ براڈوے اس کے دماغ کو ہر ہم برہم اور خود اسے مخمور بنا دیتا ہے . . . . . لیکن اوپیرا اس کی خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ کیونکہ ہر رات ایک نوجوان جو حسین بھی ہے اور حاضر جواب بھی۔ اسے وہاں لے جاتا ہے۔ وہ اپنے دل میں پہلی بار خلش سی محسوس کرتی ہے —— وہ ابھی تک معصوم ہے۔ یہ ایک رات وہ دونوں سیر و تفریح کے واسطے باہر نکلتے ہیں اور ہارسم لین کے ایک بظاہر فیشن ایبل ہوٹل میں ٹھیرتے ہیں اس معصوم لڑکی کو شمپین کا ایک گلاس پینے کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ آخرکار تمام کی تمام بوتل اُسے پلا دی جاتی ہے . . . . . . اس رات دنیا اس سے چھین لی جاتی ہے۔ اس کا سرمایہ عصمت لٹ لیا جاتا ہے . . . . . . وہ ایک آبرو باختہ عورت کی حیثیت میں اپنے گھر کو لوٹتی ہے . . . . وہاں سے وہ اپنی ندامت چھپانے کے لئے واپس نیویارک جاتی ہے لیکن اس کی زندگی تباہ کرنے والا معلوم نہیں کہاں چلا جاتا ہے۔ وہ دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ اب اس کی اصل کشمکش حیات کا آغاز ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ درزیوں کا کام کرتی ہے اور کبھی کسی دکان پر کلرکی کرتی ہے۔ آخرکار اس کا گناہ ایک بچے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک رات وہ بھوک سے بیتاب، خوار و خستہ اور ناامید ہو کر گھر سے نکلتی ہے اور دریا کا راستہ لیتی ہے اور اپنی مصیبتوں کو آب دریا کے سپرد کر دیتی ہے۔ کئی دونوں تک وہ غائب رہتی ہے . . . . . آخر جب اس کی لاش دریائی پولیس برآمد کرتی ہے تو اس کا حسین چہرہ کیکڑوں اور مچھلیوں کی خوراک ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی شناخت نہیں ہوسکتی۔ اس طرح گمشدہ اشخاص کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

متفرق

علاوہ ازیں کئی نوجوان لڑکیاں جو نیویارک کے اردگرد کے شہروں میں رہتی ہیں۔ اپنے گھروں سے غائب

ہو کر نیو یارک کے قحبہ خانوں میں اتر آتی ہیں۔ وہاں انہیں اعلیٰ لباس، عمدہ غذائیں، عیش و مسرت کی گھڑیاں، شاہین اور عشاق میسر آتے ہیں۔ یہ سہولتیں اور عیش و عشرت کے ساز و سامان انہیں اپنے گھروں میں رہ کر کبھی بھی نہیں مل سکتے۔ وہ اپنے گھروں کو شہوانی جذبات سے مغلوب ہو کر خیرباد کہہ دیتی ہیں جو تلاش کے بعد انہیں قحبہ خانوں سے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان قحبہ خانوں کو اپنے والدین اور گھروں پر ترجیح دیتی ہیں

ایسے مرد اور عورتیں بھی ہیں جو اپنے ازدواجی تعلقات سے تنگ آ کر یا کسی اور بنا پر آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دوسرے کو تنگ کرنے کی نیت سے غائب ہو جاتے ہیں اور برسوں غائب رہ کر ناجائز تعلقات میں پھنس جاتے ہیں۔

اس شہر میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے رسوائے عالم گھروں کی ہے جہاں کھلے بندوں اسقاط حمل کیا جاتا ہے اور ہر روز سینکڑوں معصوم بچوں کا خون ان کی گناہگار ماؤں کی ندامت چھپانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ کتنی امیر اور مہذب لڑکیاں ان بوچڑ خانوں میں پائی جاتی ہیں؛ وہ اپنی کوتہ اندیشی اور بے عزتی کے ثبوت کو چھپانے کے لئے روپوش ہوئی بیٹھی ہیں کہ اگر دنیا کو اس کا علم ہو جائے تو ان کے والدین یا نزدیکی رشتہ داروں کی اعلیٰ سوشل پوزیشن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس طرح کھلے بندوں قتل و خون کا بازار گرم رہتا ہے۔ لیکن انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس طرح وہ ہفتوں اپنے گھروں سے غائب رہتی ہیں۔

شفقت عباسی بی اے

بدیسی پیا والی کی عید

(۱)
ہر اک سو سُن رہی ہوں — آئی ہے عیدِ رمضاں
کیا کیا منا رہے ہیں — دُنیا کے لوگ خوشیاں
صحنِ چمن کے غنچے — سارے ہیں آج خنداں
اشجار جھومتے ہیں — اور بلبلیں ہیں رقصاں
لیکن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

(۲)
میری سہیلیاں سب — خوشیاں منا رہی ہیں
کچھ مسکرا رہی ہیں — کچھ کھلکھلا رہی ہیں
ہمجولیوں سے مل کر — جھولے جھلا رہی ہیں
میٹھی سُروں میں نغمے — اُلفت کے گا رہی ہیں
لیکن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

(۳)
رہ رہ کے اُٹھ رہی ہے — اک ٹیس سی جگر میں
کانٹوں کا بن ہے سارا — گلشن مری نظر میں
کیا خوش نصیب ہیں وہ — جن کے پیا ہیں گھر میں
برہ میں پیا ہے اُن کی — وہ ہیں پیا کی برہ میں
لیکن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

(۴)
ہوتے جو وہ بھی گھر میں — میری بھی عید ہوتی
پھر لطفِ عید ہوتا — گر اُن کی دید ہوتی
آپس میں پیار کی کچھ — گفت و شنید ہوتی
یہ صبحِ عید میری — پھر رشکِ عید ہوتی
لیکن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

(۵)
اب تو ہلال مجھکو — خنجر سے کم نہیں ہے
سُونی ہے میری دُنیا — بزم میں صنم نہیں ہے
میں ہوں کہیں - کہیں وہ — کیا یہ ستم نہیں ہے
دل میں کسی بشر کے — اُف آج غم نہیں ہے
لیکن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

(۶)
اے صبحِ عید کس دن — آئے گا شام میرا
اُسکے بغیر ہے اب — جینا حرام میرا
اے ماہِ عید کہنا — اُس کو سلام میرا
پھر ہاتھ باندھ کر یہ — دینا پیام میرا
"تجھ بن اُداس ہوں میں"
"تصویرِ یاس ہوں میں"

(۷)
گنتی رہوں میں کب تک — فرقت میں شب کو تارے
آئے گا تو کسی دن — جیتی ہوں اس سہارے
دل میں پل رہے ہیں — ارمان دل کے سارے
"پردیس چھوڑ آ جا — اپنے وطن کو پیارے"
تجھ بن اُداس ہوں میں
تصویرِ یاس ہوں میں

اختر زیدی اعظمی

حورِ بیاباں

حضرت احسان بن دانش

اے ہمنشیں بتاؤں تجھے کیا کہ رات بھر
آتے رہے وہ یاد کسکتا رہا جگر

جب ہو چکا عروجِ شبِ تار کامیاب
بکھری ضو جلوۂ ہنگامِ آفتاب

میں اُٹھ کے گھر سے جانبِ صحرا ہوا رواں
ترتیب دے رہا تھا تخیل کو آسماں

مغرب کی وادیوں پہ قمر تھا جھکا ہوا
لہرا رہا تھا رات کا دریا رُکا ہوا

چمکا رہا تھا چشمِ ضیا ریزہ دلنشیں
گردوں پہ کوئی کوئی ستارہ کہیں کہیں

سنولا چلے تھے رات کے تاریک بام و در
شب کی سیاہیوں میں ضیا بار تھی سحر

گرما رہے تھے روح کو جھونکے نسیم کے
چشمے اُبل رہے تھے فضا میں شمیم کے

پھولوں میں دلکشی تھی تو کانٹوں میں شان تھی
نورستہ کونپلوں کی لچک پر زمیں جان تھی

قرباں تھی زیست موت کی گہری مٹھاس پر
شبنم اُتر رہی تھی فضاؤں سے گھاس پر

حسنِ خیال فکرِ دو عالم سے دور تھا
آنکھوں میں نور دل کی رگوں میں سرور تھا

دوڑی ہوئی تھیں نشوں کی لہریں دماغ میں
میں محو ہو رہا تھا کسی کے سراغ میں

مشرق میں ضو فروش تھے آثارِ آفتاب
ڈھلکے حریرِ سرخ کا باریک سا نقاب

ذرے تھے غرقِ جلوۂ عالم پناہ میں
سجدے اُمڈ رہے تھے جبینِ نگاہ میں

(۲)

رستے کے پاس نہر کے ساحل سے ذرا پرے
اک نازنیں کھڑی تھی کناری پہ کھیت کے

رخسار میں امانتِ فردوس آرزو
خورشید کی خمیدہ شعاعوں سے دوبدو

عارض پہ عکسِ موجِ تبسم کی سرخیاں
سوزِ نظر میں جذبۂ عصمت کی گرمیاں

گیسو تھے یا اداؤں نے کھولے ہوئے تھے پر
اک برقِ دل شناس تھی دامن کشِ نظر

خطِ جبیں کو جادۂ آبِ بقا کہوں
بندہ کہوں کہ بندۂ مولا نما کہوں

سوئے زمیں تھے دیدۂ میگوں جھکے ہوئے
سیال میکدے تھے فضا میں رکے ہوئے

تھا اک سکوتِ محشرِ حسن و جمال میں
ڈوبی ہوئی تھی وہ کسی گہرے خیال میں

دامن میں برقِ طور کو فن کر کا بیم تھا
صحرا میں ابتدا نسیم و شمیم تھا

اُٹھی مری طرف جو وہ کھوئی ہوئی نظر
جھجکی جھجک کے آہ بھری اور چشمِ تر

چل دی جگر میں غم کے شرارے لئے ہوئے
پلکوں پہ بے قرار ستارے لئے ہوئے

میری نظر سے گر گئی تابانیٔ نمو
موجِ شراب، نور رگوں میں بنا لہو۔

بجلی چمک کے گئی دلِ حیرت اساس میں
بھر آئے اشک دیدۂ حسرت شناس میں

مشاہیر عالم! دورِ قدیم

جناب مولانا محمود بریلوی

نوٹ: "مشاہیر عالم" کے سلسلہ میں حالات و سوانح عمریاں جسقدر بے ترتیبی سے درج ہو رہے ہیں۔ مجھے انکا احساس ہے مگر موجودہ صورت میں میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کہ دو ادوار قدیم و جدید قائم کردوں اور تختی و حروف تہجی کی قید اُٹھا کر عہد عتیق کے مشاہیر کا تذکرہ دور قدیم میں اور زمانہ حال کے مشاہیر کا بیان دور جدید میں کروں۔ کیونکہ اس کے لئے سخت محنت و پابندی کی حاجت تھی اور کام نیا، مشکل اور وقت طلب ہو جاتا جس کی مجھے فی الحال مہلت نہیں۔ ناظرین معاف فرمائینگے۔ اس بے ربطگی و بے ترتیبی کی تلافی کے لئے میں کوشش کرونگا کہ حالات گو مجمل ہوں مگر مکمل، پر از معلومات اور دلچسپ ہوں۔ انشاءاللہ ناظرین دورِ جدید سے بہت زیادہ محظوظ ہونگے۔ (محمود بریلوی)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہ کی کنیت ام ہند اور لقب طاہرہ تھا۔ آپ کے والد کا نام خویلد اور والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ چوتھی پشت پر یعنی قصی پر پہنچکر حضرت خدیجہؓ کا خاندان رسول اکرمؐ کے خاندان سے ملجاتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی پیدائش مکہ میں عام الفیل سے ۱۵ سال قبل ہوئی آپ کی نسبت پہلے ورقہ بن نوفل سے ہوئی تھی مگر نکاح ابو ہالہ ابن نباش تمیمی سے ہوا۔ ابو ہالہ کے بعد آپ کی شادی عتیق بن عابد مخزومی سے ہوئی۔ باپ اور شوہر کی وفات کے بعد آپکو سخت تکالیف کا سامنا ہوا تجارت کا نگران کوئی نہ تھا۔ اس زمانہ میں رسول اکرمؐ کی شہرت "امین" کے لقب کے ساتھ تمام مکہ میں تھی اور آپکی راستبازی اور حسن اخلاق کا عام چرچا تھا چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے رسول اکرمؐ کو بلاکر اپنا مال تجارت ان کو سونپا اور دیگر عام لوگوں کی نسبت آنحضرتؐ کو دوگنا معاوضہ دینے کا وعدہ کر کے ملک شام کو روانہ کیا۔ اُس سال حضرت خدیجہؓ کو دوگنا فائدہ ہوا۔

حضرت خدیجہؓ کی دولت اور شرافت کے باعث مکہ کا ہر عالی نسب ان سے شادی کا متمنی تھا مگر قرعۂ فال رسول اکرمؐ پر پڑا۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے رسول اکرمؐ کو شادی کا پیغام بھیجا

جسے آنحضرتؐ نے قبول کیا۔ ابوطالب نے نکاح پڑھایا اور ۵۰۰ طلائی درہم مہر قرار پایا۔ اسوقت آنحضرتؐ کی عمر ۲۵ سال کی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ یہ بعثت نبوت سے ۱۵ سال قبل کا واقعہ ہے ——

جب آنحضرتؐ نے دعویٰ نبوت کیا تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ مسلمان ہوئیں۔ حضرت خدیجہؓ نے محض نبوت کی تصدیق ہی نہیں کی بلکہ ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلعم کی بہت بڑی معاون تھیں۔ جب کفار مکہ آنحضرتؐ کو انواع و اقسام کی تکالیف پہنچاتے تھے تو حضرت خدیجہؓ ہی آپکی تسلی و تشفی کیا کرتی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ نکاح کے بعد ۲۵ برس تک زندہ رہیں اور ۱۱ رمضان سنہ ۱۰ نبوی کو ہجرت سے تین سال قبل انتقال فرمایا اُسوقت اُن کی عمر ۶۴ سال ۶ ماہ کی تھی ——!

حضرت خدیجہؓ کے ابوہالہ سے (پہلے شوہر سے) دو لڑکے ہالہ اور ہند پیدا ہوئے۔ عتیق (دوسرے شوہر) سے ہند نامی ایک لڑکی پیدا ہوئی —— اور آنحضرت صلعم سے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔

۱۔ حضرت قاسمؓ آنحضرتؐ کے سب سے بڑے لڑکے تھے جنکا صغر سنی ہی میں مکہ میں انتقال ہوا۔
۲۔ حضرت زینبؓ آنحضرت کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔
۳۔ حضرت عبداللہؓ نے بہت کم عمر پائی۔
۴۔ حضرت رقیہؓ
۵۔ حضرت ام کلثومؓ
۶۔ حضرت فاطمہ زہراؓ

یہ سب اولادیں ایک ایک سال چھوٹی بڑی تھیں ——! آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی اور حضرت ابراہیمؓ کے سوا آنحضرتؐ کی تمام اولادیں اُنہیں سے ہوئیں ——!

حضرت سودہؓ

حضرت سودہؓ قریش کے ایک نامور قبیلہ عامر بن لوی سے تھیں آپ کے والد کا نام زمعہ اور ماں کا نام شموس تھا جو مدینہ کے خاندان بنو نجار سے تھیں۔ حضرت سودہؓ کا نکاح پہلے سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ حضرت سودہؓ اور اُن کے شوہر آغاز اسلام ہی میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کے باعث وہ اور ان کے خاوند دیگر مظلوم مہاجرین کے ساتھ ملک حبشہ کو چلے گئے تھے جہاں سے چند سال کے بعد وہ پھر واپس مکہ کو آئے اور کچھ دن کے بعد اُن کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے حضرت سودہؓ آنحضرت کے عقد نکاح میں آئیں حضرت سودہؓ کا نکاح آنحضرتؐ کے ساتھ ماہ رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں ہوا اور ۴۰۰ درہم مہر قرار پایا۔ حضرت سودہؓ کا انتقال سنہ ۲۲ھ میں ہوا۔ آنحضرت سے ان کے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی البتہ پہلے خاوند (حضرت سکران) سے عبدالرحمان نامی ایک لڑکا تھا جو ایران کی جنگ جلولا میں شہید ہوا ——! ازواج مطہرات میں حضرت سودہؓ سے زیادہ فربہ اندام و بلند و بالا کوئی نہ تھا۔ اطاعت و فرمانبرداری میں وہ سب ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔ نہایت فیاض و مخیر تھیں۔ وہ اور حضرت عائشہؓ آگے پیچھے آنحضرتؐ کے نکاح میں آئی تھیں۔ مزاج کی تیز تھیں مگر ظریف الطبع بھی تھیں ——!

حضرت عائشہؓ

حضرت عائشہؓ کا لقب صدیقہ اور حمیرا اور کنیت اُم عبداللہ

تھی۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں اور ماں کا نام زینب تھا جو قبیلہ غنم بن مالک سے تعلق رکھتی تھیں۔!

حضرت عائشہؓ بعثت نبوت کے چار سال بعد شوال کے مہینہ میں پیدا ہوئیں۔ بعض حضرت عائشہؓ ہی رسول اکرم کی کنواری بیوی تھیں ——!

آنحضرتؐ سے پیشتر وہ جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب ہوئیں مگر جب جبیر نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اُن کے باعث اُس کے گھر میں اسلام کے قدم آجاتے تو پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُن کا عقد آنحضرتؐ سے پانسو درہم مہر مقرر کرکے کر دیا۔ یہ سنہ نبوی کا واقعہ ہے اور اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور "الکمال فی اسماء الرجال" کے مطابق اُس وقت اُن کی عمر نو سال کی تھی اور جب وہ کاشانہ نبوت میں داخل ہوئیں تو سترہ سال کی تھی۔ نکاح مکہ میں ہوا تھا اور رخصتی تین سال کے بعد مدینہ میں ہوئی۔ غزوات میں سے آپ بعض غزوۂ احد میں شامل ہوئیں اور زخمیوں کی تیمارداری کے فرائض انجام دیئے ——! غزوۂ مصطلق موقوعہ ۵ھ سے واپسی کے وقت حضرت عائشہؓ کے گلے کا ہار گر جانے کے باعث تیمم کی آیت نازل ہوئی اور منافقین نے اُن پر جو تہمت لگائی تھی اُس کی وجہ سے قرآن شریف کی وہ آیت نازل ہوئی جس سے حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کی تصدیق ہوئی۔ ماہ ربیع الاول ۱۱ھ میں آنحضرت صلعم نے وفات پائی اور تیرہ روز علیل رہے جن میں سے آٹھ دن حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں قیام فرمایا۔ وفات شریف سے ذرا پہلے حضرت عائشہؓ نے آنحضرت کی مسواک اپنے دانتوں سے نرم کی جس سے پھر آنحضرت نے اپنے دانت صاف کئے حضرت عائشہؓ کی ہی گود میں آنحضرتؐ کا انتقال ہوا اور حضرت عائشہؓ کے ہی حجرہ میں دفن ہوئے۔!

چونکہ ازواج مطہرات کے لئے خدا نے دوسری شادی ممنوع قرار دی تھی لہذا آنحضرت کے بعد حضرت عائشہؓ نے ۴۸ سال بیوگی کی حالت میں گذارے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے دو سال کے بعد ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ بیس سال کی عمر میں یتیم بھی ہو گئیں ——! حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے دیگر ازواج مطہرات کا دس دس ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا مگر حضرت عائشہؓ کا بارہ ہزار مقرر کیا۔ حضرت عثمانؓ کے واقعہ شہادت کے وقت حضرت عائشہؓ مکہ میں مقیم تھیں۔ جب طلحہؓ اور زبیرؓ نے مدینہ سے جا کر حالات بیان کئے تو حضرت عائشہ بصرہ گئیں اور وہاں مشہور جنگ جمل پیش آئی۔ یہ جنگ اتفاقی طور سے ہوئی اور حضرت عائشہؓ کو اپنی اس غلطی کا ہمیشہ افسوس رہا حضرت علیؓ کے بعد حضرت عائشہؓ اٹھارہ برس تک زندہ رہیں ——! امیر معاویہؓ کے آخری زمانۂ خلافت میں ماہ رمضان ۵۸ھ میں حضرت عائشہؓ نے وفات پائی اس وقت ان کی عمر ۶۷ برس کی تھی۔ اور وصیت کے موافق جنت البقیع میں دفن ہوئیں ——!

حضرت عائشہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ان کی کنیت ام عبداللہ اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کی وجہ سے تھی جن کو انہوں نے متبنٰی کیا تھا ——!

حضرت عائشہؓ حسین و جمیلہ خاتون تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا شمار مجتہدین صحابہ میں سے ہے۔ علمی حیثیت سے وہ چند کو چھوڑ کر تمام اکابر صحابہ پر فائق تھیں۔ وہ قرآن، فرائض حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، تاریخ عرب وغیرہ کی زبردست عالم تھیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتویٰ دیتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ سے ۲۲۱۰ احادیث

مروی ہیں جن میں سے ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے امام بخاریؒ نے منفرداً اُن سے ۵۴ حدیثیں اور امام مسلم نے ۶۸ حدیثیں .... روایت کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ احکام شرعیہ میں سے چہارم اُن سے منقول ہے ——— !
حضرت عائشہؓ نے ۶۷ غلاموں کو خرید کر آزاد کیا تھا وہ سخاوت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں ——— !!

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ انکی والدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا جو مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی ہمشیرہ تھیں اور خود بھی صحابیہ تھیں۔ آپ بعثت نبوی سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح خنیس بن حذافہ سے ہوا تھا جو خاندان بنو سہم سے تھے آپ اپنے والدین اور شوہر کے ساتھ مسلمان ہوئیں۔ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ مدینہ کو ہجرت فرمائی اور غزوۂ بدر میں خنیسؓ کے زخمی ہو کر فوت ہونے پر اُن کا نکاح رسول اکرمؐ سے ہو گیا۔ حضرت حفصہؓ نے امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں ۴۵ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ اُنہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی حضرت حفصہؓ سے ۶۰ حدیثیں منقول ہیں جو اُنہوں نے آنحضرت صلعم اور حضرت عمرؓ سے سُنی تھیں ——— !

حضرت زینبؓ

حضرت زینبؓ کے والد کا نام خزیمہ تھا۔ آپ کی کُنیت ام المساکین تھی۔ ان کے پہلے خاوند عبداللہ بن جحش تھے جب اُنہوں نے جنگ اُحد ۳ھ میں شہادت پائی تو آنحضرتؐ نے اُن سے نکاح کر لیا۔ مگر وہ محض دو تین ماہ زندہ رہیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد بیویوں میں سے صرف حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا۔ آنحضرت نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔ وفات کے وقت اُن کی عمر ۳۰ سال تھی ——— !

حضرت اُم سلمہؓ

حضرت اُم سلمہؓ کا نام ہند تھا اور اُم سلمہؓ کنیت تھی وہ قبیلۂ قریش کے خاندان مخزوم سے تھیں۔ حضرت اُم سلمہؓ کے والد کا نام ابو امیہ اور والدہ کا نام عاتکہ تھا جو خاندان بنو فراس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابو امیہ مکہ کے مشہور رئیس اور سخی سردار تھے جو زاد الراکب کے لقب سے مشہور تھے۔ حضرت اُم سلمہؓ کا پہلا نکاح اپنے چچا زاد اور رسول اکرمؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ سے ہوا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی آغاز نبوت میں مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے ملک حبش گئی تھیں جہاں سے وہ کچھ عرصہ کے بعد پہلے مکہ اور پھر مدینہ آئیں۔ اُن کے خاوند عبداللہ ابو سلمہؓ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ بڑے شہسوار تھے اور جنگ بدر اور اُحد میں شامل ہوئے تھے۔ غزوۂ اُحد میں زخمی ہو کر فوت ہوئے۔ وفات ماہ جمادی الاُخریٰ سنہ ۴ھ میں ہوئی۔ آنحضرت صلعم نے خود اُنکی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ ابو سلمہؓ کی وفات کے وقت حضرت اُم سلمہؓ حاملہ تھیں۔ وضع حمل کے بعد اور عدت کی مدت گزر جانے پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا پیغام نکاح دیا مگر حضرت اُم سلمہؓ نے انکار کیا۔ پھر حضرت عمرؓ رسول اکرمؐ کا پیغام لے کر پہنچے۔ حضرت اُم سلمہؓ نے آنحضرت کا پیغام چند شرائط کے ساتھ قبول کیا اور نکاح اُن کے لڑکے عمر نے پڑھایا ——— ! حضرت اُم سلمہؓ بہت غیور اور شرمیلی تھیں اور عرصہ تک آنحضرت سے شرم و غیرت کرتی رہیں۔ آنحضرتؐ کو اُن سے بہت محبت تھی۔ ازواج مطہرات کے دو گروہ تھے ایک میں حضرت عائشہؓ

حفصہؓ صفیہؓ اور سودہؓ شامل تھیں اور دوسرے میں حضرت
ام سلمہؓ اور باقی ازواجؓ ....

حضرت اُم سلمہؓ غزوۂ خندق سے قریب اور صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر میں شریک تھیں۔ ۵ھ میں آیت حجاب نازل ہوئی اس سے بیشتر ازواج مطہرات دُور کے رشتہ داروں کے سامنے بھی بے تکلف آیا کرتی تھیں مگر اب محض چند بہت قریب کے اعزا کے سامنے آنے کا حکم ہوا۔ حضرت اُم سلمہؓ کا انتقال ۶۳ھ میں ۸۴ برس کی عمر میں ہوا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ پہلے شوہر سے آپ کی اولاد میں سلمہؓ تھے جن کا نکاح آنحضرتؐ نے حضرت حمزہؓ کی لڑکی امامہ سے کیا تھا۔ دوسرے لڑکے عمر تھے جنہوں نے حضرت اُم سلمہؓ (اپنی ماں) کا نکاح آنحضرت سے پڑھایا تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں یہ فارس اور بحرین کے حاکم تھے۔ ان دو لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں دُرہ اور زینب تھیں۔ حضرت اُم سلمہؓ نہایت حسین تھیں۔ بال نہایت خوبصورت اور گھنے تھے اور علم و فضل میں سوائے حضرت عائشہؓ کے کوئی اور بیوی ان سے بڑھی ہوئی نہ تھی۔ ان سے ۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔ حضرت اُم سلمہؓ مجتہدین اور محدثین صحابہ میں سے شمار ہوتی ہیں۔

حضرت زینبؓ

حضرت زینبؓ کی کُنیت اُم الحکم، باپ کا نام جحش جو قبیلۂ قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتے تھے اور ماں کا نام امیمہ تھا جو عبدالمطلب حضرت رسول اللہ کے دادا کی بیٹی تھیں۔ چنانچہ حضرت زینبؓ آنحضرتؐ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہوئیں۔ حضرت زینبؓ نبوت کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام اور متبنّیٰ زید بن حارثہؓ سے انکا نکاح کر دیا تھا مگر ایک سال سے زیادہ یہ تعلقات قائم نہ رہ سکے اور حضرت زینبؓ نے خانگی شکر رنجی کے باعث ان کو طلاق دیدی اس کے بعد دلجوئی کے لئے آنحضرتؐ نے ان کو خود نکاح کرنا چاہا مگر عرب میں ایام جاہلیت میں متبنّیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا آنحضرت کو بھی پس و پیش ہوا جس پر نکاح کی وحی نازل ہوئی اور آنحضرتؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ اسی زمانہ میں آیت حجاب اُتری اور پردہ کا حکم ہوا یہ ذیقعد ۵ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت زینبؓ نے ۲۰ھ میں انتقال فرمایا اور ۵۳ برس کی عمر پائی۔ آنحضرتؐ سے جس وقت نکاح ہوا اُس وقت حضرت زینبؓ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ حضرت عمرؓ نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں —— حضرت زینبؓ کوتاہ قامت لیکن خوبصورت اور متناسب الاعضا خاتون تھیں۔ دینداری، زہد و تقوےٰ، راست گفتاری اور فیاضی کے لئے مشہور تھیں۔ کتب حدیث میں حضرت زینبؓ سے گیارہ روایتیں منقول ہیں ——!!

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ قبیلۂ خزاعہ کے خاندان مصطلق سے تھیں اُنکے والد کا نام حارث تھا۔ حضرت جویریہؓ کا پہلا نکاح اپنے ہی قبیلے میں مسافع بن صفوان سے ہوا تھا۔ حضرت جویریہؓ کا باپ جو خاندان بنو مصطلق کا سردار تھا اور خاوند دونوں کافر اور دشمنان اسلام تھے۔ جب حارث نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں تو مطلع ہو کر آنحضرتؐ نے مدینہ سے افواج روانہ کیں اور غزوۂ مریسیع میں صحابہ کو شاندار فتح حاصل ہوئی جس میں حضرت جویریہؓ بھی مال غنیمت میں بطور کنیز ہاتھ آئیں۔ وہ

تقسیم کے وقت ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں مگر انہوں نے زرِ فدیہ دینا چاہا جب وہ رسول اکرمؐ کے پاس امداد کے لئے آئیں تو آنحضرت نے اُن کی مرضی پاکر رقم خود ادا کردی اور اُن سے نکاح کرلیا۔ حضرت جویریہؓ کا اصلی نام برہ تھا۔ مگر آنحضرتؐ نے بدل کر جویریہ رکھا۔ حضرت جویریہؓ حسین اور متناسب الاعضا خاتون تھیں۔ اُن کا انتقال ماہ ربیع الاول ۵۰ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں ہوا۔ مروان نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں ——

حضرت جویریہؓ سے چند حدیثیں مروی ہیں۔ وہ نہایت زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں ——!!

حضرت ام حبیبہؓ

ان کا رملہ نام اور اُمّ حبیبہ کنیت تھی۔ اُن کے والد کا نام ابی سفیان صخر اور والدہ کا نام صفیہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ رسول اکرمؐ کی بعثت کے سترہ سال پہلے تولد ہوئی تھیں۔ ان کا نکاح پہلے عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہی وہ مسلمان ہوئی تھیں اور حبش کو ہجرت کی تھی۔ حبش جاکر عبیداللہ عیسائی ہوگئے مگر حضرت اُمّ حبیبہؓ نے عیسائی ہونے سے انکار کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد کثرتِ مے نوشی کے باعث عبیداللہ کا انتقال ہوگیا۔ عدت کے دن ختم ہونے کے بعد رسولِ اکرمؐ نے عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعے سے بوساطت نجاشی اُمِ حبیبہؓ کو نکاح کا پیام دیا۔ نجاشی نے خود نکاح پڑھایا اور چار سو دینار مہر مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد حضرت اُم حبیبہؓ براہِ سمندر مدینے ایسے وقت آئیں جب آنحضرتؐ خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے اسوقت اُن کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے بھائی امیر معاویہؓ کے زمانۂ خلافت میں ۴۴ھ میں انتقال فرمایا اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔ اسوقت ان کی ۷۳ برس کی عمر تھی۔ حضرت ام حبیبہؓ کے پہلے شوہر سے دو اولادیں تھیں۔ آپ حسین و نازک اندام تھیں۔ حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ روایات مروی ہیں ——!!

حضرت میمونہؓ

حضرت میمونہؓ کے والد کا نام حارث تھا جو قبیلۂ قریش سے تھے اور والدہ کا نام ہند تھا جو قبیلۂ حمیر سے تھیں۔ اُن کا پہلا نکاح مسعود بن عمرو بن عمیر ثقفی سے ہوا تھا پھر کسی وجہ سے ناچاقی ہوگئی اور طلاق لے کر دوسرا نکاح ابورہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا مگر جب وہ بھی مرگئے تو پھر آنحضرتؐ نے ان سے ۷ھ میں مکہ میں احرام کی حالت میں نکاح کیا۔ عمرہ سے فارغ ہونیکے بعد مقام سرف میں جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے رسمِ عروسی ادا ہوئی۔ یہ رسولِ اکرمؐ کا آخری نکاح تھا یعنی حضرت میمونہ سب سے آخری بیوی تھیں۔ حضرت میمونہؓ نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔ حضرت ابن عباسؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور مقام سرف میں دفن ہوئیں۔ حضرت میمونہؓ سے ۴۶ روایات مروی ہیں —!!

حضرت صفیہؓ

حضرت صفیہؓ کا اصلی نام زینب تھا۔ اُن کے والد کا نام حیی بن اخطب تھا جو قبیلۂ بنو نضیر کا سردار تھا اور حضرت ہارونؑ کی نسل میں سمجھا جاتا تھا اور ماں کا نام ضرہ تھا جو سموال رئیس قریظہ کی بیٹی تھی اور یہ دونوں قبائل بنو اسرائیل کے ممتاز ترین قبائل تھے۔ حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی۔ جب کسی وجہ سے اُن کو سلام نے طلاق دیدی تو انہوں نے کنانہ ابن ابی الحقیق سے نکاح کرلیا۔ جو ابورافع تاجر حجاز اور رئیس خیبر کا بھتیجہ تھا۔ جب کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا تو حضرت صفیہؓ بطور لونڈی ہاتھ آئیں۔ آنحضرتؐ

نے اُن کو آزاد کر کے اُن سے خود نکاح کر لیا۔ حضرت صفیہؓ نے سنہ ۱۰ھ میں حج رسولِ اکرمؐ کے ساتھ کیا تھا۔ حضرت صفیہؓ نے سنہ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کے ایامِ محاصرہ میں اُن کو بہت مدد دی تھی۔ انہوں نے ماہ رمضان سنہ ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ اسوقت ان کی عمر ۶۰ سال کی تھی اُنہوں نے ایک لاکھ کا ترکہ چھوڑا تھا جس کا ایک ثلث میں اپنے ایک یہودی بھانجے کے لئے چھوڑ گئی تھیں — وہ کوتاہ قامت اور حسین و جمیل تھیں۔ حضرت صفیہؓ سے چند روایات مروی ہیں جن کو امام زین العابدین وغیرہ نے بیان کیا ہے حضرت صفیہؓ حلم و تحمل اور عقل کی پتلی تھیں۔ وہ اپنے ہم قوم اور خویش و اقارب یہودیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھیں۔

حضرت فاطمہ زہراؓ

فاطمہ نام زہرا لقب۔ آنحضرتؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ نبوت سے تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئی تھیں۔۔۔۔ .... تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں رسول اکرمؐ نے ان کا نکاح ماہ ذی الحجہ سنہ ۲ھ میں حضرت علیؓ کے ساتھ کر دیا تھا۔ حضرت علیؓ محض مفلس تھے اور آنحضرتؐ کے پاس ہی رہتے تھے نکاح کے بعد وہ حارثہ بن نعمان انصاری کے مکان میں اُٹھ گئے۔ رسول اکرمؐ نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدا جو کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا تھا، ایک چھاگل، دو مٹی کے گھڑے، ایک مشک اور دو چکیاں دی تھیں۔ حضرت علیؓ نے مہر میں اپنی جنگ بدر سے حاصل کی ہوئی زرہ فروخت کر کے ۴۸۰ درہم دیئے تھے۔ جب رسول اکرمؐ نے وصال فرمایا تو حضرت فاطمہؓ کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ روایت ہے کہ اسکے بعد جب تک وہ زندہ رہیں متبسم نہ ہوئیں۔ آنحضرتؐ کے وصال سے چھ ماہ کے بعد ماہ رمضان سنہ ۱۱ھ میں حضرت فاطمہؓ نے انتقال فرمایا۔ یہ منگل کا دن اور رمضان کی تیسری تاریخ تھی۔ اسوقت اُن کا سن ۲۹ سال کا تھا۔ حضرت فاطمہؓ کے جنازہ سے ہی عورتوں کے جنازہ کو پردہ کر کے لے جانیکا طریقہ شروع ہوا بقول بعض وہ جنت البقیع میں اور بقول بعض دار عقیل کے ایک گوشہ میں دفن ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں حسنؓ حسینؓ محسن۔ اُم کلثوم۔ زینب۔ حضرت فاطمہؓ کا حلیہ، گفتگو، لب و لہجہ، طریقۂ نشست و برخاست اور رفتار رسولِ اکرمؐ سے ملتی جلتی تھی۔ حضرت فاطمہؓ سے ۱۸ روایات مروی ہیں۔ حضرت فاطمہ زہراؓ آنحضرت صلعم کی محبوب ترین اولاد تھیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی ——— !!!

(ماخوذ از سیر الصحابیات)

{محمود بریلوی}



غزل

جناب خان محمد کبیر خاں صاحب رسا جالندھری

کیا کیا ہیں فرطِ ضعف سے مشکل کے سامنے
اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہوں منزل کے سامنے

اُڑتی نہیں یہ گردسی محمل کے سامنے
آتا ہے کوئی خاک میں مل مل کے سامنے

کیف آفریں ہے کتنا مرا شوقِ انتظار
بے خود پڑا ہوں پردۂ حائل کے سامنے

مجھ ناتواں کی بحرِ حوادث میں کیا بساط
پیراک ڈوب جاتے ہیں ساحل کے سامنے

یہ کس کی یاد ہے جو عروسِ اُمید کو
جھولا جھلا رہی ہے مرے دل کے سامنے

وحشت کا یہ کمال ہے یا عشق کا مآل
مجنوں کی خاک اُڑتی ہے محمل کے سامنے

پیشِ نظر ہمیشہ رہا مقصدِ بلند
ہم خاک میں ملے بھی تو منزل کے سامنے

دیکھا نہ آخر آہی گئی آرزوئے قتل
تلوار بن کے دیدۂ بسمل کے سامنے

یاد آرہی ہیں گذری ہوئی شب کی صحبتیں
بیٹھا ہوں شمعِ کشتۂ محفل کے سامنے

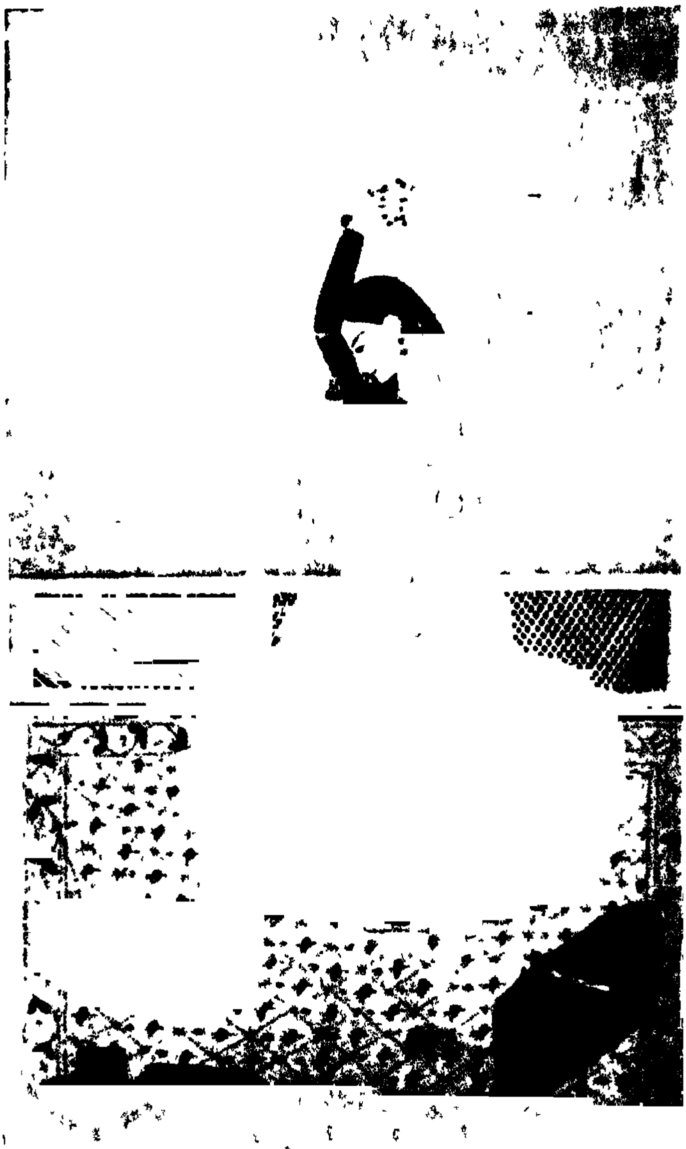
مانگا جو کچھ تو شانِ کریمی نے رکھ دیا
دونوں جہاں کا غم ترے سائل کے سامنے

حق پر ہیں ہم تو پائیں گے ہر حال میں فروغ۔ ق۔ دب کر کبھی چلیں گے نہ باطل کے سامنے

پہنچیں گے اپنی منزلِ مقصود پر ضرور
راہِ طلب میں لاکھ ہوں مشکل کے سامنے

ہونے نہ دیں گے دیدۂ بد میں کو شادماں
اُبھر ینگے ڈوب ڈوب کر ساحل کے سامنے

کہتے ہیں تیغ ناز کی جھنکار سے رسا
محشر بپا ہے کوچۂ قاتل کے سامنے



اندرائی

حامد بھائی کی مغرب پرستی

از محترمہ سیدہ صغریٰ بیگم صاحبہ

حامد بھائی کے والد شیخ صدرالدین، علیپور کلکتہ میں درجہ اول کے مجسٹریٹ تھے۔ نہایت متشرع اور باخدا انسان، حد درجہ صاف باطن اور پاک طینت۔ انگریزی تعلیم کے زہریلے اثرات اور فیشن کی تباہ کن ہوا سے خود بھی بچے ہوئے تھے اور اپنی اولاد کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ معاشرت قدیم کے سختی سے پابند اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر سلامت روی کی چال چلنے والے تھے۔

اور ہمارے حامد جو تھے تو بالکل اپنے والد کے برعکس۔ بقول اکبر مرحوم۔

رنگ چہرے کا تو کالج نے رکھا بھی قائم
رنگ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

بیٹے کی ہر حرکت باپ کے برہمیٔ مزاج کا باعث ثابت ہوتی اور ان کی ہر بات ان کے خلاف طبیعت۔

وہ انگریزی تعلیم کو صرف ذریعہ معاش سمجھتے تھے اور یہ مجسم انگریز بننا چاہتے تھے۔ انہیں انگریزی لباس حتیٰ کہ ولایت ساختہ چیزوں سے بھی نفرت تھی۔ اور یہ ولایتی چیزوں پر جان دینے والے۔ انگریزی لباس پر مرنے والے۔ وہ پردے کے نہایت پرجوش حامی۔ یہ پردے کے رسم و قیود کے خلاف۔ وہ پرانے زمانے کے پرانے خیالات کے انسان۔ یہ نئی روشنی کے آزاد طبیعت۔ وہ باوجود کبر سنی کے جھک کر سلام کرنے والے اور ملنے کے عادی انہیں ہاتھ جھٹک کر گڈ مارننگ کا ہنٹر کھینچ مارنا مرغوب انہیں ڈیڑھ بالشت کی داڑھی بڑھانی پسند۔ یہ داڑھی کے ساتھ ہر وقت مونچھوں کا بھی صفایا کرنے کو تیار۔ وہ پابند صوم وصلوٰۃ۔ متقی و پرہیزگار۔ اور یہ روزہ تو روزہ کبھی بھولے سے عید بقرعید کی بھی نماز نہ پڑھی۔ وہ حامد بھائی کو ہر وقت کتابوں میں منہمک۔ بلکہ ان کے انبار میں "گم" دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہ ہر وقت ٹینس۔ کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ برج کے پیچھے دیوانے رہتے۔ تعلیم پر بہت کم توجہ دیتے۔ پھر بھلا نباہ ہوتا تو کس طرح اور گذر ہوتی تو کیونکر

رفتہ رفتہ بیٹے کی "فیشن پرستی" باپ کو ناقابل برداشت ثابت ہونے لگی تو انہوں نے سختی شروع کی اور اچھی طرح کی۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایک دن چپکے سے حامد بھائی نے بیک بینی و دوگوش ؎

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی

دو برس تک دہلی۔لکھنؤ لاہور۔ رنگون کی خاک چھانتے پھرے۔ کہیں کوئی وسیلہ نہ ہوا۔ لیکن تھے آدمی چالاک آخر کار بمبئی میں دو سو روپے ماہوار پر نوکر ہو گئے۔

یوں تو خیر سے حامد بھائی نے میٹرک تک ہی تعلیم پائی تھی، یا حاصل کی تھی۔ لیکن وضع قطع لباس سے یورپین تو نہیں۔ ہاں اینگلو انڈین ضرور معلوم ہوتے تھے حد درجہ فیشن کے دلدادہ ہر وقت سوٹ بوٹ کالر نکٹائی سے درست رہتے اور پھر سوٹ بھی صبح کا ایک ہوتا تو شام کا دوسرا۔ جب منہ دھوتے ہلکا سا پوڈر ضرور لگاتے، تاکہ رنگت کی سانولاہٹ سفیدی سے بدل جائے۔ رات کو سوتے وقت چہرے گردن ہاتھوں پر قسم قسم کی کریم کی مالش کرتے اور وہ بھی خاص فرانس کی بنی ہوئی۔ منہ میں ایک لمبا سا پائپ بائیں طرف کے گوشہ میں ہر وقت دبا رہتا۔ جس سے گفتگو کا لہجہ اور بھی کرخت معلوم ہوتا تھا۔ کسی میم کو دیکھ کر جھک جانا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت ہیٹ اُتار کر بغل میں دبا لینا۔ ٹینس کھیلتے کھیلتے بے تکلفی سے میموں کے پیروں کے پاس جہاں وہ کرسیوں پر بیٹھی ہوتیں لیٹ جانا کھانا ایک وقت گھر میں تو دوسرے وقت کسی کے ساتھ ہوٹل میں کھانا۔ ناچ کے بڑے شوقین تھے۔ شراب کو برا جانتے تھے۔ گرجا میں کسی میم کے ساتھ جاکر قربانگاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دعا میں شریک ہونا ان کے نزدیک قابل ملامت نہ تھا۔

انگریزی اسکول اور انگریز لڑکوں کی صحبت کی بدولت اچھی انگریزی بول لیتے تھے۔ اس نے سمند ناز پر تازیانہ کا کام کیا۔ اور وہ از سرتاپا "انگریزیت" میں غرق ہو ہو گئے۔ صرف کوئی کسر تھی تو ایک کتے اور ایک میم صاحب کی۔

(۲)

پانچ برس تک بمبئی میں رہنے کے بعد کمپنی کے ساتھ انہیں بھی کلکتہ آنا پڑا۔ یہاں آکر والدین سے ملے۔ عزیزوں سے ملاقات کی۔ مگر نہ اپنے گھر ٹھیرے نہ کسی عزیز کے یہاں قیام کیا۔ "خلنگ کورٹ" میں دو کمرے ڈرائینگ اور بیڈ روم کرایہ پر لے کر اور اُسے انگریزی طرز پر سجاکر رہنے لگے کھانا ہوٹل میں کھاتے تھے۔ اب حقیقی طور پر ان کا شمار پرستاران مغرب میں ہونے لگا۔ حامد میاں سے "مسٹر حمید" ہوئے اور پھر "حمید" سے "مسٹر حیمن" کہلانے لگے۔

چار سو روپیہ تنخواہ کے ہر ماہ فیشن کی نذر کر دیتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی مغرب پرستی ہنوز تشنہ تکمیل تھی۔

ولایت کی زیارت کے بہت مشتاق تھے۔ بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح وہاں تک پہنچ جائیں کئی مرتبہ کمپنی کو اپنی خدمات ولایت جانیکے لئے پیش کیں۔ مگر اسے شومئی بخت کہئے یا "ناقابلیت" کہ ان کی درخواستیں مسترد کر دی گئیں اور وہ طواف لندن کی سعادت سے محروم رہ گئے۔

حامد بھائی ابھی تک کنوارے تھے والدین نے جہاں نسبت کر رکھی تھی وہاں انہیں منظور نہ تھا۔ اور ان کے حسب پسند بیوی ملنی مشکل ہی نہیں بلکہ ایک امر محال تھا۔ کیونکہ خود تعلیم یافتہ نہ تھے: مگر ایم اے پاس بیوی کی تلاش تھی۔ خود امیر نہ تھے مگر دولتمند شریک زندگی کی جستجو تھی۔ خود شکیل نہ تھے لیکن حسین رفیقۂ حیات کی تمنا میں سرگرداں تھے۔

ایک دفعہ ظفر بھائی نے ان سے پوچھا کیوں حامد بھائی جن صفات کے آپ خود حامل نہیں ان اوصاف .

کی بیوی کیوں چاہتے ہو؟"

یہ سنتے ہی تو لگ گئے جھلا کر بولے۔ "تم کیا کرو، کہ تمہارا مطمح نظر ہی بلند نہیں۔ اسی پست نظری نے تو ہندوستان کو دریائے ذلت میں ڈبو رکھا ہے"

زیادہ تر ان کی خواہش میم سے شادی کرنے کی تھی۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ جسے یہ پسند کرتے وہ انہیں ناپسند کرتی اور جو انہیں قبول کرتی تھی اسے منظور نہ کرتے۔ چلو قصہ ختم ہوا اب شادی ہوتی تو کس طرح۔

ایک مرتبہ ایک یورپین مس سے، جس پر حامد بھائی ان دنوں لٹو ہو رہے تھے۔ میں نے سوال کیا "تم ہمارے حامد بھائی سے شادی کیوں نہیں کر لیتی"؟

اس نے ہنس کر جو جواب دیا وہ اس شعر سے بہت ملتا جلتا ہے

بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

میں نے کہا "سچ کہتی ہو۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے
گئے دونوں جہاں کے دین سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

کہنے لگی "معاف کیجئے گا۔ آپ کا سوال ہی کچھ ایسا بے ڈھب تھا کہ مجھے بے تکلف جواب دینا پڑا"

غرض اسی جستجو میں سال پہ سال گذرتے چلے گئے۔ لیکن ان کی حسب پسند بیوی نہ ملنی تھی نہ ملی۔ والدین کی خواہش تھی کہ کسی طرح ان کے اکلوتے لڑکے کا گھر آباد ہو جاتا۔ تو ان کے ارمان بھی جو ایک مدت سے دل کے کسی عمیق ترین گوشہ میں پژمردہ ہو کر پڑے ہوئے تھے نکلتے۔ اور یہ پوتا پوتی کھلاتے۔ ان کی بہاریں دیکھتے۔ خود چراغ سحری ہو رہے تھے۔ دل کو گوارہ نہ تھا کہ بیٹے کی شادی کا ارمان بھی ان کے ساتھ دفن ہو!!۔

آخر کار کئی برس کی جدوجہد بار ور نظر آنے لگی۔ یعنی حامد بھائی ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنے پر نیم راضی ہو گئے تھے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ تصویر دکھائی جائے اور ان کو کسی قسم کی رسومات ادا کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ اور بیوی کو سر بازار پھرانے یا "ہال" میں لے جا کر نچانے پر کسی قسم کی مزاحمت نہ ہو۔

دلھن والے حالانکہ ایک ہی خاندان کے لوگ تھے مگر کسی طرح ان شرائط پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ بوڑھے باپ نے ہاتھ جوڑے، منت و خوشامد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تب کہیں جا کر بادل نخواستہ راضی ہوئے۔

(۳)

"نور جمال" حقیقت میں حور جمال تھی۔ اس کا سا حسن ہندوستانی گھروں میں شاذو نادر ہی نظر آتا ہے دستکاری میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ اردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم پائی تھی انگریزی بھی تھوڑی بہت جانتی تھی۔ مگر فیشن ایبل۔ آزاد خیال، شوخ طبیعت نہ تھی، از حد شرمیلی۔ کم سخن۔ اگلے وقتوں کی کنواری بیٹیوں کی طرح ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھنے والی۔ والدین کی تابعدار، خاندان بھر کی خدمتگذار۔ معصومیت کی تصویر، پکی دیندار،

اگر سچ پوچھو تو وہ حامد بھائی کے قابل نہ تھی۔ یا حامد بھائی اس کے لائق نہ تھے۔ اس میں اگر جوہر قدامت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تو ان کی رگوں میں عہد حاضرہ کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ وہ معاشرت مشرق کی علم بردار تھی تو یہ تہذیب مغرب کے پرستار۔ دونوں کی طبیعتوں

میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جبھی تو لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ اللہ خیر کرے اور انجام نیک ہو۔

لیکن نہ جانے ماں باپ کی آنکھوں پر کیا پردے پڑ گئے تھے کہ انہیں کچھ نہ سوجھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ دلہن کی ماں کی یہ خواہش تھی کہ دولھا ہندوستانی کپڑے پہن کر بیاہنے آئے۔ حامد بھائی نے یہ بھی نامنظور کیا۔ ان دنوں ان کی کمپنی بمبئی واپس جانے والی تھی۔ اس لئے جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی ٹھیر گئی۔ کیسی ساچق کس کی مہدی۔ کیسی برات، تاریخ معینہ پر چار بجے احباب کے لائے ہوئے پھولوں سے سجائی ہوئی موٹر پر بیٹھے۔ آگے آگے ان کی موٹر پیچھے دوست احباب عزیز واقربا کی موٹریں۔ اب اسے برات کہئے یا موٹروں کی دوڑ، غرض "بھاگم بھاگ" دلہن کے گھر پہنچے۔

نکاح کے بعد بڑی بوڑھیوں کے اصرار سے دولھا اندر بلایا گیا۔ آپ ہنستے ہوئے اندر چلے آئے۔ وہاں عورتوں کی محفل تھی۔ اپنے بیگانے سب ہی تو آئے ہوئے تھے حامد بھائی آکر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

کسی نے گھبرا کر کہا: "اے ہے! دیکھنا یہ کون موا فرنگی گھسا چلا آرہا ہے؟" کسی نے چپکے سے کہا۔ "اے بی یہی دولھا ہے۔" ایک دوسری کی شکل تعجب سے دیکھ کر کہنے لگی۔ "آے سچ کہنا یہ دولھا ہے؟"

تیسری بولیں۔ "بہن دیکھنا! یہ کس قدر انگریزیت کا دلدادہ ہے کہ آج بھی انگریزی کپڑے پہنے ہوئے ہے نوج ایسے کو کوئی بیٹی دے؟"

ایک باہر سے آئی ہوئیں بی بی نے کہا: "خالہ دیکھنا! یہ لنگور کی قطع بنائے ہوئے دلھن کے برابر بیٹھا ہوا۔ کیا برا سا معلوم ہو رہا ہے۔"

حالانکہ بی بیبیاں دوسرے کمرے میں چلی گئیں تھیں۔ لیکن جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں اور نام دھر رہی تھیں۔

دلھن کی پھوپھی نے حامد بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دلھن کے برابر مسند پر بیٹھا دیا۔ انہوں نے جو دلھن کو کارچوبی چادر میں لپٹے ہوئے دیکھا تو جلدی سے چادر گھسیٹ کر پھینک دی؛ ماں کہنے لگی۔ "ہائیں ہائیں! میاں کیا کرتے ہو؟" پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔

ساجدہ خاتون دلھن کی ضعیف العمر پھوپھی نے آئینہ درمیان رکھ کر قرآن شریف کھولا۔ اور حامد بھائی سے بولیں "میاں پہلے سورۃ الاخلاص کی تلاوت کرو پھر دلھن کی صورت دیکھو۔"

کہنے لگے "سورۃ الاخلاص کیا؟" پھوپھی نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "سورۃ قل ھو اللہ۔" بولے۔ "اس کے پڑھنے سے کیا ہوگا۔ کیا محبت ہو جائیگی؟" بہن نے چپکے سے کان میں کہا۔ "خدا کے لئے بھائی کیا کرتے ہیں۔ ان کی بزرگی کا تو کچھ لحاظ کیجئے۔" کہنے لگے "ہوں! اچھا صاحب لائیے پڑھتا ہوں" پڑھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ماں بہنیں، چچیاں، پھوپھیاں۔ سب منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں انہوں نے جھٹ سے دلھن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ کھلی ہوئی موٹر میں بیٹھایا اور اپنی قیام گاہ کو روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن میاں بیوی کے ہنسی خوشی بمبئی سدھارنے

(۴)

گھر پہنچتے ہی حامد بھائی نے بیوی کے سر سے برقع اتار کر نذر آتش کیا۔ بے پردگی کی بسم اللہ تو نوکروں سے ہوئی جو گھر میں کام کرتے ہوئے پھر رہے تھے۔ بیچاری کو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ حامد بھائی غرائے تو منہ چھپائے ہوئے کھانے میں شریک ہوگئی اس پردہ اور بھی چراغ پا ہوئے۔

شام کو اپنے ساتھ کھلی ہوئی موٹر میں سیر کرانے یا دنیا کو دکھانے لے گئے۔ غریب نے قہر درویش بجان درویش اسے بھی برداشت کیا۔ پھر سلیما کی زیارت کرائی۔

چوتھے روز انہوں نے اپنے احباب کو ایک شاندار "ٹی پارٹی" دی۔ جسے دعوت ولیمہ کہیئے یا "جلسۂ رونمائی" کیونکہ ان کو اپنے دوستوں سے بیوی کا تعارف کرانا منظور تھا۔

زندگی میں پہلی بار پارسی وضع کی ساری اور نیم عریاں جمپر پہنکر حور جمال کو گلابی رنگ اور پاوڈر سے چہرے کی صباحت دوبالا کرنی پڑی۔ اور ہزاروں ہدایات سن لینے کے بعد شوہر کے دوش بدوش مہمانوں کا استقبال کو کھڑی ہوگئی۔

مہمان آنے شروع ہوئے، ایک ایک آتا مسٹر حسین سے ہاتھ ملاتا۔ ان کے حسن کی تعریف کرتا۔ اور مسٹر حسین کو ہدیہ مبارکباد پیش کرتا۔ بیچاری شوہر کے ڈر سے ہاتھ تو بڑھا دیتی۔ لیکن آنکھیں چار نہ کر سکتی۔ نظریں جھکی کی جھکی رہتیں۔ سر سے پیر تک شرم سے عرق عرق سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ کبھی کبھی گھبرا کر حامد بھائی کی طرف دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی بےبسی کا اظہار کر کے بھاگنا چاہتی تو وہ اس کا جواب قہر آلود نظروں سے دیتے غریب سہم کر دم بخود رہ جاتی۔

حامد بھائی مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے قہقہہ پر قہقہہ لگا رہے تھے بیوی کے حسن کی تعریف سن سنکر ان کے چہرے کا سانولا رنگ چقندر ہو رہا تھا۔

موت تھی تو حور جمال کی نہ بھاگ سکتی تھی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ تمام مہمانوں کی نظریں اس کے دلفریب چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور سب ہی اس سے باتیں کرنے کے خواہش مند تھے اور کر رہے تھے۔ بیچاری کس کس کو جواب دیتی۔ اخلاقی غیرت گلا دبا رہی تھی۔ ہندوستانی شرم و حیا سر اٹھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ سما جائے یا کاش چھت ہی گر پڑے کہ وہ اس کے نیچے دبکر ان کی حریص اور پرشوق نگاہوں سے بچ جائے۔

لوگ اسے دیکھ رہے تھے اور وہ زمین کو دیکھ رہی تھی۔ کیک کے ٹکڑے حلق میں پھنس رہے تھے آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، پیشانی اور کنپٹیوں سے پسینہ جاری تھا۔

یکایک جو مہمانوں نے کسی بات پر قہقہہ لگایا تو مارے گھبراہٹ کے غریب کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر فرش پر چھن سے آ رہی۔ ڈیڑھ سو روپے کی ساری جو حامد بھائی اسی دن خاص اس "جلسۂ نمائش" کے لئے خرید کر لائے تھے چائے، سے خراب ہوگئی۔

میاں نے بیوی کی طرف غضب آلودہ نگاہوں سے گھورتے ہوئے ڈانٹ بتائی۔

"بدتمیز! جاؤ کپڑے بدلو!" پھر اپنے دوستوں سے بولے۔ "دیکھا آپ نے! اسی لئے ہندوستانی عورتیں

شادی کرنی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ لاکھ تعلیم یافتہ ہو پھر بھی ایک ہندوستانی، ہندوستانی ہی ہے۔"

حور جمال نے یہ موقع غنیمت جانا اور جس طرح ہرن شکاریوں کے پھندے چھٹ کر بھاگتا ہے۔ اسی طرح وہ بھاگی۔ غم و غصہ سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے سر چکرا رہا تھا آتے ہی پلنگ پر گر پڑی اور درد سر کا بہانہ کر دیا۔

مہمان مسٹر جیمس کی فوری علالت پر افسوس کرتے ہوئے با دل ناخواستہ رخصت ہوئے۔

(۵)

صبح کو بغرض پرسش احوال احباب آنے شروع ہوئے، حور جمال نے مجمع احباب سے گھبرا کر یہ کیا کہ "بزم مشتاقان" سے راہ فرار اختیار کی اور کمرے میں دروازہ بند کر کے ملاقات سے انکار کر دیا۔ خدمتگار نے آکر ڈرتے ڈرتے حامد بھائی سے کہا "میم صاحب کسی سے ملنا نہیں چاہتیں۔ انہوں نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا"

یہ سننا تھا کہ چہرہ سرخ ہو گیا۔ شدت غیظ و غضب سے شیر کی طرح غرائے،۔ خدا کی قسم یہ میری سخت ترین توہین ہے۔ میں اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔"

دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے، غصہ میں بھرے ہوئے کرسی کے دروازہ تک پہنچے اور دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کیا۔ احباب تو یہ رنگ دیکھ کر چپکے سے رخصت ہوئے، غریب حور جمال لرز اٹھی۔ گھبرا کر دروازہ کھولا۔ شوہر کی پرغضب نگاہ، خشمگیں چہرہ دیکھ کر سہم گئی، حامد بھائی برس پڑے۔

"بس بس! میں سمجھ گیا۔ میرے ساتھ تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے سخت غلطی کی کہ تم سے شادی کی تم میری توہین و تذلیل کی باعث بنی۔ اب میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم فوراً اپنا سامان درست کرو اور کلکتہ واپس جاؤ"۔

کرخت و دلشکن الفاظ نے معصوم حور جمال کے دل کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا ڈرتے ڈرتے عاجزی سے بولی خدارا مجھے ایسی سخت سزا نہ دیجئے۔ میں اس کی متحمل نہ ہو سکونگی۔ آپ کی ناراضگی بجا ہے۔ مگر مجھ پر رحم کیجئے، میں کیا کروں۔ میری فطری شرم و حیا مجھے اسقدر بے حیائی کی اجازت نہیں دیتی۔ میں سچ کہتی ہوں ان کے ہاتھ میرے ہاتھ میں سوزن کی طرح چبھتے ہیں۔ ان کی پرشوق نگاہیں میرے سر پر سینکڑوں بجلیاں گراتی ہیں۔ آہ ــــ میں صرف آپ کے لئے تخلیق کی گئی ہوں۔ میری "نسائیت" کے تمام تر مالک آپ ہیں، اسکو غیروں کا ہدف نظر نہ بنائیے۔ آپ اپنے مکان کو جلوہ گہ ناز دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن میں اپنی خلقی غیرت کو کیا کروں۔ آہ ـــ خدائے پاک گواہ ہے کہ کل میں مارے شرم کے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔ آپ مالک ہیں میں آپ کے ہر کام کی تعمیل کو بسر و چشم حاضر ہوں بلکہ اپنی جان بھی آپ پر نثار کرنے میں دریغ نہ کرونگی۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے "شمع بزم" نہ بنائیے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اپنے احباب سے رشتہ ارتباط و اتحاد قائم کرنے پر مجبور نہ کیجئے"

"بس! اپنی بکواس بند کرو" حامد بھائی نے کڑک کر

کر کہا۔ میں تمہاری نصیحتیں سننی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ تمہارے دل و دماغ پر جہالت کی تاریکی اور گندگی اسقدر تسلط جمائے ہوئے ہے۔ میں قیامت تک تمہارے خیالات کی گھٹنگی اور تیرگی دور نہیں کر سکتا۔ اور نہ تم کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنے گھر کو کلبۂ احزان اور اپنے کو جہنم زدہ بنا سکتا ہوں، مہربانی فرما کر اپنا سامان درست کیجئے یہ میرا قطعی فیصلہ ہے"

بدنصیب حور جمال نے انتہائی عاجزی سے کام لیتے ہوئے شوہر کے دونوں پیر پکڑ لئے اور گڑگڑا کر آنسو بہاتے ہوئے کہا از برائے خدا مجھے مہلت دیجئے صرف چند مہینوں کی۔ میں اپنا حجاب دور کرنیکی کوشش کرونگی، بہت ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ آپ کی ہم خیال ہو جاؤں"

مگر سنگدل شوہر کی ایک اور گرج نے مجبور و بیکس حور جمال کو دم بخود کر دیا۔ اس نے روتے ہوئے چہرے، کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی بکھری ہوئی چیزوں کو اکٹھا کیا اور انگریزیت کے فلائی شوہر کے حکم کی تعمیل کو تیار ہو گئی۔

حامد بھائی نے شام کی گاڑی میں آٹھ دن کی بیاہی ہوئی دلھن کو ایک بدترین مجرم کی طرح سوار کرایا، اور ساتھ ایک نوکر دیکر ہمیشہ کے رخصت کر دیا۔

خسر کو بیوی کی روانگی کا تار دیا۔ اور نوکر کے ہاتھ میں ایک مختصر سا خط اس مضمون کا بھیجا۔

قبلہ گاہی! تسلیم نیاز

بیوی کے انتخاب میں مجھ سے سخت غلطی ہوئی حور جمال بالکل میرے خیال کے برعکس نکلی، وہ رہ مشرق پر اور میں رہ مغرب پر گامزن ہوں، ہم دونوں کی طبیعتیں۔ و متضاد حیثیتیں رکھتی ہیں۔ اور یہ اجتماع ضدین، چند ہی روز میں، میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک ضیق النفس؟ اور ناخوشگواری کا باعث ثابت ہوا۔ لہذا انتہائی رنج والم کے ساتھ ان کو واپس بھیجتا ہوں، کیونکہ جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ اسی ماحول میں یہ اپنی زندگی گذار سکتی ہیں میرے گھر کی فضا ان کے لئے قطعاً ناموافق ہے امید کہ میری اس جسارت کو معاف فرمائینگا

خاکسار "حامد"

(۶)

شادی کے آٹھ دن بعد بدنصیب حور جمال جس طرح ذلیل و خوار ہو کر شوہر کے گھر سے میکے آئی تھی خدا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ وہ جسقدر اپنی بدبختی پر ماتم کرتی کم تھا۔ شفیق باپ اور مہربان ماں کی صورت دیکھ کر بلبلا اٹھی۔ ماں کے گلے سے لپٹ کر آنسوؤں کا دریا بہانے لگی۔ ماں باپ خود حیران و پریشان کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ بیٹی کی تیرہ بختی پر کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ مگر مصلحت وقت سے سینہ پر صبر کا پتھر رکھ کر خندہ پیشانی سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا تسلی تشفی دی، سمجھا بجھا کر خاموش کیا۔ گھر میں سب کو تاکید کر دی کہ جہاں تک ہو حور جمال کا دل بہلانے کی کوشش کی جائے۔ کبھی کوئی ایسا تذکرہ نہ ہونے پائے، جس سے اس کا غم بڑھنے کا احتمال ہو"

شیخ صاحب کے گھر دلھن کی واپسی کی خبر پہنچی تو دونوں میاں بیوی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، باپ

سر پکڑ کر بیٹھ گئے، ماں نے منہ پیٹ لیا۔ کن کن مشکلوں سے تو شادی ہوئی تھی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا، جتنا ہی رنج کرتے اور جتنا ہی اپنے کئے پر پچھتاتے کم تھا۔ نالائق بیٹے کی طبیعت سے خوب واقف تھے بہت نہ بگڑی کہ تہدید آمیز خط لکھتے، ہاں دونوں میاں بیوی بیٹے کی سسرال گئے سمدھی اور سمدھن سے خوشامدانہ باتیں کیں۔ کچھ بیٹے کو برا بھلا کہا۔ بہو کو تسلی تشفی دی، اور خود بمبئی جا کر حامد بھائی کو سمجھانے کا وعدہ کر کے چلے آئے، اور اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔

کئی دن کے بعد بمبئی گئے۔ حامد بھائی نے بظاہر بڑی آؤ بھگت سے باپ کا استقبال کیا مگر دل ہی دل میں ناراض تھے جانتے تھے کہ یہ حور جمال کی طرف سے وکالت کرنے آئے ہیں۔ اور ہوا بھی یہی۔ انہوں نے گھر پہنچنے کے ساتھ ہی دم بھی نہ لیا۔ بھلا دم لیتے تو کیونکر ان کے ہاں دنیا اندھیر ہو رہی تھی، ایک طرف خاندان کی ذلت و رسوائی کا احساس انہیں بیتاب کئے ہوئے تھا، تو دوسری طرف ناکردہ گناہ اور معصوم حور جمال کی بربادی ان کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی بیٹے کی صورت دیکھتے ہی غصہ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے ملامتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ حامد بھائی گردن جھکائے سنتے رہے جب خوب بگڑ چکے تو خوشامد پر اتر آئے، منتیں کیں، خدا کا خوف دلایا، زمانہ کے نشیب و فراز سمجھائے۔ بدنامی سے ڈرایا، غیرت و شرم دلائی، لیکن وہاں تو شرم چہ کتی است کہ پیش [illegible] بیاید والا مضمون تھا۔ ایک سچا پرستار مغرب [illegible] کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسوقت تو حامد بھائی نے کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ سوچ کر جواب دونگا۔

بیچارے دو دن تک اپنا سر کھپاتے رہے مگر کچھ اثر نہ ہوا، تیسرے دن حامد بھائی نے یہ جواب دیا

آبا جان! میں اس شادی پر قیامت تک آمادہ نہ ہوتا۔ اگر آپ مجھے مجبور نہ کرتے۔ یہ خود آپ ہی کا کیا دھرا ہے، میں بالکل بے قصور ہوں، اگر آپ مجھے بہت تنگ کیجئیگا تو میں بمبئی چھوڑ کر پھر گمنامی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دونگا۔"

ضعیف العمر باپ نے دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا، اور اپنی ناکامی پر موٹے موٹے آنسوؤں سے سفید ریش کو تر کرتے ہوئے وہاں سے واپس ہوئے

(۷)

معصوم حور جمال کو حامد بھائی کے ظلم کا شکار بنے ہوئے دو برس گذر گئے، اس دو برس کے طویل عرصہ میں، حامد بھائی کو راہ راست پر لانے کیلئے کیا کچھ نہ جتن کئے گئے، فرداً فرداً سارے خاندان نے سمجھایا، غیرت دلائی، لیکن کسی کی بھی سعی مشکور نہ ہوئی، حتیٰ کہ خود حور جمال نے کئی خطوط لکھے۔ مگر ایک کا بھی جواب نہ آیا۔

سب تو اپنی سی کوشش کر تھک کر بیٹھ گئے تھے، لیکن آہ —— غم نصیب حور جمال اپنے زمانہ حیات کا منحوس ترین دن کیونکر بھول سکتی تھی۔ جس دلشکن واقعہ نے عین زمانہ بہار میں اس کے غنچہ دل کو مردہ کر دیا تھا، اسکو بھول جانا اس کے حیطۂ امکان سے باہر تھا۔

ایک مسلمان عورت کا مقصد حیات، یا

اس کی زندگی کی اولین آرزو، شوہر کی محبت، چند بھولے بھالے معصوم بچے، ایک باعزت، و خوشحال گھر تک ہی محدود ہے، وہ اپنی جوانی کا شاندار زمانہ تجربے حصول میں صرف کرتی ہے، اور حیات کے آخرین ایام اپنی کامیاب زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے میں گذار دیتی ہے، اسے دنیا کی ترقی و تنزل سے کوئی غرض ہوتی ہے، اور نہ چین و جاپان کی عظیم ترین جنگ سے مطلب۔ وہ نہ انگلینڈ کے اختراع وایجادات دیکھ کر نقش حیرت بنتی ہے۔ اور نہ سائنس کے کرشمے سنکر متعجب ہوتی ہے اس کی دلبستگی نہ سینما اور تھیٹر سے ہوتی ہے ور نہ ایگزیبیشن اور کارنیوال سے۔ وہ نہ تحریک قانون شکنی پر بحث کرتی ہے، اور نہ سول نافرمانی پر حجت، اسے ہندوستان کی کھدر پوشی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ .. سوراج حاصل کرنے کے بجائے شوہر کی محبت حاصل کرنا مقدم سمجھتی ہے۔

الغرض ایک مسلمان عورت فطرتاً شوہر کی کچھ اس قدر پرستار واقع ہوتی ہے کہ اسکو صرف گھر کی چار دیواری یا دوسرے لفظوں میں کنج قفس کے اندر شوہر کی پرخلوص محبت میں دنیائے عیش کی صد ہزار رنگینیاں رقصاں نظر آتی ہیں۔

بدنصیب حورجمال ان تینوں میں سے ایک کی بھی مالک نہ تھی۔ شوہر کی کج ادائی رہ رہکر اسکے غمگین دل میں چٹکیاں لیتی تھی جوں جوں دن زیادہ گذرتے جا رہے تھے اسی قدر اسکی مایوسیاں بھی بڑھتی جارہی تھیں اسکا مضطرب دل اسکو کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا۔ آتش غم کی سوزش میں اسے اندر ہی اندر جلارہی تھیں۔ وہ اپنی لوح کی گہرائیوں میں ایک ناقابل تشریح اذیت ہروقت محسوس کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسکو بخار آنے لگا۔ اور اسکی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اسکا سرخ و سفید رنگ برگ خزاں رسیدہ کی طرح زرد ہوگیا اسکی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں آنسو بہاتے بہاتے بے رونق ہوگئیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ اس کا نرم و نازک جسم صرف ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا۔ اسکا گلاب کی طرح تر و تازہ چہرہ سوکھ گیا تھا۔ اور اس پر ایک مردنی سی چھاگئی تھی وہ بظاہر زندہ تھی لیکن اس کا شمار مُردوں میں ہوچکا تھا اس کی حالت بعینہ ایسی تھی جیسے چمن کا کوئی نوشگفتہ پھول باد مخالف کے تیز تند جھونکوں سے پژمردہ ہوکر جھک چکا اور زمین پر گرنے ہی والا ہو۔

اس کی صحت کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی گر سب بےسود ثابت ہوئیں۔ دنیا کی عجیب سی عجیب چیز، اور بڑی سی بڑی رنگینی اسکا غم غلط نہ کرسکی —— اسکے مضطرب دل کو تسکین نہ دے سکی آہ —— اسکے شیرازۂ حیات کے اجزائے منتشر کو چن چنکر مجتمع کرنیوالا اس کی برگشتہ قسمت کی طرح اس سے پھر چکا تھا۔ اب وہ ایک مجروح اور پژمردہ دل کو اپنے پہلو میں دبائے ہوئے، حسرت و یاس کی زندہ تصویر بنی ہوئی، انتظار مرگ میں زندگی کے آخرین ایام گن گن کر پورے کررہی تھی۔

ماں باپ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی۔ حورجمال اب مرض دق کے آخری درجہ پر پہنچ چکی تھی۔ باپ نے ایک امید موہوم کو دل میں جگہ دے کر داماد کو خط لکھا۔ حورجمال کی حالت دن بدن نازک ہوتی جارہی ہے۔ وہ

آخری درجہ ہے میں ڈاکٹروں کی رائے سے بغرض تبدیل آب و ہوا اسکو لے کر تمہارے پاس آرہا ہوں"

یہ ان کی، ناشاد حور جمال کو شوہر سے ملانے کی آخری کوشش تھی۔ وہاں سے بذریعہ تار جواب آیا۔

"تکلیف نہ کیجیے گا۔ میں دوسرے شہر جارہا ہوں"

محمد اکرام صاحب کو تو اس جواب سے جو کچھ صدمہ ہوا وہ ہوا، مگر حسرت نصیب حور جمال اس کے پندرہ دن بعد ناشاد و نامراد شوہر کی ستم رانیوں پر قربان ہوگئی۔

بیوی کے مرنے کے ٹھیک دس دن کے بعد حامد بھائی نے مس مارٹن ایک بدشکل کرسچین عورت سے شادی کرلی، صرف اس لئے کہ وہ "انگلینڈ ریٹرنڈ" تھی اور غیرت و شرم کی قید سے آزاد۔



کوشش رنگین

میں اپنی محبت کو ثابت کروں گا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تمہیں معلوم ہے؟
جب تمہیں گرمی محسوس ہوگی یا سورج کی تپش تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائیگی۔
اس وقت میں لطیف ہوا کا ایک نازک جھونکا بنکر تمہیں سینے سے لپٹاؤں گا یا بادل بنکر سورج کو ڈھانپ دونگا اور اسکے بجائے میں تمہارے جلوۂ ناز کا مشاہدہ کرونگا۔
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تمہیں خبر ہے؟
جب تم ساحلِ سمندر پر یا ندی کے کنارے اپنی ٹانگوں کو پانی میں ڈالے بیٹھے ہوگے۔ اسوقت میں ساحل تک آنے والی لہر بنکر تمہارے پیروں پر آگروں گا۔ انہیں پیار کرونگا اور چلا جاؤں گا۔ شاید یہی "سجدہ محبت" ہو جائے گا۔
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تم واقف ہو؟
پاک راتوں کے مقدس لمحات میں، میں چاند بنکر اپنی سنہری کرنوں سے تمہارے بالوں کو چوموں گا۔
اور پھر ——— صبح صادق کے وقت جب تم خوابِ راحت سے بیدار ہونے والے ہوگے اسوقت میں چپکے سے "خدا حافظ" کہتا ہوا چلا جاؤں گا۔
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تم باخبر ہو؟
چاندنی راتوں میں، قندیلِ فلک کی روشنی میں؛ جب تم کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے ہوگے اس وقت میں پانی کا بلبلہ بنکر گھڑی گھڑی تمہیں دیکھنے کیلئے اُبھروں گا، چاہے تم مجھے اپنے پیروں تلے کچل دینا۔ شاید یہی "ایک قربانی محبت" ہوگی
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا کوئی جانتا ہے؟
ساون کی اندھیری اور سنسان راتوں میں جب بارش ہوگی اور بادل گرجے گا۔ اسوقت میں بجلی بنکر تمہیں چاروں طرف تلاش کرونگا اور پھر بادلوں کے پردوں میں سے جھانک کر تمہیں دیکھ لیا کرونگا۔ شاید یہی "نذرِ محبت" ہوگی
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تم آگاہ ہو؟
شبستانِ راحت میں مرصع مسہری پر جب تم کروٹ لوگے اسوقت میں تمہارے خوبصورت پھولوں سے گذر کر تمہارے خواب کی گہرائیوں تک جا پہونچوں گا۔ اور جب تم چونک کر چاروں طرف دیکھوگے تو میں ٹمٹماتی ہوئی جگنو کی طرح اندھیرے میں غائب ہو جاؤنگا۔
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تم جانتے ہو؟
جب تم اپنے باغ کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے گانا سن رہے ہوگے اسوقت میں کسی نہ کسی طرح بانسری کی موسیقی میں گھل جاؤں گا اور پھر چند روز تک ——— حیاتِ بے ثبات کی طرح ——— تمہارے سینے کے اندر تمہارے دل میں دھڑکتا رہونگا۔
میں اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔
لیکن کس طرح ——— کیا تم معلوم کرنا چاہتے ہو؟
اگر میں اپنی ان پیہم کوششوں سے اپنی محبت کا ثبوت نہ دے سکا تو میں حسرتوں اور ناکامیوں کا بارِ عظیم اٹھاتے ہوئے کسی روز مر جاؤنگا۔ موت ہی "انتہائے محبت" ہوگی۔ انجام محبت۔ اور کتاب محبت کا آخری لفظ اور میں اس کوشش ——— "کوشش رنگیں" سے اپنی محبت کو ثابت کرونگا۔

(دیوانہ مصطفےٰ آبادی)

سوتیلی ماں

از محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ سہسرامی

ناصر بیگ کے ساتھ سعیدہ کی شادی کو ہوئے ابھی پورے دو سال نہ گذرے ہونگے کہ اس کے ایک حسین گلاب کے پھول ایسی لڑکی پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں سعیدہ کی زندگی اس خبر سے بالکل مکدر ہو گئی کہ ناصر کو اس کی شادی سے قبل ایک عورت سے واسطہ تھا۔ اور اس کے بطن سے دو سال کا ایک بچہ بھی ہے۔ قہر درویش بر جان درویش بچاری کر ہی کیا سکتی تھی۔ مجبور محض تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے شوہر کا میلان خاطر بھی اپنی طرف پہلے سے بہت کم محسوس کر کے دل ہی دل میں جلتی رہتی ہر آنے والا دن اُسے پہلے سے زیادہ خوفناک نظر آتا تھا۔ اور آخر شوہر کے یک لخت انقطاع تعلق پر اپنی دو برس کی بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ اس دنیا سے سفر کر گئی۔

(۲)

سعیدہ کا مرنا تھا کہ ناصر بیگ نے داشتہ عورت کو اپنے گھر بلا لیا۔ لیکن یہ مثال بالکل صحیح ہے کہ "مرنیکے بعد انسان کی قدر ہوتی ہے" ناصر اب اپنی عزیز و جان نثار بیوی کی بے لوث محبت کا معترف تھا۔ تنہائی میں اکثر رویا کرتا تھا۔ مگر اسے اب کون کہتا کہ "اب پچھتاوے کیا ہووت جب چڑیا چگ گئی کھیت"۔ ناصر سعیدہ کی پہلی اور آخری یادگار کو دیکھ دیکھ کر جی بہلاتا۔ اور اس خیال سے اسے بہت زیادہ پیار کرتا کہ کہیں مرحومہ کی روح کو اس کی تکلیف سے گزند نہ پہنچے۔

(۳)

نہ معلوم سوتیلی ماؤں کی یہ کیا بد دماغی ہے کہ وہ سوتیلے لڑکے یا لڑکی کو پھوٹی آنکھ سے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شکایت ان کے والد سے کہی جائیگی کہ کسی طرح یہ بے ماں کے بچے گھر سے باہر نکال دیئے جائیں۔ اور اگر کسی عاقبت نااندیش باپ نے نئی نویلی دلھن کی محبت میں انہیں نکال دیا تو پھر ان کے پر از معصیت سینوں میں ٹھنڈک پڑ جائیگی۔ راضیہ (ناصر کی داشتہ) بھی انہی جیسی ماؤں میں سے تھی۔ آخر وہ کیوں اس عادتِ بد سے بچی رہتی۔ آئے دن اس معصوم بچی کی شکایت ناصر بیگ سے کیا کرتی۔ لیکن ناصر کچھ خیال نہ کرتا تھا۔ بالآخر جب راضیہ نے دیکھا۔ کہ ناصر اس کی بات پہ مطلق دھیان نہیں دیتا تو اب وہ

حمیدہ کو بالکل معمولی بات پر مارنے لگتی۔ بسا اوقات
تو وہ اسے اس طرح زدوکوب کرتی کہ اس کی ننھی ننھی
اور نازک پنڈلیوں پر چھڑی کے پورے پورے نشان
ابھر آتے۔ مگر حمیدہ چونکہ حد سے زیادہ بھولی تھی۔
اس لئے باپ سے کچھ شکایت نہ کرتی۔

(۴)

یہ ایک کلیہ ہے کہ زمانہ کی گردش کے ساتھ
ساتھ ہر شے میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لہذا
حمیدہ اب جوان تھی۔ اس پر شباب اپنی پوری کیفیت
کے ساتھ چھا رہا تھا۔ اور اس کی نشیلی آنکھیں فضا میں
مستیاں لٹا رہی تھیں۔ لیکن سوتیلی ماں کے سلوک سے
اس کا قیامت بدا ماں شباب ہمیشہ پژمردہ رہا کرتا
تھا۔ دن رات ماما کی طرح گھر کے دھندوں میں لگے رہنا
اس کا شعار ہو گیا تھا۔ آئے دن سوتیلی ماں کے حملوں
سے اس کا نازک سینہ چھلنی ہو رہا تھا۔ اس گھر میں سوائے
اس کے سوتیلے بھائی شمیم کے کوئی اس کا حامی و مددگار
نہ تھا۔ وہ حمیدہ کو کسی طرح اپنی سگی بہن سے کم نہ سمجھتا تھا
اور حمیدہ بھی اسے بڑے بھائی کی طرح عزیز رکھتی تھی۔
نیز اس کی ہر خدمت کو اپنا فرض خیال کرتی تھی۔

(۵)

نہ معلوم راضیہ کو حمیدہ سے کیوں للّٰہی بغض
تھا کہ وہ اسے ہر دم ناگفتہ بہ الفاظ سے مخاطب کرتی،
ہمیشہ نیش زنی کرتی نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس نے
ہر ممکن تکلیف دینا شروع کر دی جو اک لڑکی کو زہر کھانے
یا گھر سے نکل جانے پر مجبور کرے۔ مگر حمیدہ شمیم کے
سمجھانے بجھانے پر ہمیشہ اپنے خیال سے باز آتی رہی

آخر میں جب راضیہ نے دیکھا کہ سیدھی طرح مقصد حل
ہوتا نظر نہیں آتا تو اسنے حمیدہ ایسی شریف النفس لڑکی
پر یہ تہمت رکھی کہ یہ تو شمیم سے ناجائز تعلق رکھتی ہے۔
چونکہ یہ بات حمیدہ کے لئے ڈوب مرنے کا اثر رکھتی تھی۔
اس لئے اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ زہر کھا کر اپنی مجروح
زندگی کو سوتیلی ماں کے ظالم ہاتھوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے آزاد کرے۔

(۶)

رات کے بارہ بجے ہیں فضا میں حسرت ناک
خموشی طاری ہے۔ حمیدہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی
حسرت بھری نظروں سے اس پیالے کو دیکھ رہی ہے،
جو ابھی چند لمحوں میں اس کی زندگی ختم کرنے کیلئے قریب
سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے ابھی حمیدہ اس پیالے کو منہ
تک لے جانے میں کامیاب بھی نہ ہوئی تھی کہ یکایک زہر
آلودہ پیالہ اس کے ہاتھوں سے کسی نے چھین لیا۔ حمیدہ
نے پلٹ کر دیکھا تو شمیم کھڑا ہوا ڈبڈبائی آنکھوں سے
اُسے گھور رہا تھا۔

(۷)

اب راضیہ بھی اپنی تمام سعی پیہم سے ناامید ہو کر بیٹھ
رہی۔ لیکن اس کا چور دل ہنوز ایسے موقع کی تاک میں تھا جو
کسی طرح بھی خطا نہ ہو سکے۔ ایک روز راضیہ کے طعون دماغ
نے ایک بدترین ترکیب حمیدہ کے ہلاکت کی سوچ نکالی، اس نے
شمیم کو بلا کر کہا دیکھو بیٹا میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے والد
کے تمام مال و دولت کے تنہا وارث ٹھیرو۔ لیکن مجبوری تو
یہ ہے کہ وہ کتیا (حمیدہ) بھی اس میں شرکت کی مستحق ہے۔
میں خیال کرتی ہوں کہ اگر یہ کانٹا تمہاری راہ سے صاف

ہو جائے تو پھر چین کی زندگی بسر کرو۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ ایسے وقت میں تمہارے والد سفر کو گئے ہیں۔ اس سے بہتر موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئیگا۔ میں امید کرتی ہوں کہ جو ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے اس سے تم بھی اتفاق کروگے۔ سنو۔ حمیدہ جب رات کو سو جائے تو میں اسکا کام تمام کردوں۔ اس کے بعد بات بنا لینا میرا ذمہ ہے۔

گو شمیم اس خیال سے لرزہ براندام تو ہو گیا۔ مگر فوراً ہی ایک مسرت سی اس کے چہرے پہ دوڑ گئی اور وہ ماں کے خیال کو نوازتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

(۸)

نصف حصہ شب گزر چکا ہے۔ فضا پر ایک سکوت مرگ چھایا ہوا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کتوں کی آواز رات کے .... سناٹے میں ایک وحشت بڑھا رہی ہے راضیہ ہاتھوں میں ایک نہایت ہی آبدار خنجر لئے حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور حمیدہ کو بے خبر پاکر نصف خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ مگر راضیہ کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے ایک آہ دلدوز کے ساتھ اپنے لال (شمیم) کو خون میں شرابور مرغ بسمل کی طرح زمین پر پھڑکتے دیکھا۔ اسوقت راضیہ کی آنکھوں میں اپنی برائی کی تصویر رقص کرتی ہوئی نظر آئی۔ اور فطرت دور کھڑی اس کے اس فعل رکیکہ پر خندہ زن تھی۔ اور انسان کی وسعت طمع کو دیکھ کر لعنت کی بارشیں برسا رہی تھی۔ دنیا اس کے اس بہیمانہ فعل پر الگ کھڑی پھبتیاں اڑا رہی تھی۔ تمام ماحول سے لعنت —— لعنت اور پھٹکار —— پھٹکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راضیہ نے بھی اسی خنجر سے اپنی ناپاک زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

(۹)

کمرے میں پیہم دھماکے کی آواز سے حمیدہ جاگ اٹھی۔ اور اپنے کمرے میں جو آئی تو اس کے ہوش اس وحشت خیز منظر کو دیکھکر بجا نہ رہے۔ وہ نہایت متعجب تھی کہ ماں کا دل یہ کیونکر گوارہ کر سکتا ہو کہ وہ اپنے عزیز فرزند پر خنجر اٹھائے یا فرزند کو اپنی جرأت کہاں جو ماں کو اپنے ہاتھوں قتل کر ڈالے۔ کسی طرح یہ راز اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ حمیدہ جو شمیم کے پاس گئی تو دیکھا کہ شمیم دم توڑ رہا تھا اس نے نیم وا آنکھوں سے حمیدہ کو دیکھا۔ ایک ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر تیرنے لگا۔ اور اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ حمیدہ کے منہ سے اضطراراً یہ جملے بلند آوازیں نکلے "آہ بھائی میری خاطر آپ نے اپنی جان دیدی۔ پیارے بھائی کاش مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز اپنا کمرہ تبدیل نہ کرتی مگر اسے میرے بھائی کی عزیز روح میں تجھے تنہا جنت میں نہ جانے دونگی مجھے بھی ساتھ لے چل" یہ کہہ کر خون آلود خنجر سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔

(۱۰)

اُدھر حمیدہ اور شمیم کی روح آہستہ آہستہ فضائے بسیط میں بلند ہوتی جارہی تھی۔ اور راضیہ کی ناپاک روح مجرموں کی طرح مہیب اور ڈراونی شکل والے فرشتوں کے درمیان زنجیروں میں جکڑی ہوئی آسمان کی جانب مائل پرواز تھی اور ادھر تینوں لاشیں سرد ہو چکی تھیں۔



باغِ سخن کے پھول

جناب سید دل محمد فضا جالندھری فاضلِ ادب

یوں رنگ لائیں داغِ جگر اپنے بن کے پھول
اے جوشِ غم بہار ہیں جیسے چمن کے پھول

افسردہ رشک سے ہیں بہت یاسمن کے پھول
دامن میں آج کس نے چنے ناردن کے پھول

یہ آہِ سرد ہے کہ نسیمِ بہار ہے
یہ داغ ہیں کہ باغِ دلِ پُر محن کے پھول

دیکھیں وہ آ کے سیرِ دلِ داغدار کی
کیا کیا بہار پہ ہیں ہمارے چمن کے پھول

نسبت نہیں انہیں رُخِ رنگینِ یار سے
دل کیا مرا نہال ہو لے کر چمن کے پھول

غیروں کی سمت ہائے وہ ہنس ہنس کے پھینکنا
مجھ کو رہیں گے یاد تری انجمن کے پھول

تارے بھی کھل گئے رُخِ رنگیں کو دیکھ کر
پھولے نہیں سماتے ہیں چرخِ کہن کے پھول

پونچھے جو اس نے دستِ حنائی سے میرے اشک
لالے کے پھول بن گئے سب نسترن کے پھول

یارب گریں فلک سے ستارے ہی ٹوٹ کر
زیبِ لحد ہوں دامنِ چرخِ کہن کے پھول

بے چین کر گئی ہمیں رنگینیٔ خیال
یاد آ گئے سفر میں یکایک وطن کے پھول

جس کے جگر میں تازہ محبت کے داغ ہوں
آئیں پسند کیا اُسے نخلِ کہن کے پھول

بزمِ عزا میں آئے حسینانِ گلعذار
کس رنگ سے اُٹھے ہیں تری خستہ تن کے پھول

گلگشت میں ہوا سے اِدھر اُڑ گئی نقاب
شرما گئے چمن میں اُدھر یاسمن کے پھول

اُس گلبدن کو ہار پہننے کا شوق ہے
کچھ پھول ہوں گلاب کے کچھ یاسمن کے پھول

جھونکے ہوائے تند کے ماتم کا کام لیں،
اُڑ کر غبار اُٹھائے غریب الوطن کے پھول

دُنیا کی ہے فضا گلِ رُخسارِ یار سے
ہونگے نہ باغِ خلد میں بھی اس پھبن کے پھول

سینے سے دل کے داغ اُبھر آئیں کس طرح
کہتے ہیں وہ دکھائیے اپنے چمن کے پھول

سینچا ہے میں نے خونِ دلِ داغدار سے
پژمردہ ہونگے کیا مرے باغِ سخن کے پھول

آیا ہے سیرِ باغ کو یہ کون رشکِ گل
کیوں فرشِ راہ بن گئے بچھ کر چمن کے پھول

ہے بلبلوں میں شور بہار آ گئی فضا
پھولے سمائیں گے نہ چمن میں چمن کے پھول

نقد و نظر!

تختِ طاؤس

مولفہ جناب کشتہ صاحب قادری۔ یہ ایک قابل قدر علمی اور تاریخی تحفہ ہے جو ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولف نے نہایت کاوش سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح شاہ جہاں نے تختِ طاؤس کو مختلف بیش قیمت جواہرات لعل، یاقوت، الماس، مروارید اور زبرجد سے مزین کیا تھا۔ اسی طرح حضرت کشتہ نے تختِ طاؤس کی تاریخ کو بھی قیمتی تاریخی جواہرات سے سجا دیا ہے۔

اور جس طرح یاقوت وغیرہ کا مصرف تختِ طاؤس کے سوا اور کوئی بہتر صورت نہ رکھتا تھا۔ اسی طرح مفید اور کارآمد حواشی جو اس کتاب میں دیئے گئے ہیں اور جو حالات اور گراں بہا واقعات ضمنی طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ان برمحل تذکروں کے لئے اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا۔ اگر ان واقعات کو علیحدہ مرتب بھی کیا جاتا مگر اس کے ساتھ تختِ طاؤس کی تاریخ نہ ہوتی تو وہ واقعات ایسے ہی بے محل ہوتے جیسے بغیر انگوٹھیوں کے چند ہیرے۔ اصل یہ ہے کہ یہ کتاب عہد شاہ جہاں کی چھوٹی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قلعہ معلی۔ جامع مسجد دہلی وغیرہ کے تاریخی حالات میں طول و عرض کی تفصیل اور معتبر حوالوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

جہاں ایسا کوئی نقطہ آگیا ہے جس کو ادبی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت ہو وہاں مولف نے اس کی بھی تحقیق نہیں چھوڑی مولف نے نہ صرف تاریخ تختِ طاؤس، بلکہ ضمنی واقعات کو بھی اس درجہ شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ کوئی منصف مزاج انسان بغیر داد دیئے رہ نہیں سکتا۔ یہ کتاب درحقیقت ایک بہترین تالیف ہے اور تاریخی کتب میں قیمتی اضافہ ہے لائق مولف نے تختِ طاؤس کی تاریخ اس طرح لکھی ہے کہ اکدم اسکی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ کتاب میں اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔

مگر گلوں کے ساتھ خار بھی ہوتے ہیں۔ اس کلیے کے اعتبار سے چند فرد گذاشتیں بھی ہیں۔ سب سے بڑی فرد گذاشت کاپی نویس صاحب کی عنایت کا نتیجہ ہے (جس میں مولف بالکل بے قصور ہیں) وہ یہ ہے کہ جتنے واقعات ضمنی طور پر لکھے گئے ہیں ان کو فٹ نوٹ کے طور پر لکھنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ کاتب صاحب نے صفحہ ۲۰ سے ۷۰ تک جتنے نوٹ لکھے ہیں انکو حاشیہ چھوڑ کر نہیں لکھا ہے۔ جس سے کتاب کی خوبی میں کسی قدر فرق آگیا ہے۔

چونکہ ضمنی طور پر بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات مولف نے لکھے ہیں اس وجہ سے جب میں نے اس کتاب کے صفحہ ۹۴ کو دیکھا تو نور جہاں کے محل شاہی میں داخل ہونے اور باپ کی وزارت کا قصہ یاد آگیا۔ وہ یہ کہ مخدوم عبدالکریم (ابن حضرت شاہ نظام الدین بھکاری) جو اکبری دربار کے خاص فرد تھے) وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد بہ عہد جہانگیر قدیم پروانہ جات کی تجدید کے لئے دہلی گئے تو میرزا غیاث کے یہاں ٹھیرے، اس نے مخدوم صاحب سے نور جہاں کے ساتھ عقد کر لینے کی خواہش کی آپ نے صاف انکار کر دیا۔ میرزا غیاث آپ کے والد (شاہ بھکاری) کا مرید تھا مگر بے حد پریشان حال۔ ایک دن مخدوم صاحب نے ایک خواب دیکھا۔ اور میرزا غیاث سے کہا۔ اب ہم جاتے ہیں جب تم وزیر ہو جانا تو ان کاغذات کی تجدید کر کے بھجوا دینا

اسکو یہ سنکر تعجب ہوا، ادب سے عرض کیا بھلا میں اور حکومت؟ مخدوم صاحب نے فرمایا کیا خدا کی قدرت سے یہ امر بعید ہے؟ ایسا ہی ہوگا۔ مخدوم صاحب چند روز حضرت خواجہ باقی باللہ کے امداد پر ان کے مہمان۔ ہے بھر کاکوری واپس چلے آئے چند روز بعد نور جہاں جہانگیر کے محل میں داخل ہوگئی، میرزا غیاث وزیر ہوئے۔ نور جہاں کے بھائی کو ہفت ہزاری منصب اور بنگالہ کی صوبہ داری ملی۔ میرزا غیاث نے تمام کاغذات کی تجدید کرائی اور اپنی طرف سے بھی ایک گاؤں کی معافی کا پروانہ جدید۔ دیکر بیٹے کو مرشد زادے کی خدمت میں بھیجا مرشد زادے نے قدیم پروانے لے لئے لیکن جدید پروانہ معافی لینے سے انکار کر دیا۔ میرزا کے بیٹے نے لاکھ اصرار کیا مگر نہ مانا۔ اس زمانے کے مرشد زادے اس شان کے ہوتے تھے میرزا کے بیٹے نے آخری تمنا یہ ظاہر کی کہ اپنے کسی صاحبزادے کو میری ساتھ کر دیجئے چنانچہ مخدوم صاحب نے اپنے ایک صاحبزادے ملا عزیز اللہ کو یہ کہہ کر ساتھ کر دیا کہ دریں پسر بوئے از رغبت دنیا می بینم۔

(تذکرہ مشاہیر کاکوری)

مولف نے شیر افگن علی قلی خاں کے والد کا نام نہیں لکھا۔ اس کی صراحت بہت ضروری تھی کیونکہ اس عہد میں اس نام کے اور حضرات بھی گذرے ہیں۔

مولف نے لکھا ہے کہ نور جہاں مخفی تخلص کرتی تھی لیکن اسکے دیوان وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مخفی تخلص ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ صفحہ ۱۲۵ میں ست نجے کا تذکرہ ہے مگر اسکی تفصیل بھی ہوتی تو اچھا تھا صفحہ ۱۳۵ میں لفظ محمد کے ساتھ الف لام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک جگہ قندیل گل محمدی کا تذکرہ ہے۔ مگر پھر یہ نہیں لکھا گیا کہ پھر یہ قندیل کب مدینے پہنچ پائی۔ صفحہ ۱۴۹ میں نار بخش کے بعد کوئی لفظ رہ گیا ہے یہ کتاب بڑی تقطیع پر گلاب سنگھ

[illegible]

طوفانِ تبسم

جناب شوکت تھانوی اور انکی مزاح نگاری کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ نے اپنے مضامین سلسلہ وار نہایت خوش نما اور دیدہ زیب اڈیشنوں میں شائع کرایا ہے۔ اس سے قبل موجِ تبسم۔ بحرِ تبسم۔ اور سیلابِ تبسم شیوع پذیر ہوکر قبولِ عام کا شرف حاصل کرچکے ہیں۔ اسوقت طوفانِ تبسم زیرِ نظر ہے۔

طوفانِ تبسم کا دیباچہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے جو خود چوٹی کے مزاح نگار ہیں واقعی ایسی تصنیف کے لئے مرزا صاحب ہی کا دیباچہ موزوں تھا۔

حضرتِ شوکت نے انتساب میں بھی اپنی جبلی ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ فرماتے ہیں

"وہ غریب شوہر جو اپنی بعوض پندرہ ہزار رائج الوقت حاصل کی ہوئی بیوی کا مہر اس زندگی میں ادا نہ کرسکتا ہو اسکو چاہیئے میری طرح بیگم کی خدمت میں رشوت پیش کرتا رہے جس طرح میں۔

منسوب کرتا ہوں اس مجموعہ کو شوکت دلہن کے نام نامی اسم گرامی سے ؎

زقدرِ شوکت بیگم نگشت چیزے کم
کلاہ گوشہ شوہر بآفتاب رسید

دعا گوئے دولت اقبال

شوکت"

اب ناظرین خود ہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کتاب کا ڈیڈیکیشن یہ ہے۔ اس کے مضامین کسقدر روح پرور اور تبسم خیز ہونگے۔ طوفان میں کل سترہ مضامین ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ سب مذاق سلیم کے حامل ہیں۔ لیکن اشتہاری شادی۔ سناؤں تمہیں بات اک رات کی۔ افیونی۔ ہوم ممبر الہ آباد کی امرود درگاہ شریف وغیرہ خاص چیزیں ہیں جو حضرت شوکت ہی کا حصہ ہیں لکھنو کی روزمرہ۔ سلاست اور زورِ بیان سب پھوٹ پھوٹ کر کہہ رہے ہیں کہ ؏

دیکھئے تحریر شوکت تحریر ہے

حجم ۲۰۴ صفحات۔ کتابی سائز۔ قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد ۲؍

منیجر شوکت بک ڈپو۔ لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔

نقدالادب

کچھ عرصہ سے سرپرستان اردو کی توجہاتِ خصوصی انتقاد کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ کسی زبان کا تخلیقی ادب تاریخِ ادبیاتِ عالم میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس زبان کے اصول و قوانین تنقید نگاری پر پورا نہ اترے۔ اردو زبان میں اس ناگزیر عنصر کی غیر موجودگی مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔

بعض اصحاب نے اس پر قلم بھی اٹھایا۔ لیکن ان کی کوششیں اس بابِ خاص میں، ایک معمولی سے مضمون کی صورت میں یا تو موقت الشیوع رسائل کے صفحات پر نمودار ہوئیں یا کسی مختصر سی کتاب میں ——! اب تک تین یا چار کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں۔ جو تنقید کے موضوع پر پورے طور سے حاوی ہیں، ایک تو "روحِ تنقید" ہے جو محی الدین نور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے میں تو مفہومِ تنقید، مبادیاتِ تنقید، اصولِ تنقید، اور اس سے متعلق جملہ السنۂ عالم کے بہترین نقادانِ ادب کی آرا دی گئی ہیں، اور دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ تنقید کس طرح کی جاتی ہے۔ روحِ تنقید کے بعد اردو زبان میں تنقید کے متعلق جو کتاب بہترین ہے وہ نقد الادب (مصنفہ حامد اللہ صاحب، افسر) کے سوا اور کوئی نہیں۔ کتاب کا مطالعہ بامعانِ نظر کرنے کے بعد ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ نقد الادب اردو دنیائے تنقید نگاری میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ پہلے چند اوراق پر اردو میں تنقید کا فقدان، تنقید کا مقصد معاصرین پر تخریبی تنقیدیں، ادب کا مطالعہ اور تنقید، تنقید کے معنے اور اس کے متعلق غلط فہمی، ادب کے وسیع اور عمیق مطالعے کے لئے، تنقید ناگزیر ہے، نقاد کے فرائض اور اس قسم کے دیگر عنوانات کے ماتحت نہایت عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں کل دس ابواب ہیں۔ پہلا باب ادب اور فنونِ لطیفہ کی توضیحات و تشریح پر مشتمل ہے، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب مختلف ممالک کے نظریات اور زاویۂ نگاہ (جو تنقید سے متعلق ہیں) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقیہ ابواب میں اصولِ تنقید، مقاصدِ تنقید اور مختلف اصنافِ سخن کی توضیح لئے ہوئے ہیں۔ کتاب کی مابہ الامتیاز چیز اس کا مختصر مگر جامع اور سریع الفہم طرزِ بیان ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ کتاب معائب اور

خامیوں سے بالکل مبرا ہے، کہیں کہیں نظرِ ثانی کی ضرورت ہے مثلاً صفحہ ۲۹ پر "سمجھتے ہیں" بجائے "سمجاتے ہیں" لکھا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اس شعر ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کو حافظ سے منسوب کیا گیا ہے حالانکہ یہ نظیری نیشاپوری کا ہے۔

مسدس پر تنقید کرتے ہوئے فاضل نقاد نے اقبال کے شکوے پر اعتراضات کئے ہیں جو درست نہیں۔ اقبال کا شکوہ مسلمانوں کی طرف سے ہے نہ کہ بنی نوع انسان سے خطاب اس لئے اس کے متعلق یہ کہنا کہ "شاعر کا پیام عالمگیر ہوتا ہے۔ کسی فرقے یا جماعت تک محدود نہیں ہوتا" شکوے پر صادق نہیں آتا۔

کتاب مجموعی حیثیت سے لاجواب تصنیف ہے اور ادب اردو میں معتد بہ اضافہ ہے۔ ہر ادیب کو چاہیئے کہ افسر صاحب کے خیالات سے مستفیض ہو کر صحیح ذوقِ تنقید سے بہرہ ور ہو۔

کتابت طباعت اور اٹھان بہت عمدہ ہے نولکشور پریس لکھنو سے ملتی ہے۔ قیمت دو روپے۔

رہنمائے تعلیم

ہدایت و ارشاد، نصیحت و موعظت عموماً دو طریقوں سے ممکن ہو سکتی ہے، ایک تو یہ کہ بدکاریوں اور گناہوں کے تباہ کن مناظر کی تصویر کھینچ کر ناظرین پر ان کے ہلاکت آفرین نتائج و عواقب ظاہر کئے جائیں۔ اور دوسرے یہ کہ برائیوں کو بالکل چھوڑ کر نیکیوں ہی کی ترغیب و تحریص دی جائے ——— اول الذکر طریقہ زیادہ سریع الاثر اور زیادہ آسان ہے،

لیکن کتاب "بہلائے تعلیم" میں سید محمد محسن بی ٹیچر اندصیسر ہائی سکول کپورتھلہ نے دوسرا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح شیاطین بچوں کو پھسلا پھسلا کر اور پیار کر کے ان کے معصوم دماغوں میں جہالت کے جراثیم داخل کر دیتے ہیں ——— وہی بچے جنہیں قوم اپنا سہارا سمجھتی ہے، جو جنہیں دنیا میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے ہوتے ہیں شیاطین کے دام تزویر میں گرفتار ہو کر، سیہ کاریوں کے غار میں اپنے آپکو گرا دیتے ہیں اور جبین قوم پر بدنما داغ کی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ امید واثق ہے کہ مدرسین، فاضل مصنف کی مساعی جمیلہ کو بنظر استحسان دیکھتے ہوئے کتاب کی کماحقہ قدر دانی کریں گے ———!

کتاب اس لئے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے بلکہ ظریفانہ پیرائے میں مفرد محاورات کا صحیح استعمال بھی بتایا ہے ———!

کتب خانہ انصاریہ جالندھر شہر بازار شیخاں سے آٹھ آنے میں طلب فرمائیں۔

گلدستہ تعلیم کا پہلا اور دوسرا قاعدہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ آجکل اسلامی تعلیم سے غیریت ہو رہی ہے، قرآن مجید پر عمل کرنا تو کجا، اسلامی مدارس کے متعدد طلباء اسے پڑھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ اس کفر پرور عہد میں حضرت مولانا عماد الدین نے تعلیم اسلام، چچا ثناءاللہ دین مبین ایسی کارآمد کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر کے حقیقتاً مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا گلدستہ تعلیم اسلام (قاعدہ حصہ دوم) میں حروف کے متعلق ہدایات ایسے آسان و عمدہ پیرائے میں لکھی ہیں کہ بغیر استاد کے بھی بچوں کے لئے تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں بہت حد تک ممد معاون

صرف پچیس روپیہ میں ۲۰ پونڈ مال کٹ پیس کی گانٹھ

25/-/-

خاص رعایت ۱۵ جنوری تک

ہمارا دعویٰ ہے اس سے اچھی اس سے اعلیٰ و نفیس اس سے بہتر اس سے زیادہ رعایتی کفایتی

کٹ پیس کی گانٹھیں کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتیں

ہم نے عام پبلک کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر خاص عیدالفطر کے واسطے حسب ذیل گانٹھیں تیار کی ہیں ہر شخص منگوا کر کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے خواہ فروخت کرے خواہ اپنی ضروریات میں لاوے ہر طرح نہایت معقول فائدہ رہیگا یہ خاص رعایت صرف پندرہ جنوری تک رکھی گئی ہے اسکے بعد ان گانٹھوں کا آرڈر دینا بالکل بیکار اور فضول ہوگا لہذا جسقدر جلدی ہو سکے منگوا کر خاطر خواہ حسب منشا فائدہ اٹھائیں بعد میں پچھتانا ہوگا

مکس گانٹھ $\frac{1}{A}$ وزن دس پونڈ۔ اس گانٹھ میں گرم سوٹنگ مختلف کوالیٹی مردانہ، لیڈی سلکی سوٹنگ کلاتھ، پاپلین، لنکولین، ٹوبراکو چھینٹ، مخمل، وائل، پاپلین چارخانہ دار، ٹیکلرف، جارجٹ سلکی جاپان وغیرہ ٹکڑے 2 گز سے 8 گز تک قیمت دس پونڈ 25/-/-

مکس گانٹھ $\frac{2}{B}$ وزن 15 پونڈ۔ اس گانٹھ میں پاپلین، چھینٹ، جارجٹ جاپانی، سلکی پھولدار، پلین جاپانی، ٹوبراکو، وائل، نلفر، مخمل وغیرہ کے علاوہ بھی چند قسم کا کٹ پیس ہوگا۔ ٹکڑا ایک گز سے 5 گز تک۔ قیمت 15 پونڈ گانٹھ 25/-/-

مکس گانٹھ $\frac{3}{C}$ وزنی 20 پونڈ۔ اس گانٹھ میں تمام قسم کا کٹ پیس ہوگا زنانہ مردانہ یعنی سلکی سوتی، نلفر، لٹھا، پاپلین، چھینٹ، وائل، فلالین، کاٹن، ٹوبراکو، لنکولین وغیرہ ٹکڑے ½ گز، ایک گز، 1½ گز، 2 گز، 3 گز، 4 گز، 5 گز قیمت 20 پونڈ 25/-/-

نوٹ آرڈر کے ہمراہ ½ قیمت پیشگی آنی بالکل ضروری ہے۔ پیکنگ رجسٹری ریلوے کرایہ مزدوری خرچ بذمہ خریدار ہوگا

نوٹ ضروری :- کل قیمت پیشگی آنے پر پیکنگ، رجسٹری، مزدوری خرچ معاف ہوگا۔ آپ کا خیر اندیش

مینیجر دی فٹ کلوتھ کمپنی ہول سیل کٹ پیس مرچنٹ رنچھوڑ لائین کراچی